

سال نو مبارک

خواتین اور دانشوراؤں کیلئے اکیسویں صدی کا منفرد ماہنامہ

رخسانہ

JANUARY  
2015

PDFBOOKSFREE.PK

ماڈل: نیہا

میک اپ: پرویز بیوٹی پارلر  
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا



## مستقل سلسلہ

۲۰۸	صالحہ محمود	۷	صالحہ محمود	ردائے جنت
۲۲۰	ادارہ	۱۹۳	صدف سجد	ردائی ڈائری
۲۲۱	ثریا اقبال	۲۰۲	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۲۲۵	شہلا مشائق	۱۹۹	نورین ملک	خوشبو
۱۹۵	نورین ملک	۱۹۶	نورین ملک	اس ماہ میں
۲۱۶	عائشہ احمد			

دوستوں کے نام پیغام







16 دسمبر

ہم اداس ہیں شہر پشاو ر تیرے لیے

پھولوں کے شہر میں پھولوں کی ہے تدفین  
ہے سوگ کا عالم ہر آنکھ اشکبار ہوئی  
پھولوں کے شہر میں پھولوں کے جنازے  
وہ جو حصول علم میں بو رنگ ہو گئے  
شمعیں روشن ہیں

ہزاروں خوش رنگ پھولوں پر  
خوشبو پھیلی ہے جواں خون کی  
کراچی سے خیبر تک اضمحلال طاری ہے  
اک سانحہ جو ہمیں دولخت کر گیا  
ایک سانحہ جو ہمیں یکجا کر گیا

اس دکھ پر قلم بے معنی سا ہوا  
کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں لفظوں کی  
16 دسمبر میں جو سانحہ گزرا

سردراتوں میں مہکتی ہے  
ان کے خون کی خوشبو  
غنچے تھے میرے شہر کے  
جو مرجھا گئے کل صبح

تیرگی ہی تیرگی ہے ہر سمت ہے اداسی  
گلاب چہرے تھے جو خوں نہا گئے

تمہارے خون سے روشن رہیں گی  
شب تاریک میں اس شہر کی گلیاں  
اے شہر پشاو ر!

تیری گود میں ہیں ماؤں کے وہ لخت جگر  
جو کتب میں شب کی تاریکی میں نہیں  
دن کے اجالے میں مارے گئے  
جن کی آنکھوں کے رتن چور ہوئے  
جن کے جسم سرخ غازے سے رنگین ہوئے  
اپنے پیر بن میں وہ طفل جو خاک ہوئے  
وہ گھر کے گلاب تھے

اپنے ہی گھر کے صحن میں مرجھا گئے  
مسلے ہوئے پھولوں کی طرح  
مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح  
ارواح شہداء کی مہک

تروتازہ ہے ابھی تک  
غم و غصے میں ہے یہ قوم بہت  
تمہارے خون کا قرض ابھی باقی ہے  
برسوں نہ دھل سکے گا لبو اس سرزمین سے  
اٹھے تو ہیں مگر بہت دیر سے اٹھے  
اب سینہ سپر ہیں غازی تیرے وطن کے  
لبو کا تمہارے حساب ہوگا

صالیہ محمود





آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ ایک راوی کے مطابق ”نبی اکرمؐ کا ایک ایک حرف بہ آسانی گنا جاسکتا تھا۔ چونکہ رسول اکرمؐ کے دہن سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا لہذا وہ چاہتے تھے کہ آپؐ جو کچھ فرمائیں سننے والے اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے تھے۔ خواہ کسی ایک فرد سے مخاطب ہوں یا مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب فرما رہے ہوں۔ آپ کا طرزِ تکلم ہر طرح کے قنع سے پاک تھا۔

رسول اکرمؐ ننھے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی بچوں کو دیکھتے خوش ہو جاتے۔ بچوں کو ہنسانے کے لیے ان سے مذاق بھی فرماتے۔ فطری طور پر وہ اپنے نواسوں حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے دوران بھی ان میں سے ایک کو بازوؤں میں اٹھا لیتے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں جاتے تو نواسے کو پاس کھڑا کر لیتے اور سجدے سے اٹھ کر پھر گود میں لے لیتے۔ جب دونوں بچے ذرا سیانے ہوئے تو وہ مسجد نبویؐ میں ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ نماز باجماعت کے دوران کبھی کبھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رشتہ زندگی کے ہر شعبہ سے قائم ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور دنیاوی زندگی کے بھی معلم ہیں۔ اسی لیے اسلام کے پیروکاروں کی زندگی اور ذاتی رویے پر دین اسلام کے اثرات دوسرے مذاہب کی نسبت زیادہ گہرے ہیں۔

مختلف روایات میں آپؐ کی عادات و خصائل کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ ان روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا سادگی تھے۔ اپنے جوتوں کی خود مرمت کرتے۔ اپنی بکریوں کا دودھ دودھ لیتے۔ اور اس کام کے لیے اپنے خادم کو بھی تکلیف دنیا گوارا نہ فرماتے۔ آپؐ کے خادم خاص حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں۔ ”میں نے دس سال رسول اکرمؐ کی خدمت اقدس میں گزارے۔ انہوں نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا یا کیوں کیا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے نہایت شفقت فرماتے تھے۔“

آپؐ جسم اور لباس کی طہارت و صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ حضور اکرمؐ تیز رفتار تھے حتیٰ کہ ان کے صحابہ کو ان کے ساتھ قدم ملانے میں دقت پیش آتی تھی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو



ٹانگوں میں سے گزر جاتے اور رسول اکرمؐ انہیں کچھ نہ کہتے۔

آپؐ ہر ایک سے مشفقانہ برتاؤ فرماتے۔ حتیٰ کہ معمر خواتین ان سے لمبی لمبی بے سرو پابا تیں بھی کرتیں مگر آپؐ کوئی اکنا ہٹ محسوس نہ کرتے۔ یہ خواتین انہیں بازو سے پکڑ کر ٹھہراتیں اور رسول اکرمؐ نہایت توجہ سے ان کی باتیں سنتے اور اپنا بازو بھی نہ چھڑاتے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے بولتے، بیٹھے رہتے لیکن جب کوئی دینی بات ہوتی یا نماز کا وقت آجاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہیں ہی نہیں۔ کھانے پینے میں ازواج مطہرات کو کوئی روک ٹوک نہیں تھی جو چاہتیں کھاتیں جو چاہتی پینتیں۔ ہر چند عسرت کی وجہ سے اچھا کھانا میسر نہ تھا۔ سونے، چاندی کے زیورات پسند نہ فرماتے۔ اس زمانے میں ہاتھی دانت کے زیور کا رواج تھا آپؐ اس قسم کے زیور پہننے کا حکم دیتے۔ مگر میں داخل ہوتے تو نہایت خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے اندر تشریف لاتے تھے۔ بیویوں پر کبھی لعن طعن نہ فرماتے نہ درشت اور سخت لہجے میں گفتگو فرماتے اگر کوئی بات ناگوار خاطر ہوتی تو انتقام میں کمی کر دیتے۔

آپؐ کی گھریلو زندگی ان تمام کیفیات سے معمور اور پر رونق تھی جس سے انسانی زندگی معمور ہوتی ہے۔ آپؐ کی گھریلو زندگی میں وہ تمام پہلو موجود تھے جو خوشی اور غم کے پہلو ہوتے ہیں۔ آپؐ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی دلداری کے خیال سے اپنی پسندیدہ چیز کھانا چھوڑ دیتے۔ آپؐ ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔

ان کو اپنے رازوں میں شریک کرتے۔ بیوی بچوں کو سرزنش فرماتے ہوئے یہ انداز اختیار کرتے کہ مخاطب بات بھی سمجھ لے اور ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔ ازواج مطہرات کبھی خود حضور اکرمؐ کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور آپؐ اسے پسند فرماتے تھے۔ بشرطیکہ وہ جائز حدود میں ہو۔ آپؐ کی خانگی زندگی بے رنگ و بوتھی۔ زادالمعاد میں ابن قیم لکھتے ہیں۔ ”نبی اکرمؐ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نہایت محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور آپؐ ان کو ان لڑکیوں کے ساتھ کھینے کے لیے چھوڑ دیتے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپؐ ان کی خواہش پوری کر دیتے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھروالوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لیے ہادی مرشد اور پیغمبر کی حیثیت سے بھیجا تھا۔ اسی طرح آپؐ کی ازواج کا درجہ بھی تمام امت کے مردوں اور عورتوں کے لیے امہات کا رکھا۔ تاکہ سب لوگ ان کو اپنے لیے نمونہ سمجھیں اور ان سے زندگی کے وہ طریقے سیکھیں جو ان کو نبی اکرمؐ سے معلوم ہوئے۔ جس طرح ان تعلیمات قرآنی پر سب سے زیادہ اہتمام سے خود نبیؐ عمل فرماتے تھے اسی طرح ازواج مطہرات اور اہل بیت نبوتؑ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے پھیلنے والے چشمہ نور سے پہلے خود اچھی طرح منور ہوں۔ پھر اس روشنی سے دوسروں کو منور کریں۔ اندر اور باہر دونوں جگہ



معاملہ میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو۔“ بیٹیوں سے ترجیحی سلوک کی ہدایت فرمائی۔ ”جب تم اپنے بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے کچھ لاؤ تو بیٹیوں سے شروع کرو کیونکہ بیٹیوں کے مقابلہ میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔“

آپ اپنی ازواجِ مطہرات کے حقوق کی ادائیگی میں پوری مساوات و عدل ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر حضرت عائشہؓ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ ”یا اللہ جس کا مجھے اختیار ہے اس کی تقسیم تو میں نے مساوی طور پر کر دی لیکن جو بات میرے بس میں نہیں ہے اس پر مجھے ملامت نہ کیجئے گا۔“ آپ کے ازدواجی تعلقات حسن معاشرت اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ برتاؤ اور رویے میں مساوات کا خیال رکھتے۔ جب آپ سفر کا ارادہ کرتے تو ازواجِ مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے۔ جس کا نام نکل آتا وہی ہم سفر ہوتیں۔ کسی کو کوئی عذر نہ ہوتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ باری کی اتنی پابندی فرماتے کہ کبھی ہم میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے۔ اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا کہ آپ سب ازواجِ مطہرات کے یہاں روزانہ تشریف نہ لے گئے ہوں۔ بعض اوقات ازواجِ مطہرات ادھر ادھر کے قصبے یا گزرے ہوئے واقعات بیان کرتیں تو آپ برابر سنتے رہتے۔ اور خود بھی کبھی اپنے گزشتہ واقعات سناتے۔

رسول اکرمؐ کی خانگی اور نجی زندگی آپ کی سیرت کی طرح بے داغ، پاک اور صاف ہے۔

☆.....

کامل یکسانیت تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کے لیے حضور اکرمؐ نے اپنے دن اور رات ایک کر رکھے تھے اسی مقصد میں آپ کی ازواج بھی دل و جان سے منہمک تھیں۔

آپ کی ازواجِ مطہرات کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اونچا بنایا تھا اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ تھیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا اجر بھی وگنا تھا اور جرم پر سزا بھی دینی تھی۔ سورہ احزاب میں آیات نمبر 30-31 میں ارشاد ربانی ہے۔ ”اے پیغمبر کی بیویو! جو تم میں سے کھلی ہوئی برائی کی مرتکب ہوگی تو اس کو دہری سزا سنا دی جائے گی اور یہ اللہ کے لیے سہل بات ہے اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہیں گی اور جھلے کام کرتی رہیں گی ہم ان کا اجر بھی دہرا دیں گے اور ان کے لیے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے۔“

آپ ازواجِ مطہرات کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گراں بار رہتے تھے اور ان کو آخرت کی کامیابی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنی گھریلو زندگی میں عورت کو عزت و تکریم کے اعلیٰ مراتب سے ہمکنار کیا۔ آپ نے بیویوں کی محبت اور احترام کی بار بار تاکید فرمائی۔

آپ نے فرمایا۔ ”تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔“ ایک اور جگہ آپ نے فرمایا۔ ”ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہو گا۔“ خطبہ جیہ الوداع میں فرمایا۔ ”اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ ان کے





صالح محمود

افسانہ

# عہدِ رنج و یاس

”یا اللہ! نصیر کوئی نہ ہوئے وحید مراد ہو گئے۔“  
اماں کو وحید مراد شاید بہت پسند تھے اس بات پر  
تینوں کو ہنسی آگئی تھی۔

لیکن آج معاملہ سیریس تھا۔ شیرازے سے  
کپڑے لیے مڑ گئی۔

”دیکھتی ہوں کل تم چھوٹے بھیا کے کپڑے  
کیسے دھوؤ گی۔ کل میں دھوؤں گی۔“ مریم بولی۔

”یا اللہ! اس بات پر ہی جھگڑا ہے کہ پہلے کون  
کپڑے دھوئے گا۔“ اماں حیران تھیں۔

روز کی آفتاب چلتی میں ماہ و سال گزرے۔ دونوں  
کی کوشش ہوئی کہ کون سب سے پہلے چھوٹے بھیا  
کے کپڑے دھوئے گا۔ پھر ماہ و سال گزر گئے نہ  
اماں رہیں نہ اباء، اس نے پردہ ہٹا کر باہر آسمان کو  
دیکھا۔ شیراز بھی ایک دائمی سفر پر چلی گئی تھی۔ پھر  
پلٹ کر نہ آئی۔ چھوٹے بھیا بھی امریکہ میٹل ہو  
گئے۔

اس بار جب چھوٹے بھیا پلٹ کر آئے کسی گہما  
گہمی میں ہر روز گزارا لے آئیں میں ہو رہے تھے۔  
کبھی شمینہ باجی کے گھر، کبھی انم اور کبھی مریم کے  
گھر۔ بھیا نے سب کے گھر باری باری ڈے اسپنڈ  
کیا۔ مریم بے حد خوش تھی آج کا دن چھوٹے بھیا  
اس کے گھر گزارنے آئے تھے۔ وہ اپنے شوہر کا  
شلوار قمیض استری کر کے بھائی کے روم میں رکھ  
کے آئی تھی۔ بھائی اپنے ساتھ شلوار قمیض نہیں  
لائے تھے۔ رات دیر تک بھائی بچوں کو لے کر آئیں  
کریم کھلانے لے گئے۔ ساتھ ہی میں مریم کی نند  
کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئے۔

”آؤ چھوٹا آؤ کریم کھانے چلتے ہیں۔“ ہوں  
ایک دن مریم کے ہاں گزار کر بھیا امریکا کے لیے  
عازم سفر ہوئے۔

دوسرے دن دھوبی کو کپڑے دیتے وقت مریم

سردراتوں کا جنوں کچھ دیر میں ٹوٹ جائے گا۔  
شبہی رات کا آؤچل ہوا کے کسی جمونکے سے ایک  
لہجے کو پلٹا تو اس نے سیاہ رات کی تاریکیوں میں  
گھبرے ہوئے آسمان پر ایک نظر ڈالی۔ جبرجبری  
سی آئی تو مریم نے جلدی سے گرم شال میں خود کو  
پلٹ لیا لیکن اس کی روح کی ادا سی سیاہ رات کے  
اندھیرے کم نہ کر سکے۔ نہ جانے کتنے پہر پاتی ہیں  
صبح ہونے میں۔ وہ بے قرار سی باہر دیکھ رہی تھی۔

”یار ب وہ صبح نہ آئے میں وہ صبح نہ دیکھوں“

اپنے آپ بڑبڑا کر اس نے پردہ چھوڑ دیا لیکن  
سیاہ رات کا سایہ درآیا یوں لگا جیسے کل کی بات ہو وہ  
اور شیراز ابھی ابھی کالج سے گھر میں داخل ہوئیں  
دونوں کی نظریں ایک ساتھ چھوٹے بھیا کے کمرے  
پر جا گئی تھی۔ پہلے شیراز چھٹی پھر مریم نے بھی قمیض  
تھام لی۔

”میں آج دھوؤں گی۔“ مریم ہنسی۔

”جی نہیں آج میں، تم کئی دن سے دھورہی ہو  
میں سب جانتی ہوں۔“ شیراز نے قمیض کھینچ لی تھی۔

”اف خدا یا۔“ اماں بول پڑیں تھیں۔

”کمال ہے کلوچ کہتا ہے کہ تم لوگ اس کے  
کپڑوں کو دواش نہیں کرتیں۔ ایسا کیا ہے بلو کے  
کپڑوں میں۔“ اماں بہت سنجیدگی سے دیکھ رہی  
تھیں۔

”آپ نہیں سمجھ سکتیں آپ اس کو کچھ نہیں  
کہتیں۔“ شیراز غصے سے بول کر ہنسی۔

”کل بھی انم اور مریم کی جھڑپ ہوئی  
تھی۔“ شیراز پھر بولی۔

”ہاں تو کیوں لگتی ہے خط۔ میں نے ملوایا ہے  
تو اس کا مطلب یہ توڑی ہے کہ ان کو خط لکھے۔“

کل مریم اسی بات پر انم سے الجھ پڑی تھی۔ شیراز  
نے مداخلت کی تو اماں جل کر بولیں۔



سائے تھے۔ اماں کے گھر کا ایک چھوٹا سا لحد یاد آیا  
تو آنکھیں برس پڑیں۔

جنت فردوس کے سائے میں

جب آنکھ کھلے اس کی

خوشبو گل کی آباد رہے

حصار میں اس کی

جنت فردوس میں ہو گھر اس کا

ذرا سی دیر کو سوا جو

تو قیامت گزر گئی

کھلی نہ آنکھ اس کی

پھر قیامت کے شور سے

جنت فردوس میں ہو گھر اس کا

اس کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ باہر بچے  
آتش بازی کر رہے تھے۔ وہ شمال کو پلٹ کر باہر  
آگئی۔ لان میں گئے رنگین پھول شبنمی رات میں  
بھیک رہے تھے۔ اماں کے گھر کے اندر ایک شور تھا۔

اماں اور ابا کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ بڑے بھیا کے  
کپڑے کے پاس ٹومی بھوک رہا تھا۔ ہر طرف  
اندھیرا تھا۔ باہر بارش بڑی تیز تھی۔ دبے قدموں  
چلتا ہوا کوئی اس کے قریب سے گزر گیا۔ اسے  
جھرجھری سی آئی اور وہ گھبرا کر اندر آگئی۔ جہاں  
آوازیں رخ پھیر کر گزر گئیں۔

”پھلے پھول اور کانٹے تھے

دھڑکی ساری پچاسی تھی

گر جے کا گھنڈہ ٹوٹ گیا تھا

پر نہ کھلی تھی آنکھ اس کی

وہ بیٹھے جوڑ رہی تھی

تکلی کے رنگین پردوں کو

.....☆.....

نے بھائی کی پہنی ہوئی قمیض کو تھام لیا۔ وہی خوشبو  
وہی مہک تھی۔ اماں کے گھر کی آپا تھانی اسے یاد  
آئی۔ شیر اور وہ دونوں بھیا کی قمیض کو کھینچ رہے  
ہیں۔ مریم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ماضی یاد آگیا۔

”بھیا ہمیشہ اپنی قمیض میں پیسے بھول جاتے  
تھے۔ دیکھو تو سہی۔“ اس نے قمیض کی جیب میں  
ہاتھ ڈالا تو بلو بھائی واقعی پیسے بھول گئے تھے۔ اسے  
اماں کے گھر کی آپا تھانی یاد آگئی کہ بھی شیر اور ڈر رہی  
ہے کہ مجھے دے دو بھائی کے کپڑے اور اماں پوچھ  
رہی ہیں۔

”کیا ہے ان کپڑوں میں، تم لوگ گلو کے کپڑے  
دھو، وہ ناراض رہتا ہے۔“

”ان کے کپڑے تو کبھی نہیں دھوؤں گی۔“ اسے  
یوں لگا۔ شیر اکھیں کونے سے نکل کر آگئی ہے۔

”دیکھو ان کم بختو کو میرے کپڑوں کو ہاتھ نہیں  
لگاتیں۔“ گلو بھائی بھی کسی کونے سے نکل کر کھڑے  
ہو گئے۔

”میں خود دھلوا دیتی ہوں ماسی سے۔“ اماں  
غصے سے کھڑی ہو گئیں۔ سب کچھ یاد آگیا تھا۔ مریم  
بنے جارہی تھی۔ ہنستے ہنستے اس نے کھڑکی سے  
آسمان کی سمت دیکھا رات کی تاریکی ٹوٹ رہی  
تھی۔ دن کی آہٹ اس کے وجود کو گزرنے لگی تھی۔  
اسے آنے والی صبح سے خوف تھا جو دمبر کی سرد  
راتوں کو خیر باد کہہ کر نئے سال کا ابدی پیغام لے کر  
اماں کے صحن میں صبح اترتی تھی۔ کتنی خوف ناک سرد  
لہر اس کی ریزہ کی ہڈی کو کراس کرتی ہوئی گزر گئی۔  
سامنے چھوٹے بھائی کا تابوت رکھا تھا۔ صبح کی پہلی  
کرن اتر کر اس پر پھیل گئی تھی۔ کتنی لمبی اور تاریک  
رات تھی جس کا اسے انتظار تھا کہ صبح نہ آئے۔ اس  
نے در پیچے پر پڑا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ باہر سیاہ رات کا  
اندھیرا طاری تھا اور تک اضلال اور کھر کے گھرے

# نبہ سے مانگ کر میں نبہ کر

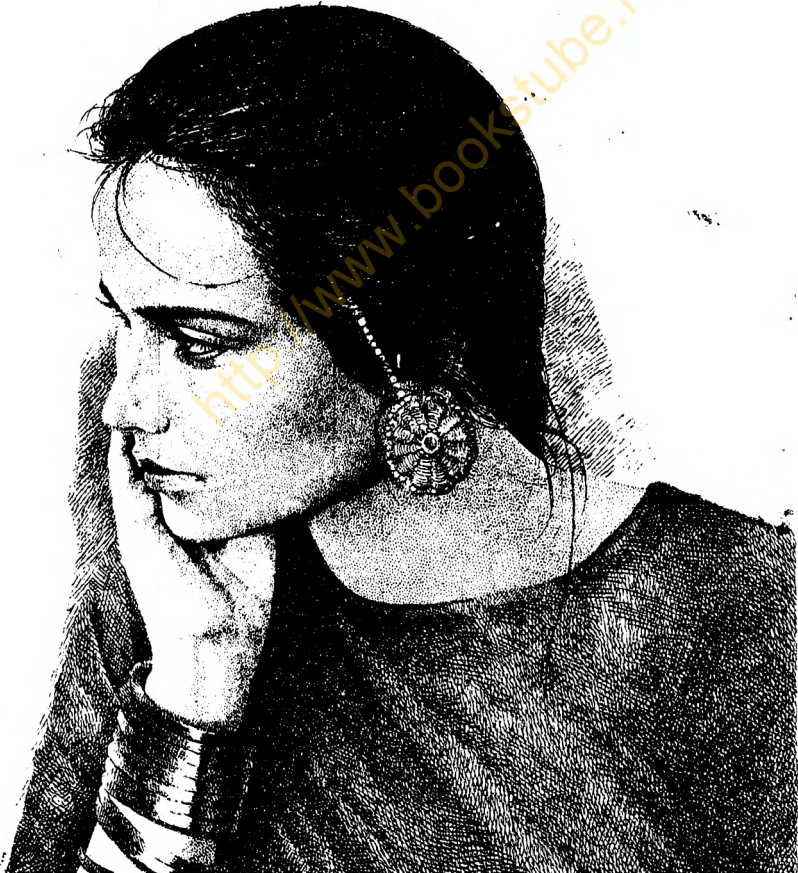
ہوشم نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا تھا؟ کیوں کہ بڑی مایہ کار دیہ اور لہجہ اسے بہت دکھ رہا تھا وہ ان سب کو اپنا سمجھتا تھا مگر بڑی مایہ نے کئی غیریت کا ثبوت دیا اور کرتی بھی کیا ٹھیک ہی کیا یہ تو فاران کے





ساتھ بھی ظلم تھا اس کی بیوی سے شادی۔  
 ”لنت ہے ہشتم احمد تم پر۔“ ضمیر اسے کتنے دنوں سے لعنت ملا مت کر رہا تھا اور یہ بات اس کی غیرت  
 گوارہ نہیں کر رہی تھی۔  
 اس نے نانا جان کو بھی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ خوشی کو اس گھر میں نہیں رکھے گا کیوں کہ وہ اپنی بیوی کی  
 اٹختے بیٹھتے بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا بیوی مایا سے گری ہوئی نگاہوں سے دیکھیں یہ تو وہ بالکل گوارہ نہیں  
 کرے گا۔

”ہشتم! تم غصے میں جلد بازی کر رہے ہو۔“  
 ”نانا جان! میں نے جو بہتر سمجھا وہی کیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے اور گلے پڑاؤ حول بجانا ہے۔ مگر یہاں  
 نہیں کیوں کہ میں اپنی بیوی کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ مرتضیٰ علی کے روم سے آواز



دیکھتی ہیں۔ میں نے آپ کو اس لیے آفر دی تھی آپ کے خواب اسی طرح پورے ہو جائیں گے۔“  
 ”شٹ اپ! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں کیوں کہ وہی لڑکیاں خواب اونچے سجاتی ہیں جن کی تربیت میں کچھ کی ہو یا جن کی مائیں ان کا داغِ خراب کر دیں یا سر پر چڑھ جائیں۔“ خوشنما کے دل میں تو لگتا تھا آگ بھری تھی جو شعلے باہر نکل رہے تھے۔

”ہاں! سوائے پوز کرنے کے کچھ نہیں آتا، کیوں کہ آپ ٹڈل کلاس لڑکیوں کے ہی سب سے زیادہ غرے بھی ہوتے ہیں۔“ کشم کو کچھ جانے والوں کا ہاتھ تھے وہ کیسے لوگ تھے۔  
 ”چاہیں کن کن لڑکیوں سے ملتے ہیں۔“ انداز اس کا فہماشی اور طنزیہ ہو گیا۔  
 ”فضول بکواس کا میں عادی نہیں ہوں۔“ وہ سلگ گیا۔

”آپ اس وقت جائے شام زیادہ ہو جائے گی پھر کنوئیں کا مسئلہ ہو گا۔“ جانے کیوں ہشتم کو اس حیکمی مزاح والی لڑکی سے اتنی کیوٹرائسٹ اور لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ خود کو جیسے اس کے بغیر ادھورا سمجھنے لگا تھا۔ گھر کی جو ٹینشن تھی وہ اس میں بھی خوشنما سے غافل نہیں تھا۔ اسے خوشنما کی سادگی صاف کوئی سچائی بہت متاثر کر گئی تھی۔ اس نے خوشنما سے وفا شعاری کا سبق بھی لے لیا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے کتنی محبت کرتی تھی جب کہ وہ اسے کچھ سمجھتا نہیں تھا پھر بھی وہ خود کو اس کے نام پر رکھے ہوئے تھی۔ یہ بھی تو ٹڈل کلاس لڑکی تھی اس میں اس کے ماں باپ کی تربیت کا دخل تھا۔ جنہوں نے اس کی اچھی تربیت کی تھی اور لڑکیوں کی طرح اس میں غرے اور زناکت والے انداز نہیں تھے۔ جب کہ کتنی نرم و نازک سرخ و سپید خوب صورت نقوش والی خوشنما بالکل بھی غور نہیں کرتی تھی۔ اسے جیسے اپنے حسن کی پرواہ ہی نہیں تھی یا پھر اسے خبر نہیں تھی یا انجان تھی وہ حسن کی دولت سے مالا مال ہے۔

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج پہلی دفعہ دیر تک کام نہیں کروں گی۔ اسٹارٹ میں آپ مجھ سے دیر تک ہی کام لیتے تھے۔“ ساتھ ہی اس نے جنایا ہشتم تو لگتا تھا اس کے حسن کے پیچ و خم میں الجھ گیا تھا۔

”آں ہاں۔“ وہ کچھ جیز ہو گیا۔

فان کلر کی پینٹ آف دائنٹ چپک کی شرٹ میں وہ کتنا سویر لگ رہا تھا۔  
 ”بٹ میں آج آپ کو اتنی دیر کی اجازت نہیں دیتا فوراً ٹیپے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ کیوں کہ مجھے بھی ادھر ہی کام سے جانا ہے۔“ مرتضیٰ علی کی کال آگئی تھی وہ جاوید احمد کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اسے بھی وہیں پہنچنے کو کہا تھا اس نے سوچا خوشنما کو بھی راستے میں ڈراپ کر دے گا۔

”وہ وہ نہیں مجھے کام کرنا ہے۔“ وہ گڑبڑا گئی۔

”ادھہ مائی فٹ۔“ کشم کو پہلے ہی جھنجھلاہٹ تھی۔

”فوراً پیچ آؤ میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں۔“ وہ اس کی سنے بغیر قدم بڑھا تا ہوا نکل گیا۔

☆.....☆

”اس دفعہ دادی جان کا لمبا ہی قیام ہو گیا ہے۔“ مزمل کو حیرانگی بھی تھی۔  
 ”وہ آج کل میں بھابھی کو نوٹ کرنے آئی ہیں۔“ طلحہ انہیں جانتا تھا کیوں کہ مسلسل حباب پر ٹوکا ٹاکی



اکیلے ہیں اور ہماری ماں کے پاس چار بیٹے ہیں اور خود دادی جان کون سا کھ سے ہیں۔ تائی امی سے ان کی بچی نہیں ہے۔ تایا اب اپنی بیوی کی ہی حمایت کرتے ہیں۔“

”کہتے ہیں سسرال میں اگر شوہر کی سپورٹ حاصل نہیں ہو تو بیوی بہت کمزور اور اکیلی ہوتی ہے۔“

حباب نے بھی تائید کی کہا۔

”مگر تمہارے ساتھ یہاں بالکل ایسا نہیں ہے۔ شوہر کی سپورٹ حاصل ہے اور ساس دیوروں کی بھی تمہیں کوئی اکیلا کرے گا بھی نہیں۔“ چائے پی کے کپ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں لڑکی سسرال میں اکیلی ہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ رخصت ہو کے لڑکی آئی ہے۔ لڑکا نہیں اس لیے سسرال والے جیسا چاہے سلوک کرتے ہیں اور شوہر اگر قسمت سے اچھا مل جائے۔ تو ٹھیک ہے ورنہ پھر زندگی عذاب بنی ہوئی ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں گویا ہوئی۔

”تمہارے ساتھ یہاں ایسا کون سا سلوک برتا جا رہا ہے۔ کوئی روکتا تو کتنا تک نہیں ہے۔ شوہر کو تم کچھ سمجھتی نہیں ہو۔“ ساتھ ہی اس نے بھی طنز کا تیرا اچھالا۔

”اب خود ہی دیکھ لیں میری ایسی بات پر کیسے آپ کا رویہ بدل گیا۔“

”یار! تم بات ہی عجیب کر رہی ہو اتنا تو سب خیال رکھتے ہیں تمہارا اس پر بھی تم منہ بنا کے رکھتی ہو۔“

ضمران نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ سب کی وجہ سے آپ کی دادی جان اور پھوپھو مجھ سے جلتی تپتی رہتی ہیں میں یہاں خود سے تو چل کے نہیں آئی ہوں۔“ وہ رو ہانسی ہوئی۔

”حباب پلیز! اب رونا دھونا نہیں تم ان کی باتوں کا کیوں اثر لیتی ہو۔ تم صرف مجھ سے غرض رکھو۔“

ضمران سے اس کے آنسو نہیں دیکھے جا رہے تھے۔

”میں اثر لینا نہیں چاہتی مگر وہ مجھے ذہنی نارچہ کر کے ان باتوں پر اثر لینے پر مجبور کرتی ہیں۔“

”اچھا چلو چھوڑو فضول میں بحث ہی بڑھے گی۔ تم گھر جانا چاہتی ہو میں چھوڑ کے آتا ہوں۔“ لگتا تھا اسے حباب پر ترس آنے لگا تھا واقعی اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا جو اسے باتیں سنائی جاتی ہیں طنز کیے جاتے ہیں۔

”مجھے نہیں جانا پہلے منع کر دیا پھر جانے کا کہہ رہے ہیں۔“ وہ روٹھ کے بیڈ پر ہی لیٹ گئی۔

ضمران کو وہ کسی بھی بہت چھوٹی سی بچی لگتی۔ جسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ تو اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ بہت حساس اور نازک مزاج کی ہے۔ کچھ ماں و باپ کی علیحدگی کی وجہ سے بھی حباب کی شخصیت بہت متاثر ہوئی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی ویسے میں نے منع کی وجہ سے کیا تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔“ ضمران نے اس کا چہرہ بنوڑ دیکھا وہ بہت بے زار لگ رہی تھی۔

”دیکھو! تم ان سب کی باتوں کو ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دیا کرو دل نہیں جلاؤ۔“

”یہ سب کہنا بہت آسان ہے ضمران صاحب! مگر جب لوگ بار بار جتاتے ہیں اور احساس دلاتے ہیں تو ہی دل بھی جلتا ہے۔“ وہ کپ اٹھا کے باہر نکل گئی۔

ضمران کی خود سمجھ نہیں آ رہا تھا حباب کو وہ کیسے سنبھالے اگر شہریار سے کچھ بولتا ہے تو حباب پھر اس سے لڑے گی کیوں کہ شہریار، حباب کو سمجھانے جو لگتا ہے۔

☆.....☆

کب سے وہ سب آئے بیٹھے تھے اور اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔  
 ”بی بی کو آج ہی کام تھا۔“ رونا کو فکر بھی ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک جونہیں آئی تھی۔  
 مرتضیٰ صاحب بھی بار بار اس کے موبائل پر کال کر رہے ہیں مگر وہ آف کیے بیٹھی ہے۔ ”امی کو فکر ستائے جا رہی تھی۔ مغرب کی اذانیں ہو گئی تھیں عمو! وہ اس وقت آجانی تھی ستمبر شروع ہو گیا تھا اور اذانیں سات بجے ہونے لگی تھیں۔“  
 ”بشم ابھی تک نہیں آیا۔ وہ تو کہہ رہا تھا میں پہنچنے والا ہوں۔“ مرتضیٰ علی کو جاوید احمد کے سامنے شرمندگی ہو رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے کوئی کام پڑ گیا ہو۔“ حالانکہ کلرمند جاوید احمد بھی ہو رہے تھے۔  
 شمیمہ کی نگاہیں مسلسل دروازے پر لگی تھیں خوشنما بھی تو نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھیں بہت ضدی طبیعت کی ہے۔

اسی وقت ڈور بیل ہوئی۔ وہ فوراً گیٹ پر گئی تھیں۔  
 سامنے بشم کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اس نے سلام کیا۔  
 ”ولیکم السلام۔“ جلدی سے اسے راستہ دیا وہ اندر جھلکتا ہوا آ گیا بلیک پینٹ پر لائٹ پنک شرٹ میں وہ چارمنگ لگ رہی تھا۔  
 ”شکر ہے آگئے۔“ مرتضیٰ علی نے بھی تشکر بھرا سانس لیا۔  
 ”کیا بات ہے آج خوشی بیٹا کو اتنی دیر ہو گئی آنے میں۔“  
 ”جی ہاں نہیں کیا بات ہے ورنہ عمو! پانچ بجے تک آ جاتی ہے۔“ جاوید احمد شرمندہ ہوئے بشم کے چتون خیلے ہوئے وہ چومک گیا۔

”جاوید! میں خوشی بیٹا کو سمجھتا ہوں وہ جان کے ہم سے بچ رہی ہوگی۔“ وہ سمجھ گئے تھے۔  
 ”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ شرمندہ ہوئے۔  
 ”دیکھو! اس کا غصہ حق بجانب ہے۔“ انہوں نے ان کی شرمندگی کو ختم کیا۔  
 اسے میں وہ بھی آگئی تھی مگر بہت غصے میں تھی۔ کیوں کہ بشم نے زبردستی اسے ڈراپ کیا تھا چند لمحوں پہلے اتڑی تھی اس لیے چل چل کے پسینے میں ہو گئی تھی۔  
 ”شکر ہے آپ! آپ آگئی ہیں۔ بشم بھائی بھی آئے ہیں۔ بڑے ہینڈسم لگ رہے ہیں۔“ رونا تو بہت ہی ایکساٹینڈ ہو رہی تھی۔

”فضول بکواس نہیں کرو۔ میرے کپڑے پر پس کر دو۔ میں پہلے نمازوں کی بہت حشر خراب ہو رہا ہے۔“ وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہ رہی تھی۔  
 ”آپ! ابھی طرح تیار ہونا آج آپ کی رخصتی ہے۔“ امین نے بھی شرارت سے اسے چھیڑا۔

”تم دونوں کا دماغ خراب ہے۔ میں اس لیے تیار نہیں ہو رہی ہوں مجھے گرمی لگ رہی ہے۔“ وہ کپڑے بیل پر ڈال کے داش روم میں چلی گئی تھی۔ رہنا اور ایمن نے ان لوگوں کے لیے ناشتہ وغیرہ سرود کر دیا تھا وہ خوشنما کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

”بلائیے ہماری بیٹی کو۔“ مرتضیٰ علی کو جلدی تھی۔ جب کہ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اس کا تو پہلے ہی دل عجیب ہو رہا تھا ایک طرف خوشنما کو دل میں بسا چکا تھا اور ایک طرف یہ اس کی بیوی کیا کرتا اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”ہشتم احمد! خوشنما کسی کی بیوی ہے کیوں کسی کی بیوی پر نگاہ رکھ کر گناہ کے مرتکب ہوتے ہو۔“ اندر سے ضمیر نے لعنت ملاحت کی تھی۔ ”یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے اسے عزت سے لے کے جاؤ پہلے ہی اس کی تم نے بہت بے عزتی کی ہے۔“

”کیا بات ہے ابھی تک وہ آئی کیوں نہیں؟“ جاوید احمد نے شمینہ سے پوچھا۔

”وہ آج جانے کو منع کر رہی ہے۔“

”ارے یہ کیا بات ہوئی۔“ جاوید احمد کو غصہ آنے لگا۔

”آرام سے جاوید وہ بچی بہت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس نامعقول کی وجہ سے میں بات کرتا ہوں۔“ وہ انہیں چپ کرانے لگے۔

”نانا جان! میں بات کروں۔“ اس نے مجبوراً لب کھولے ان تینوں نے ہی حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ جاوید احمد تو بھی چاہتے تھے یہ دونوں خود ہی مل کے کوئی بات کریں گے تو

بہتر ہوگا۔

اندر خوشنما نے سنا کہ وہ اس سے بات کرنے آ رہا ہے۔ تو وہ گڑبڑا گئی۔ سامنے کرنے پر حقیقت اس پر واضح ہو جائے گی اور اتنی جلدی وہ ہشتم کو معاف نہیں کرے گی۔

”امی! میں ان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“ اس نے صاف منع کر دیا۔

”پھر گھر جا کے بات کرنا رہنا اس کا سوٹ کیس اٹھاؤ جو پیک کیا تھا۔“ وہ تو جیسے انکار سننا ہی نہیں

چاہتی تھیں۔

”امی! یہ کیا کر رہی ہیں؟“ وہ روہانسی ہونے لگی۔ مگر شمینہ نے اسے زبردستی چادر اوڑھائی اور واسطے

دیوہ منہ چھپائے روئی ہوئی چلی گئی۔ ہشتم نے چونک کے اس کے وجود کو دیکھا کچھ گمان گزرا تھا۔

مگر چہرہ چھپا تھا۔ میرون کلر کی بڑی سی چادر جس پر شیشوں اور دھاگوں کی کڑھائی تھی اس میں وہ

لپٹی تھی۔

”نانا جان! ان سے بولنے اپنی سسکیاں بند کریں کیوں کہ ہم انہیں کڈنیپ کر کے نہیں لے جا رہے۔“

اسے رونے سے کوفت ہو رہی تھی۔

مرتضیٰ علی مسکرائے وہ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

”خوش بیٹا! چپ ہو جاؤ اس نامعقول کو جو دل چاہے سزا دینا، میری طرف سے اجازت ہے۔“ انہوں

(جاری ہے)

نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔



مکمل ناول

# ایک تہی ساسرہ

وہ ساحرہ انتہائی بے یقینی سے سامنے والا منظر  
دیکھ رہی تھی۔ یہ منظر اس کے لیے بہت تکلیف دہ  
تھا۔ درد کی شدت سے اس نے اپنی آنکھیں بند  
کر لیں مگر درد اس لمحے صرف اس کی آنکھوں میں



نہیں بلکہ اس کے پورے بند کے اندر خون کی مانند دوڑ رہا تھا۔ ساحرہ نے چاہا کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنے کسی سحر سے وہ اس منظر کی بد صورتی کو خوب صورتی میں بدل دے مگر زندگی میں پہلی بار اس کا ہر سحر بے اثر جا رہا تھا۔ وہ کسی پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی مگر بے بس تھی۔ کچھ ہی دیر میں سامنے سے آگ کے شعلے اس کی طرف بڑھنے لگے مگر وہ آگ کے شعلے نہیں کسی کی نفرت سے بھری ہوئی نگاہیں تھیں۔ جو

بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ بھاگ کر اسٹور روم میں چلی گئی مگر وہ نگاہیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں، کچھ ہی دیر میں وہ ان شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ اس کا پورا روبرو جل رہا تھا۔ وہ رونا، چیخنا اور چلانا چاہتی تھی۔ مگر کسی نے اسے یہ موقع بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اوندھے منہ گر پڑی تھی۔ سامنے کھڑے نفوس اس کی اس حالت پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں موندھ لیں۔ وہ ساحرہ اس روز ہار گئی تھی دس سال پر محیط اس کا



سحر نوٹ چکا تھا۔

چٹا گلز بھرے تے.....

کاسنی دوپٹے والے.....

منڈا صدف تیرے تے.....

لڑکیاں نہایت بلند آواز میں مہندی کے گیت گا رہی تھیں۔ آئزہ اسٹیج پر بیٹھی مسکراتی ہوئی سب کو دیکھ رہی تھی۔ یہ گیت سننا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان گیتوں نے فضا میں کچھ شوخ سے رنگ بھر دیے تھے اور آئزہ کا پورا وجود ان رنگوں میں رنگ گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں باقاعدہ طور پر مہندی لگانے کا آغاز ہو گیا۔ مہندی کی اس خوشبو کو لمحہ لمحہ وہ اپنے اندر اتار رہی تھی۔ جس شخص کے نام کی اسے مہندی لگ رہی تھی وہ تو اسے جانتی تک نہیں تھی مگر اس لمحے اس نے اس شخص کو اپنا نام لیا تھا۔ وہ ابھی اسے خود سے بھی پیارا ہو گیا تھا۔ اپنی مہندی کی رات ہر لڑکی شاید ایسے ہی تجربات سے گزر رہی ہوگی۔ اپنے آنے والے کل کے حوالے سے رنگوں، پھولوں اور خوشبوؤں سے سچ خواب اس کی دہلیز پر دستک دیتے ہوں گے۔ ایسے ہی کچھ خواب آئزہ سجاد کی آنکھوں میں بھی آن بے تھے جسے کچھ دیر پہلے ہی حاشر محمود کے نام کی مہندی لگ چکی تھی۔ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے بچھڑنے کا دکھ اپنی جگہ مگر آئزہ کو ایک اجنبی کے بارے میں سوچنا بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جواب اجنبی نہیں بلکہ اس کے دل کا کمین بن چکا تھا۔ اس رات آئزہ نے اپنے دل کے سارے دروازے اس ایک شخص کے لیے کھول دیے تھے۔

”نیلو بھابی! جلدی کریں ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ حاشر بھگلتا ہوا اپنی بھابی کے کمرے میں داخل ہوا جو اس وقت تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

”چلے چلتے ہیں جناب دیور صاحب! ایسی بھی

کیا بے مبری۔“ نیلم نے مسکراتے ہوئے اپنے دیور کی طرف دیکھا جو کالی شیروانی میں کسی مظیلہ شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

”بارات تیار کھڑی ہے نیلو بھابی! مگر آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا دیور آپ کے بغیر نہیں جائے گا۔“ حاشر کا لہجہ بھی اب خوشگوار ہو گیا تھا۔

”بس میں تیار رہی ہوں۔ اظہر کہاں ہیں؟“ نیلم نے اپنے دوپٹے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”اظہر بھائی اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر آپ میرے ساتھ میری گاڑی میں جائیں گی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں گی۔“ حاشر نے حکمیانہ انداز میں کہا۔

”اوکے پاس!“ نیلم ہنستے ہوئے بولی اور حاشر کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑی جہاں باقی بارات ان دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔

سید محمود شاہ کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا اکبر محمود ایم بی اے کرنے کے بعد ایک ملٹی مشینل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ اس نے اپنی پسند سے شادی کی تھی مگر اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ چند سال پہلے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد چند گھریلو اختلافات کے باعث وہ علیحدہ ہو گیا تھا مگر وقتاً فوقتاً محمود شاہ صاحب سے ملنے کے لیے آتا رہتا تھا۔ ان کا دوسرا بیٹا اظہر محمود ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اس نے الٹراساؤنڈ کرنے میں مہارت حاصل کی اور اب وہ ایک انتہائی مشہور الٹراساؤنڈ اسپیشلسٹ تھا اور اس کی شہرت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اظہر کی شادی انہوں نے اپنی بیوہ بہن کی بیٹی سے کر دی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ سوچ کارفرما تھی کہ یتیم لڑکی اچھے طریقے سے ان کا گھر سنہال لے گی۔ نیلم نے بلاشبہ بہت اچھے طریقے سے گھر کا انتظام چلایا مگر وہ طبیعت کی ذرا تیز تھی یہی وجہ تھی کہ ان کی



ہو جائے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نیکم کے دل میں کیا ہے اور آنے والے وقت کے حوالے سے وہ کیا منصوبے بنارہی ہے۔

☆.....☆

جلد عروسی میں موجود آرزو سجاد کو اچانک کسی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس کا ہمسفر آن پہنچا ہے۔ بے اختیار اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کھڑا شخص اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ اسے سکرانے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گیا اور نازک سا بریلٹ اس کی نازک کلائیوں میں پہنا کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی محبت کا قیدی بنالیا۔ اس کا حنائی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر حاشر کشی در پیٹھا رہا اور پھر اسے اپنی زندگی کی کچھ اہم حقیقتیں بتانے لگا۔ آرزو کو اس کی آواز، اس کے الفاظ بہت اچھے لگ رہے تھے اور کچھ لمحوں کے لیے تو وہ اس کی گفتگو کے سحر میں کھوئی گئی تھی۔

”آرزو! میری امی کے جانے کے بعد نیلو بھابھی نے اس گھر کو جنت بنا دیا ہے۔ آپ اگر اس جنت میں رہنا چاہتی ہیں تو آپ کو نیلو بھابھی کو وہی اہمیت دینی ہوگی۔ جو آپ مجھے دیں گی۔ ان کا کہا ہوا ہر لفظ آپ کے لیے حکم کی حیثیت رکھے گا۔“

آرزو سر جھکائے اپنے ہمسفر کی باتیں سنتی رہی۔ وہ رات ان دونوں کی رات تھی مگر حاشر ایک تیسرے کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ساری رات آرزو کو یہی سمجھاتا رہا کہ اسے نیلو بھابھی کو کتنی اہمیت دینی ہوگی۔ پہلی رات کا دیا ہوا سبق اب آرزو ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی۔

سجاد احمد کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کے لیے جب ان کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تو انہوں نے رضامند ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر

نیگم کی زندگی میں بھی ساس بہو کی روایتی چپقلش اکثر دیکھنے میں آتی رہتی تھی مگر ان کی نیگم کے انتقال کے بعد نیکم نے سارے اختلافات بالائے طاق رکھ کر ان کے گھر کو بلاشبہ جنت بنا کر رکھ دیا تھا۔ محمود شاہ صاحب کا نیکم بہت خیال رکھتی تھی۔ ایک لحاظ سے ان کی بیٹی کی کمی کو اس نے پورا کر دیا تھا۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا حاشر محمود ان کے دونوں بیٹوں سے زیادہ ذہین اور پرتلاش شخصیت کا مالک تھا۔ بزنس اینڈ مینجمنٹ میں ماسٹر کرنے کے بعد اب وہ اپنا بزنس کر رہا تھا۔ وہ انکسٹریٹس کی مختلف اشیاء کو دوسرے ممالک میں بھیجتا تھا اور وہیں سے اشیاء منگوا کر مقامی مارکیٹ میں سپلائی کرتا تھا۔ ابھی اس کا بزنس بہت محدود دیکھنے پر تھا مگر محمود صاحب کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد بزنس میں بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ اس کو کاروبار کرنے کے لیے سرمایہ بھی انہوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ حاشر بھی اپنے باپ کے یقین کو سچ ثابت کرنے کے لیے کاروبار پر پھر پور توجہ دے رہا تھا۔ محمود شاہ نے حاشر کا رشتہ اپنے ایک دوست کی بیٹی سے طے کر دیا تھا۔ حاشر نے اس معاملے میں فرما برداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی پسند پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ حاشر تمام گھروالوں میں سے اپنی بھابھی نیکم کے بہت قریب تھا۔ نیکم بھی حاشر کا چھوٹے بچوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ حاشر کا خیال رکھنے کے چکر میں وہ اکثر اطہر کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ محمود صاحب اکثر اس بات کو محسوس کرتے تھے مگر خاموش رہتے تھے، ویسے بھی وہ گھریلو معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے تمام اختیارات نیکم کو سونپ رکھے تھے۔ اب جب کہ حاشر کا رشتہ طے ہو چکا تھا تو انہیں امید تھی کہ گھر میں ایک اور فرد کے آجانے سے نیکم کا رویہ بھی اطہر کے ساتھ ٹھیک

نہیں لگائی، کیوں کہ وہ محمود شاہ کو بہت سالوں سے جانتے تھے اور ان کی خاندانی شرافت اور وضع داری کے قائل تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ آزرہ وہاں بہت خوش رہے گی اور یہی یقین انہوں نے آزرہ کے سپرد کر دیا۔ ان کے اسی بھروسے اور اعتماد کی ڈور تھام کر آزرہ اپنے گھر سے رخصت ہوئی۔ سیاح احمد کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور سب بچے اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔ اس خوشگوار زندگی کا سارا کریڈٹ وہ اپنی بیگم کو دیتے تھے۔ ان کے اچھے رویے کے باعث ان کی کسی بہو کو کبھی ان سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ ان کے آئین میں اب پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں کی چکارس گونجتی تھیں اور اپنا گھر انہیں کسی جنت سے کم نہیں لگتا تھا۔ آزرہ کی رخصت کے بعد وہ دونوں میاں بیوی بہت پرسکون تھے کہ ان کی آخری اولاد بھی بالآخر اپنے گھر کی ہوئی۔ آنے والے دنوں کی تیغیوں سے بے خبر ان کا خاندان زندگی کے خوشگوار لمحوں سے بھر پور طریقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆.....☆

آزرہ کو حاشر کی سنگت میں دن گزارتے ہوئے ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ اپنا سسرال اسے کسی وعظ و نصیحت کی طرح لگتا تھا اور بعض اوقات سسرالیوں کے عجیب و غریب رویے اسے بہت حیران کر دیتے تھے۔ حاشر اسے ایک نہایت سنجیدہ انسان لگے تھے۔ وہ اکثر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں شادی کے بعد کہیں گھومنے بھی نہیں جاسکے تھے۔ اس سلسلے میں آزرہ نے حاشر سے ایک دو بار بات بھی کی تھی مگر ہر بار حاشر نے اپنی کاروباری مصروفیات کا رونا دھونا جس کے باعث اس نے اب اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا چاہتی

تھی مگر نیلو بھائی تو اسے کچن میں داخل بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ انہوں نے اسے کہہ دیا تھا کہ کم از کم تین ماہ تک وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔ آزرہ نے بہت بار کوشش کی کہ وہ کچن میں جا کر ان کی کچھ مدد کروادے مگر نیلو بھائی ہر بار اسے کسی نہ کسی بہانے سے واپس کمرے میں بھیج دیتے تھے۔ بلکہ ایک دو بار تو گھر کے نوکروں کے سامنے بھی وہ آزرہ سے سختی سے پیش آتی تھیں۔ نیلو بھائی کی دو بیٹیاں تھیں جو بالترتیب چھٹے اور سات سال کی تھیں اور انتہائی شرارتی اور بدتمیز تھیں۔ وہ بھی اکثر آزرہ کے ساتھ بہت بدتمیزی سے بات کیا کرتی تھیں۔ آزرہ کا دل نہ صرف گھر کے کاموں سے بلکہ اس گھر سے بھی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نوکری کرنا چاہتی تھی مگر حاشر کے سرد رویے کے باعث ان سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ایک بات اسے بہت حیران کرتی تھی کہ حاشر کی سنجیدگی صرف ان کے کمرے تک محدود تھی۔ جب وہ نیلم کے ساتھ ہوتا تھا تو اس کی شوخیاں عروج پر ہوتی تھیں اور نیلم بھی ہر کام میں حاشر کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتی تھی۔ حاشر اپنے تمام کام آزرہ کے بجائے اپنی بھانجی سے کروانا پسند کرتا تھا اور یہ سب کچھ وہ آزرہ کو شادی کی پہلی رات ہی بتا چکا تھا کہ اسے اپنی بھانجی کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا کیا ہوا کام پسند نہیں ہے۔ آزرہ نے بہت بار کوشش کی کہ وہ اپنے شوہر کے تمام کام خود سے کرے مگر نہ حاشر اور نہ ہی نیلم کوئی بھی اس کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔

آزرہ کو لگتا تھا کہ وہ اس گھر میں صرف ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح ہے اور کسی روز جب وہ پرانی ہو جائے گی تو اٹھا کر باہر پھینک دی جائے گی۔ اس کے سسر محمود شاہ صاحب اپنی بیگم کے انتقال کے بعد اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے

تھے۔ انہیں گھریلو معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس گھر میں آئزہ کو سب سے زیادہ مظلوم شخصیت اپنے جٹھ ڈاکٹر اطہر محمود کی لگی تھی۔ نیلم اس کی دونوں بیٹیاں ڈاکٹر اطہر سے بہت بدتمیزی سے بات کیا کرتی تھیں۔ ان کو ان کے گھر والوں نے شاید پیسے کمانے والی مشین سمجھ رکھا تھا۔ آئزہ کو کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ اس گھر کے بڑے بیٹے ہیں بلکہ اسے تو ان کی حیثیت نوکروں سے بھی کمتر لگتی تھی۔ اسے اپنا اور حاشر کے بڑے بھائی اطہر محمود کا دکھ ایک جیسا لگتا تھا بہت بار اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے جٹھ کے پاس بیٹھے اور ان سے اپنی تنہائیوں کے دکھ بانٹے مگر اس کی ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی لیکن ایک روز اس کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی جب اس نے ڈاکٹر اطہر کے کمرے سے سلسل کھانسنے کی آواز سنی اور بے اختیار اس کے قدم اندر کی طرف بڑھ گئے۔

حاشر محمود کی زندگی میں دو عورتوں کے کردار کی گہری چھاپ بھی۔ ایک اس کی ماں اور دوسری اس کی بھابھی جنہوں نے اس کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس کی ماں اس کی بہترین دوست تھیں۔ دوسرے بھائیوں کی نسبت وہ اپنی ماں کے زیادہ قریب تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک وہ اپنے دل کی ہر ایک بات اپنی ماں سے ہی کیا کرتا تھا۔ اسے اسی بات کا دکھ تھا کہ جب وہ زندگی میں کسی مقام پر پہنچا تو اس کی ماں اسے چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئی۔ وہ بہت گم صم رہنے لگا تھا اور خود کو اس نے تنہائیوں کے خول میں بند کر لیا تھا۔ انہی دنوں وہ بیمار ہو گیا۔ اس کی بیماری کے دنوں میں اس کی بھابھی نے حاشر کا اتنا خیال رکھا کہ اسے بعض اوقات شرمندگی محسوس ہونے لگتی کہ وہ ان سے اتنی خدمتیں کروا رہا ہے۔ اسے اکثر ڈراؤنے خواب آنے لگے تھے وہ خوابوں میں ڈر

چاہا کرتا تھا۔ اسے سانس کی تکلیف رہنے لگی تھی مگر نیلم حاشر کے لیے ایک سیوا ہی تھی جس نے دن رات اس کی دیکھ بھال کی اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دوبارہ سے زندگی کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کرے۔ ان کی توجہ کے باعث وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا وہ اپنی نیلو بھابھی کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دل کی مسند پر ماں کی جگہ اپنی نیلو بھابھی کو بٹھا دیا۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جنہیں زندگی کے ہر موڑ پر کسی نہ کسی عورت کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پہلا سہارا اس کی ماں نے دیا تھا اور پھر نیلو بھابھی نے اس کی بکھری ہوئی شخصیت کو سمیٹا۔ حاشر کو لگتا تھا کہ ان جیسی خاتون دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جب محمود صاحب نے حاشر سے اس کی شادی سے متعلق بات کی تو اس نے ان سے کہہ دیا کہ سارے اختیارات نیلو بھابھی کے پاس ہیں وہ جس لڑکی پر انگلی رکھ دے گی حاشر اسے اپنی زندگی کی ساتھی بنا لے گا۔ نیلم نے اس کی زندگی کے ہمسفر کے طور پر آئزہ کا انتخاب کیا تھا جو بلاشبہ بہت خوب صورت تھی اور اس کو دیکھتے ہی حاشر نے بے اختیار اپنی بھابھی کی پسند کی داد دی تھی۔ آئزہ کے زندگی میں آجانے سے اس کو کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اب بھی اپنے سارے کام اپنی بھابھی سے ہی کروا رہا تھا کیوں کہ کسی اور کے ہاتھ سے کیے ہوئے کام اسے پسند نہیں آتے تھے۔ شادی کو چار ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ اب آئزہ کا رویہ اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اسے اکثر نیلم کچن میں نوکروں سے کام کرواتی نظر آتی اور آئزہ اپنے کمرے میں آرام کرتی نظر آتی تھی۔ اس نے بہت بار نیلم سے اس سلسلے میں بات کی مگر وہ ہنس کر اس کی بات ٹال دیا کرتی تھی اور اسے منع بھی کرتی تھی کہ وہ آئزہ پر گھر کے کاموں کے لیے دباؤ نہ



زبانی وہ جان چکی تھی کہ اس کے بیٹھ ڈاکٹر اطہر بہت بیمار ہیں اور دو دن سے اسپتال بھی نہیں جا رہے۔ اسی لیے ان کی خیریت دریافت کرنے وہ پہلی دفعہ ان کے کمرے میں آئی تھی مگر نیلو بھابھی کے ڈر کے باعث وہ جلد از جلد وہاں سے لٹکانا چاہتی تھی۔ اسی لیے دل ہی دل میں بھابھی کے روئے پر لعنت ملا مت کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ حاشرے اس سلسلے میں ضرور بات کرے گی۔ اسے تمام گھر والوں کے روئے پر بہت انوس ہو رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنے وقت گھر کے نوکر اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ اطہر جلد از جلد ٹھیک ہو کر اپنے کام پر واپس جائیں مگر اتنا نہیں جانتی تھی کہ اس ذرا سی دیکھ بھال کی سزا اسے کتنی بڑی ملے گی۔

☆.....☆

بہت دنوں سے چھائے جس کے بعد ہادل کے چند کلزوں نے بالآخر زمین کے چپے چپے کو سیرابی بخش دی تھی۔ گرمی کے ستائے لوگوں کے لیے بوندوں کے وہ چند موتی ہی آب حیات ثابت ہوتے تھے اور ہلکی ہلکی سی ہوائے موسم کا لطف دو بالا کر دیتا تھا۔ حاشر بھی اسی حسین موسم کا محروم لینے کے لیے آفس سے ذرا جلدی نکل آیا تھا اور اس لمحے بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ آئزہ کے ساتھ مل کر موسم کے ان سارے رنگوں کو سمیٹ لے اور اسی بے اختیار کے عالم میں وہ آئزہ کو فون ملا بیٹھا اور اسے تیار رہنے کا حکم صادر کر کے اس نے فون بند کر دیا۔ اب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا تا کہ آئزہ کو ساتھ لے کر وہ اس موسم کا لطف اٹھائے۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اسے گھر کے لان میں نیلو بھابھی بیٹھی روئی ہوئی نظر آئیں۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اترا اور نیلو بھابھی کی کرسی کے ساتھ

ڈالے۔ جب اس کا دل راضی ہو گا وہ خود سے سب کچھ کرے گی۔ وہ ان معمولی باتوں کو لے کر اس سے اپنے تعلقات مت خراب کرے۔

نیلو بھابھی کی یہ باتیں سن کر وہ صبح معنوں میں ان کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ آئزہ آہستہ آہستہ اب اس کے دل سے اتاری جا رہی تھی۔ بات تو وہ پہلے بھی اس سے بہت کم کرتا تھا۔ اب اس نے آئزہ کو مخاطب کرنا اور بھی کم کر دیا تھا بلکہ اب تو وہ اپنے کمرے میں بھی بہت لیٹ جاتا تھا۔ اکثر وہ اپنی بھابھی کے ساتھ گھر کے لان میں بیٹھ کر رات گئے تک باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی نیلو بھابھی نے بھی اس کے بھائی اطہر کی عدم توجہی کا شکار ہیں۔ اسے اپنا اور بھابھی کا دکھ ایک ہی لگتا تھا وہ اکثر سوچتا تھا کہ اطہر بھائی اتنی اچھی بیوی سے کیوں بدگمان رہتے ہیں، بہت دفعہ اس کا دل چاہا کہ اطہر بھائی کے پاس بیٹھ کر بات کرے اور ان سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں مگر گھر میں داخل ہوتے ہی نیلو بھابھی کو دیکھ کر اسے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ بس اتنا یاد رہتا تھا کہ بھابھی اکیلی ہیں اسے انہیں وقت دینا چاہیے اور بھابھی کے پاس بیٹھتے ہی گویا سارا جہان پس منظر میں چلا جاتا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا مگر اب ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔

اطہر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آئزہ کو عجیب سے احساسات نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کسی اداس جنگل میں آگئی ہو جہاں ہر چیز بے ترتیب اور ٹکری ہوئی ہو۔ اس کمرے کی ہر ایک شے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ اطہر پریشان حال صورت بنائے اپنے بستر پر لیٹا بہت بری طرح کھائیں رہا تھا۔ آئزہ نے سب سے پہلے اسے پانی پلایا تو اس کی جان میں جان آئی اور اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے سرسری

والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ بھابھی کو اداس دیکھ کر اسے اب اس حسین موسم میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے لٹو پیپر کا ایک ٹکڑا نکال کر ان کی طرف بڑھایا جسے نیلو بھابھی نے لے لیا تھا مگر آنسو پھر بھی ان کی آنکھ کے کناروں کو بھگوئے جا رہے تھے۔

”کیا میں ان آنسوؤں کا سبب جان سکتا ہوں؟“ حاشر نے نیچے گھاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بارش کے بعد بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”حاشر! آرزو کو منع کرو کہ وہ اطہر کے کمرے میں اکیلی مت جایا کرے۔“

اتنا کہہ کر نیلو بھابھی تو اٹھ کر چلی گئیں مگر حاشر کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ اپنے غصے کو ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا، جہاں آرزو بھی سنوری اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سرخ ہتھکڑیوں کے امیر اینڈ ڈسوتھ میں ہلکی سی جیولری اور نیس سے میک اپ کے ساتھ وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اب اس کی تیاری مکمل تھی۔ انتظار تھا تو صرف حاشر محمود کا۔

آرزو ابھی آئینے کے سامنے کھڑی ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ اچانک سے کوئی اس کی پشت پر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ آئینے میں حاشر کو واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ آرزو کو اس کی سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ پیچھے مڑنا نہیں چاہتی تھی کہ شاید کوئی خواب ہو اور وہ پیچھے مڑے تو خواب ٹوٹ جائے۔

اچانک حاشر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا۔ وہ واضح طور پر اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہ رہی تھی مگر حاشر کی آنکھوں میں اس لمحے آرزو کے لیے محبت نہیں بلکہ نفرت ہی

نفرت تھی۔ آرزو حاشر کے کندھے پر سر رکھ کر اپنے سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی مگر حاشر نے بہت بے رحمی سے اسے سامنے پڑے بیڈ کی طرف اچھال دیا۔ وہ بہت زور سے بیڈ پر گری تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں کیوں کہ محبت کا خواب ٹوٹ چکا تھا سامنے بہت بھیاں تک حقیقت اس کی منتظر تھی۔ حاشر نے اپنا سارا غصہ اس کے اوپر اٹھیل دیا تھا۔ وہ نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کچھ بولتا چلا گیا۔ الزامات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اس کے نام سے منسوب کیے جا رہا تھا۔ اس کی ذات کے نیچے ادھیڑے جا رہے تھے۔ آرزو نے آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں کی زبان میں اپنا دفاع کرنا چاہا مگر سامنے کھڑا شخص اس کی کسی بھی بات سے قائل نہیں ہو رہا تھا۔ الزامات کی طویل چارج شیٹ اس کے سامنے پیش کر کے کچھ ہی دیر میں کمرے سے باہر جا چکا تھا اور آرزو اب اس کمرے کی خالی دیواروں کے ساتھ اپنی ذات کی تذلیل پر ماتم کر رہی تھی۔ باہر بارش تیز ہو چکی تھی اور زندگی میں پہلی بار اسے بارش سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆

اطہر کی ملیعت اب دن بدن بہتری کی طرف مائل تھی، اسے پوری امید تھی کہ چند دنوں تک وہ باقاعدہ طور پر اسپتال جانا شروع کر دے گا۔ طبیعت کچھ بہتری آئی تو وہ اپنے کمرے سے باہر آیا اور گھر کے لان میں چہل قدمی کی۔ اب وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیماری کے دنوں میں اسے یاد تھا کہ ایک لڑکی اس کے کمرے میں ایک ہی بار اس کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی مگر اس کے غلوں کی خوشبو سے بہت دن تک اس کا کمرہ بھینکا رہا تھا۔ اچھے لوگ بھی خوشبو کی طرح ہوتے ہیں جہاں

”نہیں..... اطہر بھائی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ میں تو حیران ہو رہی تھی کہ آپ میرا شکریہ ادا کرنے کیوں آئے ہیں۔ آپ میرے بڑے بھائی جیسے ہیں اور میرے لیے انتہائی قابل احترام ہیں اگر آپ کی طبیعت میں نے پوچھ لی ہے تو یہ میرا فرض تھا اور میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔“

آزہ نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے بے اختیار ان کے چہرے کی طرف دیکھا، تو اسے اطہر بھائی ایک دم بہت معصوم اور نہایت خلص انسان لگے تھے۔ وہ نیلو بھابھی سے بہت مختلف شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی اور حاشر کی آنکھوں کا رنگ ایک جیسا تھا مگر ان کی آنکھوں میں آئزہ کو اپنے لیے خلوص نظر آیا تھا جب کہ حاشر کی آنکھیں نفرت سے بھری ہوئی تھیں اور اب تو نفرت صرف اس کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کے پورے وجود سے چھلکتی تھی۔ اطہر کا ضروری فون آگیا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا مگر آئزہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ ان سے بات کرنے کی کہ وہ اس کے کمرے میں مت آیا کریں کیوں کہ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے مگر اسے اپنے گھر کو گرنے سے بچانا تھا۔ وہ اب کچھ دن اپنے ماں باپ کے گھر جانا چاہتی تھی تاکہ وہ کچھ پل سکون سے گزار سکے۔

کہا جاتا ہے کہ مرد کے دل کی سرزمین پر اگر ایک بار شک کا بیج اپنی جگہ بنا لے تو پھر اسے تناور درخت بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ حاشر کے دل میں بھی اب شک کی ننھی ننھی کوئیونوں نے اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع کر دیں تھیں اس شک کو یقین میں بدلنے میں نیلو بھابھی نہایت اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ اطہر بھائی سے اسے کوئی خاص جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ بڑے بھائی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے لیے قابل احترام ضرور تھے مگر اب آہستہ آہستہ وہ احترام بھی ختم ہوتا جا رہا تھا، پہلے ہی

جاتے ہیں اپنے خلوص کے باعث اس جگہ کو معطر کر دیتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی لوگ ان کے اچھے کاموں کی وجہ سے انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ پر خلوص جذبات کا اظہار آئزہ نے اطہر کے ساتھ کیا تھا۔ اسی لیے اطہر آئزہ کا شکریہ ادا کرنے اس کے کمرے میں چلا گیا۔

آئزہ اس وقت اپنے کمرے کی ترتیب درست کر رہی تھی، جب اس نے اطہر کو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اطہر کو دیکھ کر آئزہ کو حاشر کے وہ سارے الزامات یاد آگئے جنہوں نے لٹھوں میں اس کو داغ دار کر دیا تھا مگر اس لمحے اس نے خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے اطہر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دل ہی دل میں جلد از جلد اس کے جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔

”آئزہ! میں دراصل تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ تم نے میری خیریت دریافت کی تو میں دل سے تمہارے خلوص کا قائل ہو گیا۔“ اطہر نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

آئزہ نے نہایت غائب دماغی کے عالم میں اطہر کی وہ ساری گفتگو سنی۔ اس کی نظریں مسلسل دروازے کی جانب تھیں اسے لگ رہا تھا کہ دو آنکھیں مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔

”آئزہ! میں دراصل تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ تم نے میری خیریت دریافت کی تو میں دل سے تمہارے خلوص کا قائل ہو گیا۔“ اطہر نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

آئزہ نے نہایت غائب دماغی کے عالم میں اطہر کی وہ ساری گفتگو سنی اس کی نظریں مسلسل دروازے کی جانب تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ دو آنکھیں مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔

”آئزہ! کیا تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“ اطہر نے اس کی نظروں کو کھینچتے ہوئے کہا۔



ہیں۔ یہ ریت کے وہ گھروندے ہوتے ہیں جو ذرا سی آندھی چلنے سے مٹی مٹی ہو جاتے ہیں اس لیے ان کچے گھروں کا خیال رکھنا تو اور بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ انہوں نے آئزہ کی بڑی بہن سے مشورہ کیا تو انہیں یہی سچ لگا کہ فی الحال آئزہ کو سمجھایا جائے کہ وہ خود کو اس ماحول میں سیٹ کرنے کی کوشش کرے اور حاشر کو سمجھائے کہ وہ اپنا رویہ بہتر کرے اگر اس کی ساری کوششوں کے بعد بھی اس کے سرال میں سے کسی فرد کا رویہ بہتر نہ ہوا تو وہ سجاد صاحب اور اپنے بیٹوں کو ساری حقیقت بتا دیں گی اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ داری محمود شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے باقی افراد پر ہوگی۔

آئزہ اپنی ماں کی باتیں سن کر بہت حد تک اس بات کے لیے قائل ہو گئی تھی کہ اسے اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے اور حاشر کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مسز سجاد نے آئزہ کو بہت حوصلہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر آئزہ اور حاشر کے بچے ہو جائیں گے تو ان دونوں کے درمیان کینوں کا دورانیہ بھی بہت کم ہو جائے گا اور حاشر کا رویہ بھی آئزہ کے ساتھ بہت بہتر ہو جائے گا۔ انہوں نے جب آئزہ سے ایسی بات کی تو آئزہ خاموش ہو گئی۔ کیوں کہ وہ اس سلسلے میں حاشر کا جواب جانتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی حاشر نے آئزہ پر نہایت سخت الفاظ میں واضح کر دیا تھا کہ وہ ابھی بچے نہیں چاہتا اور اس معاملے میں وہ آئزہ کی کوئی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ حاشر کے اس قدر واضح جواب کے بعد آئزہ کے اندر پھر ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ اس موضوع پر بات کرے۔ ماں کے ساتھ چند دن گزارنے کے بعد وہ بہت پرسکون ہو گئی تھی۔ ماں کے چند ڈھارس بھرے

وہ نیلو بھابھی کے آنسوؤں کا سبب صرف اور صرف ان کی ذات کو سمجھتا تھا اور اب تو آئزہ کے اور ان کے حوالے سے جو باتیں وہ سن رہا تھا اس کے بعد تو وہ ویسے ہی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تھے اور اب اسے کچھ کرنا تھا اسے خود کو اور نیلو بھابھی کو اس اذیت سے نکالنا تھا۔ نیلو بھابھی تو اس اذیت کو جانے کتنے برس سے جھیل رہی تھیں مگر وہ تو کچھ ماہ سے اس اذیت کا شکار ہوا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اسے اب سکون چاہیے تھا۔ آئزہ نے جب اس سے اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی بات کی تو اس نے بخوشی اجازت دے دی وہ ویسے بھی آئزہ کو اب زیادہ دیر اپنے گھر رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ آئزہ کی قربت اسے سکون نہیں بے سکونی عطا کرتی تھی۔ اسے سکون کے کچھ پل جینے تھے اس لیے بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد اس گھر سے چلی جائے۔

☆.....☆

”امی! اس گھر میں مجھے خود سے پانی تک پینے کی اجازت نہیں۔ نیلو بھابھی نے پورے گھر پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنے پاس رہنے دیں۔ امی مجھے ان لوگوں کے پاس دوبارہ نہیں جانا۔“

آئزہ یہ سب کہتے ہوئے اپنی ماں کے سینے پر سر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر مسز سجاد کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے مگر وہ بے بس تھیں، انہیں زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ بیٹی والے بھی کتنے بے بس ہوتے ہیں وہ چاہتیں تو اپنے شوہر اور بیٹوں کو ساری حقیقت بتا کر اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اس اذیت سے نجات دلا دیتیں مگر وہ آئزہ کا گھر سنوارنا چاہتی تھیں کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ بیٹیوں کے گھر بننے بہت مشکلوں سے اور بگڑتے بہت آسانی سے

ذات کا دکھ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ہی خود سے لڑتے لڑتے اس کی شادی کو پانچ برس بیت گئے تھے۔

☆.....☆

ان پانچ برسوں کی تلخ زندگی نے آئزہ کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اس کی ساری خوب صورتی اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ اب تو وہ اپنے انتہائی کمزور اور لاغر وجود کے ساتھ اپنی زندگی کی گاڑی کو گھسیٹ رہی تھی۔ وہ زندگی کے اس انتہائی کڑے ذائقے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ اب جب بھی زندگی اس پر مہربان ہوئی تو وہ اس زندگی کو قبول نہیں کر سکے گی۔ اس کی آنکھوں کے گرد پھلے ہوئے گہرے اور سیاہ حلقے بھی اس بات کی چٹلی کھاتے تھے کہ وہ نہ جانے کتنے برسوں سے ٹھیک سے سو نہیں پاتی تھی۔ اس کے سر کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے انتقال کے بعد نیلو بھابھی کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ حالانکہ ان کی زندگی میں بھی آئزہ کو ستانے کا کام وہ بخوبی کرتی تھیں مگر ان کے جانے کے بعد تو گویا انہیں لمحہ لمحہ آئزہ کو اذیت پہنچانے کا سرکاری اجازت نامہ مل گیا تھا۔ ان کی بیٹیاں اب بڑی ہو رہی تھیں۔ اسی حساب سے ان کی بدتمیزیاں بھی بڑھنے لگی تھیں۔

ان پانچ برسوں میں آئزہ اتنا تو جان گئی تھی کہ نیلو بھابھی اور اطہر بھائی دونوں ایک ہی تھالی کے چنے چنے ہیں۔ دونوں کا مقصد حاشر کو اپنی مٹھی میں رکھنا ہے اور ابھی تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب جا رہے تھے۔ اطہر اب اپنا ذاتی کلینک کھول چکا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت کے علاوہ اس کا بینک بینس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ جب کہ ان کے مقابلے میں حاشر کا بزنس مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ محمود شاہ صاحب کے انتقال کے بعد تو حاشر اپنے گرتے ہوئے بزنس کو سنبھال ہی نہیں پایا

جملوں نے اس کے اندر ایک نئی توانائی بھر دی تھی اور اب وہ نئے سرے سے اپنی زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

☆.....☆

اپنے جیسے کی جنگ لڑنے آئزہ اپنے سسرال واپس آ گئی تھی مگر حالات اس بار پہلے سے زیادہ تکلیف دہ، اذیت ناک اور مشکل تھے۔ اس کے سسر بھی اب اس سے بچے بچے رہنے لگے تھے اور دے لفظوں میں کئی بار اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ انہیں آئزہ کا اپنے ماں باپ کے گھر جا کر رہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اب وہ بھی آئزہ کے ساتھ بہت تلخ رہنے لگے تھے۔ حاشر کا رویہ ہنوز ویسا ہی تھا اسے آئزہ کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آئزہ نے بہت بار کوشش کی کہ وہ اپنے اچھے رویے سے حاشر کے دل میں اپنے لیے کوئی نرم گوشہ تلاش کرے مگر ہر بار اسے بہت بری طرح دھکارا گیا تھا۔ بلکہ اب حاشر کئی کئی دن گھر سے باہر پڑتا تھا۔ وہ آئزہ کے ساتھ بہت کم وقت گزارتا تھا۔ نیلو بھابھی کا رویہ اس کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ تلخ ہو گیا تھا۔ اب وہ آئزہ کے خلاف کل کر میدان میں آ گئی تھیں۔ آئے روز وہ اس پر کسی نہ کسی چیز کی چوری کا الزام لگا دیتیں اور گھر کے نوکروں کے سامنے اسے ذلیل کرتیں۔ آئزہ کا وہ یقین محض چند ماہ میں ہی ڈگمگا گیا تھا کہ وہ اپنے اچھے رویے سے سب کو رام کر لے گی۔ بعض اوقات اچھا بھائی ہمارے لیے تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ خود کو اذیت سے نکالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دوسروں سے ان کی زبان میں بات کی جائے۔ سسرال میں آئزہ کا اچھا رویہ ہی اس کے لیے وبال جان بن گیا تھا۔ اس کی ماں نے دل جیتنے کے جتنے طریقے اسے بتائے تھے وہ سب اس نے اپنے سسرال والوں پر آزمائے کر دیکھ لیے تھے مگر



”جیسا کہ میں نے تمہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ نوجوان میری بیوی کا بھانجا ہے۔ اس نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے مگر اس کے باوجود یہ ابھی تک بے روزگار ہے۔ اچھی نوکری کی تلاش میں جب یہ شہر آیا تو ہم دونوں میاں بیوی کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ میری بیوی نے اپنی بہن کو یقین دلایا کہ جب تک اس کی اچھی نوکری کا انتظام نہیں ہو جاتا۔ یہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔ ویسے بھی ہماری کوئی اولاد تو ہے نہیں۔ اس لیے ہم دونوں نے اس کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھنا شروع کر دیا۔ یہ صبح نوکری پر جاتا اور شام کو کمپیوٹر کے ساتھ مل کر نہ جانے کون سے جہانوں کی تسخیر کرتا رہتا۔ ایک روز آدمی رات کے قریب مجھے پیاس لگی۔ میں پانی پینے کے لیے اٹھا تو دیکھا کہ یہ ابھی تک کمپیوٹر کے ساتھ دل بہلا رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا کر اسے منع کرنا چاہتا تھا کہ اب سو جائے رات بہت ہو گئی ہے مگر جیسے ہی میں اس کے قریب گیا تو میں نے اس کے کمپیوٹر اسکرین پر ایک ایسی تصویر دیکھی کہ میرا دل چاہا کہ یہ منظر دیکھنے سے پہلے کاش یہ زمین چھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ یہ آئزہ کی تصویر تھی اور ساتھ میں نہایت بے ہودہ انداز میں اس کے ساتھ کوئی لڑکا کھڑا تھا۔ یہ لڑکا کون تھا میں نہیں جانتا تھا۔ میرا بھانجا نہایت مہارت سے ان تمام تصویروں کو جوڑنے میں مصروف تھا۔ میں کچھ دیر تو اس کی بے غیرتی کے مناظر دیکھتا رہا مگر پھر ایک دم میری غیرت کو جوش آیا اور میں نے اپنی بیوی کے اس بھانجے کو گردن سے پکڑا اور نیچے گرا دیا۔ میں بہت بری طرح اسے مار رہا تھا اور وہ زور زور سے چیخیں مار رہا تھا۔ میری بیوی کی آنکھ بھی اس شور سے کھل گئی۔ ساری صورت حال جان لینے کے بعد میری بیوی نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ نی

سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس کی سیکرٹری نے انٹرکام پر اس کے بڑے بھائی اکبر محمود کے آنے کی اطلاع دی۔ حاشر ابھی کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا مگر اپنے بڑے بھائی کو انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ ان کی اس قدر اچانک آمد پر حیران بھی بہت ہوا تھا۔ اس نے اپنی سیکرٹری کو اطلاع دے دی کہ آنے والے ملاقاتیوں کو اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے بڑے بھائی اکبر محمود اور ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حاشر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اکبر محمود نے حاشر کا تعارف اپنے ساتھ آنے والے نوجوان سے کروایا اور پھر اس نوجوان کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے ساتھ جو لیپ ٹاپ لایا ہے وہ اب حاشر کے سامنے کھولے۔ نوجوان نے لیپ ٹاپ کھولا اور اس میں سے کچھ فولڈرز اوپن کیے اور پھر وہ کھول کر حاشر کے سامنے رکھ دیے۔ حاشر حیران کن نظروں سے اپنے سامنے ہونے والی یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے اس نوجوان کے لیپ ٹاپ میں موجود تصویروں کو دیکھنا شروع کیا، اس کا خون کھولنا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ نوجوان اسے کچھ مزید تصویریں دکھاتا حاشر ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور اس نوجوان کو گریبان سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ حاشر نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے مار مار کر ادھموا کر دے مگر اکبر محمود نے حاشر کو قابو کر کے اس نوجوان کو اس کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ حاشر اپنی نشست پر بیٹھ چکا تھا مگر اس کا سانس بہت بری طرح پھول رہا تھا۔ اکبر محمود نے پانی کا ایک گلاس اسے دیا۔ پانی پی کر اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو وہ اس قابل ہوا کہ اکبر محمود کی بات سن سکے۔ اب اکبر محمود بول رہے تھے اور وہ سن رہا تھا۔



الحال اس سے ان لوگوں کے بارے میں تفتیش کی جائے جنہوں نے اسے اس کام پر لگایا ہے۔ اپنی بیوی کی بات میرے دل کو لگی اور میں نے جب اس سے اس بارے میں بات کی تو مجھے اس نے بتایا کہ وہ دوپہر کے وقت اپنے ایک دوست کے استوڈیو میں اس کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تھا۔ وہیں پر ایک خاتون ان سے ملنے کے لیے آئیں، جن کا نام ٹیلم تھا۔ ان کے پاس کچھ تصویریں تھیں جو ان کے بقول ان کی ایک دوست اور اس کے ایک کزن کی تھیں۔ وہ خاتون ان تصویروں کو نہایت بے ہودہ انداز میں ایک ساتھ جڑوا چاہتی تھیں اور پھر ان کی بہت سی کاپیاں بنوا کر ایک مخصوص پتے پر بھجوانا بھی چاہتی تھیں۔ ان سب کاموں کے لیے وہ خاتون میرے دوست کو ایک نہایت معقول رقم دینے کے لیے تیار تھیں۔ میرا دوست ان خاتون کی ڈیمانڈ سمجھ گیا تھا۔ ان خاتون کے جانے کے بعد میرے دوست نے میرے ذمے یہ کام لگایا۔ بے روزگاری کے ہاتھوں میں بہت پریشان تھا اس لیے یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا اور پھر آگے کی کہانی آپ جانتے ہیں۔“

”یہ تمام باتیں سننے کے بعد میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے تمہارے پاس لے آؤں اور اب تمہاری مرضی ہے کہ اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرو۔“ اکبر محمود نے یہ سب کہنے کے بعد حاشر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں اضطراب کی کیفیت نمایاں تھی۔ حاشر نے بہتر یہی سمجھا کہ اس نوجوان کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ پولیس کو فون کرنے ہی لگا تھا کہ وہ نوجوان اس کے پیروں میں گر گیا۔ وہ رورو کر حاشر سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ حاشر نے اس کے شرمندہ وجود کو دیکھا اور اسے معاف کر دیا۔ اکبر محمود نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب وہ نوجوان اس قسم کی کوئی حرکت نہیں

کرے گا۔ اس نے اپنے فولڈر میں موجود تمام تصویروں کو ڈیلیٹ کر دیا۔ حاشر نے اپنے بڑے بھائی کی یقین دہانی کے بعد اسے جانے تو دیا تھا مگر ان دونوں کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ٹیلم بھابی نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ حاشر کے بیچر رضوان نے تمام آفس ورکرز کے ساتھ میٹنگ کی ان سے بہت سے راز انگو لیے تھے۔ آفس کے ورکرز نے حاشر کے سامنے ایسے انکشافات کیے جنہیں سن کر اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ اب اسے گھر جانا تھا اور وہ ثبوت تلاش کرنا تھا جس کی بنیاد پر وہ نیلو بھابی اور اطہر بھائی کی بدعتی سب کے سامنے بے نقاب کر دیتا۔

☆.....☆

حاشر دندنا تا ہوا گھر میں داخل ہوا اور سب سے پہلے نیلو بھابی کے کمرے میں ان کی اجازت کے بغیر کھس گیا اور ان کی الماری کھول کر چیزیں ادھر سے ادھر پھینکنے لگا۔ آئرنہ بھی اس کمرے کے داخلی دروازے پر کھڑی حیران کن نظروں سے حاشر کی اس حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ اسے بہت حیرت ہو رہی تھی کہ حاشر ایسا کیا تلاش کر رہا ہے جو اسے نہیں مل رہا۔ وہ اس کا ہاتھ روکنا چاہتی تھی اور اسے کہتا چاہ رہی تھی کہ کسی کے کمرے کی یوں تلاشی لینا بہت بری حرکت ہے مگر حاشر کے غصے کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ اطہر اپنے کلینک میں تھا جب کہ ٹیلم نے حاشر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر حاشر اس وقت کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ حمزہ سی جد جہد کے بعد بالآخر حاشر کو اس کی مطلوبہ چند فائلز مل ہی گئیں۔ وہ ان فائلز کو لے کر تیزی سے اس کمرے سے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں کھس گیا۔ اس نے ان فائلز کو کھولا اور اس میں سے مختلف کاغذات کو دیکھنے لگا۔ ان کاغذات میں چھپی بہت سی حقیقتیں اس پر آشکار ہو گئی تھیں۔ وہ فائل ایک طرف رکھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا

اور اپنا سر پکڑ لیا۔ آئزہ نے کھڑی سے دیکھا۔ وہ رو رہا تھا یا شاید بہت زیادہ رورہا تھا۔ آئزہ نے حاشر کی شخصیت کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ اچانک حاشر اٹھا اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اسے نیلو بھابی سے ملنا تھا اور وہ جانتا تھا کہ نیلو بھابی اس وقت اسے کہاں ملیں گی۔ وہ بہت تیزی سے لان کی جانب جا رہا تھا مگر نیلو بھابی اسے ڈرائنگ روم کے پاس ہی کھڑی مل گئیں۔ وہ ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان فائلز میں جو کاغذات ہیں کیا وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

”کیا اس کے بزنس میں سے لاکھوں کی خورد برد انہوں نے نہیں کروائی؟“

”یہ گھر جلسازی سے اپنے نام بھی نیلو بھابی نے نہیں کروایا؟“ ایسے ہی نکتے سوالات اس کی آنکھوں میں تھے۔ وہ ہم آنکھوں سے اپنی بھابی کی جھگی گردن کی جانب دیکھتا رہا۔

”نیلو بھابی!“ حاشر نے ہمیشہ کی طرح نیلم کو پکارا مگر اس بار اس کی پکار میں اپنائیت نہیں اجنبیت تھی۔ نیلم کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ حاشر کو اس بار پھر کوئی جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کرنا چاہتیں تھیں مگر الفاظ ان کے حلق سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ یوم حساب آچکا تھا اور فائل کی شکل میں اعمال نامہ بھی ان کے ہاتھ میں پکڑایا جا چکا تھا جس میں ان کے اور اطہر کے کالے کروٹوں کے سبب ثبوت تھے، کچھ کہنے سننے کے لیے شاید کچھ جا بھی نہیں تھا مگر انہیں اپنے بچاؤ کی کوشش بھی تو کرنی تھیں۔ انہوں نے ہمت کر کے حاشر سے کہہ ہی دیا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ انہوں نے سراٹھا کر دیکھا تو انہیں لگا کہ سامنے کھڑے ان کے دپور کی سرخ آنکھیں انہیں جلا کر بھسم کر دیں گی۔ انہیں اپنے دل کی

حالت دیکھتے ہیں۔ بہت سارے تھیں۔ بازی پلٹنا جانتی تھیں اس بار بھی انہوں نے بازی پلٹنی تھی مگر ان کا ہر وارنا کام جا رہا تھا۔ حاشر ان کی کوئی بات بھی سننے کا روادار نہیں تھا۔

”نیلو بھابی!“ اس نے ایک بار پھر انہیں پکارا۔

”آپ کو پتا ہے آج میری ماں مر گئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ نیلم اس کے پیچھے بھاگتی جا رہی تھی۔ اسے آوازیں دے رہی تھی مگر حاشر اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ حاشر نے اپنے کمرے کے باہر کھڑی آئزہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اس لمحے وہ آئزہ کے علاوہ کسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی حاشر نے آئزہ کو پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔ وہ اس کے ہاتھ تمام کراہیک جذب کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر رکھ کر رونے لگا۔ آئزہ کی ٹمٹھ کے دامن میں اس کے آنسو گر رہے تھے۔ وہ اس کے آنسو صاف کرنا چاہ رہی تھی مگر حاشر اسے یہ موقع دے ہی کب رہا تھا۔ وہ تو ایک لمحے کو بھی آئزہ کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آئزہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں محبت اور چاہت کے رنگ سب سے نمایاں تھے۔ اس نے اپنا سر حاشر کے کندھے سے لگا لیا۔ وہ بھی رونا چاہتی تھی اپنے سارے دکھ ساری تکلیفوں کی داستان اسے سنانا چاہتی تھی مگر صرف ایک لفظ محبت نے حاشر کے سب روپوں کی تلاطمی کردی تھی۔ وہ حاشر کے بازوؤں کے گھیرے میں تھی اور آئزہ اور حاشر کا یہ کمرہ بھی ان دونوں کے ملاپ پر پہلی بار دل کھول کر مسکرایا تھا۔ وہ دونوں بہت مطمئن اور خوش ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکل

جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کل یہ بچیاں انہیں اس بات کا طعنہ دیں کہ انہیں نے اپنے ماں باپ سے دور کر دیا ہے۔ اظہر کو عدالت نے پانچ سال قید کی سزا سنائی تھی اور حاشر کو امید تھی کہ اب جب پانچ سال بعد وہ رہا ہوں گے تو ایک بدلے ہوئے انسان ہوں گے۔ حاشر کے بڑے بھائی اکبر محمود اب اکثر ان کے گھر آنے لگے تھے اور ان کے آنے سے گھر میں خوب رونق ہو جاتی تھی۔ آئزہ کی زندگی کی ساری خوشیاں لوٹ آئیں تھیں مگر وہ بھی بھیجی اس ساحرہ سے ملنے ضرور جاتی تھی۔ جس نے اس کی زندگی کو بے رنگ کر دیا تھا۔ اس ساحرہ کی یہ حالت دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوتا تھا مگر اس ساحرہ کی کہانی کا یہی انجام ہونا تھا۔

☆.....☆

میرا نام نلیم احسان ہے۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ میرا باپ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ میرا بچپن ویسا ہی گزرا جیسے غریبوں کے بچوں کا گزرتا ہے مگر میری ایک عادت تھی میں بچپن سے ہی خواب بہت دیکھتی تھی، جیسے جیسے میں اپنے تعلیمی مدارج طے کرتی گئی۔ میرے خواب بھی میرے ساتھ جوان ہوتے چلے گئے۔ ان خوابوں میں میرا کردار ایک شہزادی کا ہوتا تھا جو اپنی سلطنت میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھی۔ ان خوابوں کے زیر اثر میرا مزاج بھی بہت شانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی کالج کی تعلیم کا ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ ایک روز ایک معمولی روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں میرا باپ اسپتال جانے سے پہلے ہی دم توڑ گیا اور میں اور میری ماں اس ظالم دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ باپ کی اس قدر راجا یک موت کا صدمہ بہت شدید تھا۔ ابھی میرے باپ کو مرے ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے کہ صبح کے وقت ہمارے گھر میں ایک بہت لمبی سی گاڑی میں ایک بہت امیر آدمی

آئے تھے۔ نلیم کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سامنے والا منظر دیکھ رہی تھی۔ جہاں حاشر اور آئزہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی اور ہی جہان کے مسافر لگ رہے تھے۔ ابھی وہ اس منظر کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا جب حاشر اور آئزہ ایک دوسرے کے تنگ ہتے سسکراتے اسی کی جانب آ رہے تھے۔ نلیم کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے کی طرف گئی مگر وہ دونوں وہاں پہلے سے موجود تھے، اسے گھر کے ہر کونے میں ان دونوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ خود کو سنبالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سنبال نہیں پاتی تھی۔ وہ زمین پر گرنا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اس نے تو ہمیشہ دوسروں کو گرتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس بار وہ خود کو گرنے سے نہیں بچا سکی اور محض چند لمحوں میں وہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانگی کے سفر پر گامزن ہو چکی تھی۔ پھر وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس وین حاشر کے گھر پر آ چکی تھی۔ اس وین میں اظہر بھٹکڑیاں پہنے پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پولیس اسپتال سے دھوکا اور فراڈ کے کیس میں گرفتار کر چکی تھی۔ اس گھر میں پولیس نلیم کو گرفتار کرنے آئی تھی مگر نلیم کی حالت کے پیش نظر اسے پہلے اسپتال لے جایا گیا، جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے ہوش تو آ چکا تھا مگر وہ اپنا ذوقی توازن ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔ اس لیے اسے ذوقی امراض کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

نلیم کی دونوں بیٹیاں اب حاشر اور آئزہ کی ذمہ داری تھیں۔ وہ دونوں ان بچیوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور وہ بچیاں بھی اب ان دونوں کی بہت عزت کرنے لگی تھیں حاشر ہفتے میں ایک دفعہ ان بچیوں کو ان کے ماں باپ سے ضرور ملوا۔ نہ لے کر

داخل ہوا۔ میری ماں جیسے میرے باپ کی موت کے بعد چپ سی لگ گئی تھی۔ اس شخص کو دیکھتے ہی جیسے میری ماں کے اندر جان اگنی بھی اور وہ اس شخص کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص میرا ماموں ہے اور میری ماں نے میرے باپ کے ساتھ بھاگ کر شادی کی تھی۔ وہی امیر لڑکی اور غریب لڑکے کی محبت کا قصہ جو اب شاذ و نادر ہی سننے کو ملتا ہے۔ میرے باپ کی زندگی میں میری ماں کا کوئی رشتہ دار ہم سے ملنے کے لیے کبھی بھی نہیں آیا مگر اب باپ کے مرنے کے بعد اتنے امیر رشتے داروں کا سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اگلے چند دن ہمارے گھر ماموں نہ صرف خود آتے رہے بلکہ ان کے ساتھ ان کے بیٹے بھی چکر لگاتے رہے۔ ہاں البتہ ممانی نہیں آئیں شاید وہ ہم سے ملنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ماموں مجھے اور میری ماں کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے مگر میری ماں اس کے لیے راضی نہیں تھی۔ اسی طرح چند مہینے گزر گئے۔ ایک روز میری ماں کے سر میں شدید درد اٹھا اتنا شدید کہ وہ بے ہوش ہو گئی میں نے ماموں کو فون کر دیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں میری ماں شہر کے بہترین اسپتال میں موجود مگر یہ بہترین اسپتال، بہترین ڈاکٹر ز بھی میری ماں کو نہیں بچا سکے اور دماغ کی شرابان پھٹنے کے نتیجے میں میری ماں بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور باپ کے بعد ماں کا سایہ بھی میرے سر سے اٹھ گیا۔ ان دنوں میں ہر وقت رونی رہتی تھی۔ ماموں مجھے میری ماں کی تدفین کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے اور اس وقت مجھے بھی یہی صحیح لگا تھا کہ میں ماموں کے ساتھ چلی جاؤں۔ میری ماما کا رویہ میرے ساتھ بس لیے دیئے والا ہی تھا۔ ان دنوں آدمی آدمی رات تک ماموں اور ماما کی بحث ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن اچانک مجھے پتا چلا کہ چند دن

بعد میرا نکاح ماموں کے درمیان والے بیٹے اطہر سے ہونا طے پایا ہے جو کہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے۔ مجھے اپنی قسمت پر تو یقین تھا مگر اتنی جلدی میری قسمت مجھ پر مہربان ہو جائے گی یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ پھر قسمت مجھ پر مہربان ہو ہی گئی۔ میرا نکاح ڈاکٹر اطہر کے ساتھ ہو گیا۔ چند دن بعد ایک مختصر سی ویسے کی تقریب میں باقاعدہ طور پر خاندان والوں کے سامنے بھی ہمارے رشتے کی رونمائی ہو گئی۔ زندگی بہت خوب صورت ہو گئی تھی مگر ابھی میرے خواب کہاں پورے ہوئے تھے، ابھی تو مجھے اس راجدھانی میں اکیلے راج کرنا تھا۔ میرے جیٹھ اور جھانی مجھے کسی بوجھ کی طرح لگتے تھے اور میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے جیٹھ جھانی اور ساس کو سب سے پہلے اس گھر سے نکالوں۔ اطہر بہت اچھے تھے اور وہ ہر بات میں میری ہاں میں ہاں ہی ملایا کرتے تھے۔ میرا ایک دیور بھی تھا مگر وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ صرف شادی پر چند دن کے لیے آیا تھا۔ اپنی شادی کے کچھ عرصے تک تو میرے اپنی ساس اور جھانی کے ساتھ تعلقات ٹھیک رہے مگر پھر ہمارے جھکڑے ہونے لگے۔ معمولی معمولی باتوں پر اکثر ہماری تلخ کلائی ہو جاتی تھی۔ میری ساس دل کی مرلیضہ تھیں اور ایک روز اسی طرح میرے ساتھ ان کا بہت شدید جھکڑا ہوا۔ ان کے سینے میں درد اٹھا۔ انہیں اسپتال لے کر گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ مجھے اپنی ساس کے مرنے کا بہت افسوس تھا مگر میں یہ سمجھتی تھی کہ اگر وہ میرے ساتھ تعاون کرتیں تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ ساس کے مرنے کے چند دن بعد ہی میرے جیٹھ اور جھانی نے بھی اپنا سامان باندھا اور اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ حالانکہ میں نے تو انہیں نہیں کہا تھا کہ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ ساس کے مرنے کے بعد میرا



تھا۔ میرے سر نے حاشر کی شادی کے لیے اپنے دوست کی بیٹی آثرہ کا انتخاب کیا تھا۔ میری آثرہ سے ایک ملاقات ہو چکی تھی اور وہ مجھے بہت ڈری سہمی اور گھبرائی ہوئی لڑکی لگی تھی۔ مجھے حاشر کے لیے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔ حاشر نے ویسے بھی سارے اختیارات مجھے سونپ رکھے تھے۔ میرا تو خیال تھا کہ حاشر کی شادی نہ کی جائے مگر اپنے سر کے آگے اس قسم کی بات کر کے میں خود کو ان کی نظروں سے گرا نہیں چاہتی تھی اسی لیے حاشر کے لیے اس رشتے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ کچھ ہی ہفتوں بعد آثرہ سجاد اس گھر میں دلہن بن کر آ گئی۔ حاشر کا آثرہ کے ساتھ رویہ شروع دن سے ہی بہت اجنبی تھا اور یہی بات میرے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ وہ وقت جو اسے اپنی بیوی کو دینا چاہیے تھا۔ وہ وقت حاشر میرے ساتھ گزارتا تھا اور میں کسی نہ کسی انداز میں اس پر یہ باور ضرور کروا دیتی تھی کہ آثرہ انتہائی لاپرواہ ہے اور گھر کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی۔ کوئی بیوی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ وقت گزارنے کی بجائے کسی اور کے ساتھ وقت گزارے میرا خیال تھا آثرہ چند دن بعد ہی یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی مگر وہ تو بہت ہی سخت جان واقع ہوئی تھی۔ انہی دنوں اطہر بیمار ہو گئے اور میرے شاطر ذہن نے ایک ایسی ترکیب سوچی جس کے بعد مجھے پورا یقین تھا کہ آثرہ یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اطہر کی خیریت پوچھنے کے لیے آثرہ ان کے کمرے میں گئی اور وہیں سے میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ گھر کے نوکروں کے سامنے میں نے یہی ظاہر کیا کہ آثرہ میرے شوہر کی خیریت پوچھنے نہیں بلکہ اس سے ملنے لگی ہے۔ اگلے روز حاشر کے سامنے یہ بات کر کے میں نے مزید آگ لگا دی اور پھر وہی ہوا جیسے میں چاہتی

دور بھی بیرون ملک سے ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گیا تھا۔ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور اب میرے سر کا ارادہ اسے پاکستان میں ہی کاروبار کروانے کا تھا اور اس سلسلے میں وہ ایک آفس بھی لے چکے تھے۔ میرا دور حاشر اپنی ماں کے مرنے کے بعد بہت افسردہ رہتا تھا۔ میں نے اس کی دلجوئی کی اور اسے سہارا دیا۔ ان دنوں وہ بہت پیار رہنے لگا تھا۔ ایسے موقع پر میں نے اس کی بہت خدمت کی۔ میں یہ احسان کر کے اس کے دل میں یہ احساس اجاگر کرنا چاہتی تھی کہ میں اس کی بہت ہمدرد ہوں۔ اس پورے گھر میں اطہر کی ترقی کا خوب چرچا تھا اور اسی وجہ سے گھر کے ملازمین بھی مجھ سے دبتے تھے۔ میرے سر میری ساس کے مرنے کے بعد اب زیادہ گھر کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میری ہمدردی اور دلجوئی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاشر میرے قریب ہوتا چلا گیا اور میں تو یہی چاہتی تھی کہ وہ مجھ پر اندھا اعتبار کرے اور ہر معاملے میں میرا محتاج ہو جائے۔ میں اس سلسلے میں اطہر کو پہلے ہی اعتماد میں لے چکی تھی۔ انہی دنوں میرے ہاں اوپر تلے دو بیٹیوں کی ولادت ہوئی۔ میرے جیٹھ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور ماں بننے کے بعد اس گھر میں میری اہمیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اپنی بیٹیوں کو اپنی طرح پر اعتماد بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے ان پر بے جا قسم کی روک ٹوک پر میں نے پابندی لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے میری بیٹیاں بہت نڈر اور بے باک ہو گئی تھیں۔ پورے گھر پر عملاً میرا راج قائم ہو چکا تھا۔ حاشر میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ اطہر کی جرات نہیں تھی کہ وہ میرے آگے بات کر سکیں۔ اس لیے راوی جبین ہی چچن لکھ رہا تھا کہ اچانک میرے سر کو میرے دیور کی شادی کا شوق چڑھ گیا۔ حاشر کا کاروبار بہت اچھی طرح سیٹ ہو چکا

تھی۔ آئزہ یہ کھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں مطمئن تھی اور اب میرا نہیں خیال تھا کہ وہ واپس آئے گی۔ میں نے اپنے سر اور حاشر کے سامنے آئزہ کا ذکر بہت متنی انداز میں کیا جس سے ان کے دل مزید بدل ہو گئے تھے۔ آئزہ کے بارے میں میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک مٹنے بعد ہی واپس آگئی تھی اور واپس آ کر وہ اور زیادہ پر اعتماد لگ رہی تھی۔

آئزہ کو اسی طرح دو بارہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے اب اسے ہر طرح سے زچ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا وہ اعتماد تو چند دن میں ہی ختم ہو گیا تھا اور وہ پھر سے وہی ڈری اور سہی ہوئی آئزہ بن گئی تھی۔ اب کی بار میرے سر کی ہمدردیاں بھی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ کیوں کہ میں پہلے ہی ان کے کان آئزہ کے خلاف بہت بھرپور تھی۔ آئزہ اس محاذ پر اکیلے تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد میرے سر کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد اب میرے اور اطہر کے ایک اور منصوبے کا آغاز ہو گیا۔ ہم معاشی طور پر بھی حاشر کو بہت نیچے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کے دفتر کے کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر ہم نے اس کی لمبی کی ساکھ کو خراب کرنا شروع کر دیا۔ اکثر دوسرے ممالک میں وہ جو اشیاء بھیجتا تھا وہاں سے اصلی چیزیں غائب کروا کر دو نمبر مال رکھنا شروع کر دیا۔ لمبی کے اکاؤنٹ میں سے بہت سی رقم ہم نے غائب کروانا شروع کر دی۔ ایسے بہت سے کام ہم دونوں نے کیے جس سے حاشر کو کاروبار میں بے انتہا نقصان اٹھانا پڑا اور وہ اکثر میرے پاس بیٹھ کر اپنے کاروباری نقصان کا رونا روتا تھا۔ حاشر آئزہ سے بدلہ ضرور تھا مگر وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھی اور یہ چیز میری برداشت سے باہر تھی۔ اسی لیے میں نے اس کی اور اس کے ایک کزن کی تصویریں اس کے شادی کی البم میں

سے نکالیں اور ایک کمپیوٹر گرافکس کے ماہر سے ان تصویروں کو کچھ اس انداز سے جڑوایا جس سے مجھے یقین تھا کہ وہ دیکھتے ہی حاشر آئزہ کو طلاق دے دے گا۔ آئزہ نے اپنے اس کزن کے بارے میں ایک بار سرسری انداز میں بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کا ارادہ پہلے اس کی شادی اس کے اسی کزن سے کرنے کا تھا مگر پھر حاشر کا رشتہ آگیا اور وہ بات ختم ہو گئی مگر میرا ارادہ تھا کہ اس بات کو ختم نہ کیا جائے اور آئزہ کو اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہی ہو رہا تھا کہ اچانک حاشر کے منبر رضوان نے میرے ایک منصوبے کو خاک میں ملادیا اور سونے پہاگہ آفس کے درکرز نے بھی حاشر کے سامنے سارا جھگڑا دیا اور پھر حاشر کے بڑے بھائی اکبر محمود نے بھی تصویروں والا سارا منصوبہ اس کے گوش گزرا کر کے مجھ سے انتقام لے لیا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کمپیوٹر گرافکس کا ماہر اکبر محمود کا بھانجا نکل آئے گا۔ حاشر اپنے تمام تر ثبوتوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حاشر جو میرے سامنے اپنی زبان تک نہیں کھولتا تھا۔ اس روز اپنا تمام تر غصہ مجھ پر اٹھیل رہا تھا۔ وہ اپنی آئزہ کے سنگ مسکرا رہا تھا۔ اس کے دل میں آئزہ کے لیے جتنی بھی عداوت تھی وہ سب ختم ہو چکی تھی۔ میرے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اطہر کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ غصے اور صدمے کی وجہ سے میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اب میں بہت دنوں سے ذہنی امراض کے اس اسپتال میں ہوں۔ کبھی کبھی آئزہ میری بچپن کو مجھ سے ملانے کے لیے لے آتی ہے۔ میں ان کو دیکھ کر روئی رہتی ہوں مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ نفرت، غصے اور انتقام کے مارے لوگ اسی جگہ پر آتے ہیں جہاں میں موجود ہوں۔

.....☆.....

## ازہارِ محبت

مغرب کی سمت سے اٹھنے والی کالی گھٹاؤں نے آفتاب کا چمکتا دمکتا آگ برساتا چہرہ بادلوں کی  
دن کے اجالے کو اندھیروں میں بدل دیا تھا اور نقاب میں الہرد و شیرہ کی طرح روپوش ہو گیا تھا۔ قہینا



”دیکھو بیٹا!“ وہ شفقت سے گویا ہوئیں۔  
 ”تمہارا بھتیجا حنا اپنوں میں پہلی مرتبہ پاکستان  
 آ رہا ہے اس نے روڈ ایکسٹنٹ میں اپنے والدین  
 اور میں نے اپنا بھوپٹا کھودیا اگر وہ زندہ ہوتے تو میں  
 تم سے کچھ نہیں کہتی کہ مرحوم بھائی کی نشانی کا خاص  
 خیال رکھنا۔ اس کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ وہ بے  
 یار و مددگار ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔  
 ”اماں جان! آپ اطمینان رکھیے۔ آپ کو کچھ  
 بھی کہنے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا بتا دوں کہ وہ لاکھ

کہیں بارش ہوئی تھی کیونکہ ہواؤں میں کچی مٹی کی  
 سوندھی سوندھی خوشبو اور بارش کی مہک رچی ہوئی  
 تھی۔  
 بڑی بیگم نے آج سب کو اپنے کمرے میں بلایا  
 تھا۔  
 ”تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں اپنے  
 بھتیجے کی آمد اچھی نہیں لگی؟“  
 ”نہیں اماں جان ایسی کوئی بات نہیں۔“  
 آصف اور دواصف ایک ساتھ بولے۔





ہمارا اپنا سہی لیکن اپنی کی ماں کی وجہ سے وہ ہماری  
اولادوں کی برابری نہیں کر سکے گا۔“  
بڑی بیگم کی پیشانی پر سلوٹھیں پڑ گئیں۔

”آج تو یہ کہہ دیا ہے آئندہ مت کہتا ورنہ مجھ  
سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہارے باپ کی وجہ سے میں  
مجبور تھی لیکن آج میں صاف صاف کہتی ہوں کہ مجھے  
تمہارے باپ کے خود ساختہ اصولوں سے اختلاف  
تھا ہے اور رہے گا۔ ذات پات حسب نسب یہ سب  
زمانہ جہالت کی باتیں ہیں ہمارے نبیؐ نے تو خود  
اپنے خاندان میں حضرت بلالؓ کی شادی کی تھی۔  
کہاں وہ اعلیٰ نسب اور کہاں ایک ادنیٰ غلام اور پھر دنیا  
انگشت بدندان رہ گئی۔ یہ بھی اسلام کی آفاقیت اور  
عصیت سے پاک معاشرے کی بنیاد ہم خود کو بڑے  
فخر سے مسلمان کہتے ہیں مگر کوئی ایک خوبی ہے ہم میں  
مسلمانوں والی؟ شرابی، جواڑی، استغفر اور دل کھول کے  
عیاش۔ لیکن جہاں شادی بیاہ کی بات آنے لگے  
حسب و نسب کی کسوٹی پر پرکھنے لگے یہ جانے بغیر کہ  
کردار کیسا ہے؟ چال چلن کی کیا حالت ہے۔“

دونوں بیٹے منہ بناتے ہوئے باہر نکل گئے جبکہ  
بڑی بیگم کی اکلوتی بیٹی زویا اور ان کے مہاں عید نے  
انہیں گلے لگا کر تسلی دی۔ عید خان کہتے کو تو ان کے  
داماد تھے لیکن بیٹیوں سے بڑھ کر۔ ان کے دست  
راست رفاقت علی خان نے ایسے ہی تو اپنی اکلوتی بیٹی  
کے لئے انہیں پسند نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی کیشری میں  
نیچر کے عہدے پر فائز تھے۔ بے حد نیک، ایماندار اور  
اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ چمڑے چھانٹ ماں باپ کا انتقال  
ہو چکا تھا اور حسب و نسب میں وہ رفاقت علی خان سے  
کم نہ تھے خود رفاقت علی خان نے جب انہیں اپنی  
فرزندگی میں لینے کی پیشکش کی تو وہ ہچکچاہٹ کا شکار  
ہو گئے۔ انہیں گھر داماد بننا پسند نہیں تھا لیکن رفاقت علی  
خان کے یقین دلائے پر کہ ان کی بیٹی زویا کا پورٹن  
تینوں بھائیوں سے الگ ہے وہ راضی ہو گئے۔ وہ زویا

کو دیکھ چکے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ رفاقت علی  
خان لاکھ با اصول اور سخت گیر سی لیکن بیٹی میں ان کی  
جان ہے۔ پھر عید خان نے ثابت کر دیا کہ رفاقت علی  
خان کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ انہوں نے عید خان کی  
شکل میں ہیرا چننا تھا۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی وفا۔ کچھ  
اندرونی عجیبیوں کے باعث زویا دوبارہ ماں نہ بن  
سکیں جس کا انہیں بے حد دکھ تھا لیکن عید خان اس پر  
صابر و شاکر تھے کہ اللہ اگر بیٹی بھی نہ دیتا تو ہم کیا  
کر لیتے، یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اولاد دے دی۔  
زویا اپنی کار تو تھی بے حد منکسر المزاج اور ٹھنڈے  
دماغ کی جبکہ وہ اس کے بالکل الٹ تھی۔

خدا جب حسن دیتا ہے  
نزاکت آہی جاتی ہے  
ماں باپ کے لاڈ پیار اور نانا نانی کے چوچکوں  
نے اسے خود پسند اور مغرور بنا دیا تھا۔ وہ اپنے آگے  
کسی کو کچھ نہیں جھکتی تھی۔ اس کی خود سری اور اکر کے  
سامنے کسی کو چوں کرنے کی مجال نہیں تھی۔ پھر اس پر  
طرہ امتیاز کہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ زویا نے اسے  
حزہ کے ہارے میں بتایا۔

”بیٹا! حزہ کے ابو کا شرف تمہارے ماموں  
میرے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ بے حد  
خوبصورت، ذہین اور عاجز، سوائے عادتوں کے تمہاری  
شکل کافی اپنے ماموں پر ہے۔“

”میری عادتوں کو کیا ہوا؟“ وفا ٹھک کر بولی۔  
”خود ہی دیکھ لو ایک جملہ کہنے سے کیسے بھڑک  
اٹھیں جبکہ تمہارے ماموں حد سے زیادہ دھیمے اور نرم  
حزاج تھے۔ گھر کے نوکر اس طرح ان سے گھلے ملے  
رہتے تھے جیسے وہ ان کے برابر ہوں یوں تو با انہیں  
بہت چاہتے تھے لیکن اسی ایک نکتے پر ان کے درمیان  
اختلافات بھی بہت تھے تمہارے ماموں کو فریبوں  
کے ساتھ ان کی بدگوائی، گالم گلوچ اور سختی پسند نہ تھی۔  
ابا کو شوق تھا کہ ان کے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں مگر

سخت مزاج انسان تھے مگر اولاد تو اچھے اچھوں کا دم خُم نکال دیتی ہے، تمہارے نانا کو یہ صدمہ لے ڈوبا ان کی زندگی نوحدہ بن کر رہ گئی لیکن ابا جان کی وفات کے بعد اماں جان نے بھی کبھی کاشف کا کھر میں ذکر نہیں کیا پھر اڑنی اڑنی خبر ملی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ لندن شفٹ ہو گیا۔ عرصہ دراز تک ہمیں کاشف کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا پھر گزشتہ سال ایک دوست نے اطلاع دی کہ دونوں میاں بیوی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اکلوتا بیٹا حمزہ چھوڑ کر جاں بحق ہو گئے۔ عرصہ سے اماں نے بیٹے کا منہ نہیں دیکھا تھا مگر خوش تھیں کہ جہاں رہے خوش آباؤ رہے۔“ اس خبر نے تو انہیں جیسے زندہ درگور کر دیا وہ اب صرف اپنے بھرم میں جی رہی ہیں ورنہ اندر سے بالکل ختم ہو چکی ہیں لیکن حمزہ کی آمد نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ بیٹی تم حمزہ کا بہت خیال رکھنا، کیونکہ تمہارے ماموؤں سے تو مجھے کوئی امید نہیں شاید خون سفید ہونا اسے ہی کہتے ہیں۔“

نانی اماں کی آواز سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”زویا بیٹی! خانساں سے کہو دو چار اضافی ڈشز بنالے آخر میرا پوتا آ رہا ہے۔“

”نانی اماں! آپ حمزہ کو پچپانیں گی کیسے؟“ وفا نے شرارت سے کہا۔

”پچپانیں کی۔“ وہ ہنسنے لگیں۔

”میرا خون ہے میرے کاشف کی اولاد کیسے نہیں پچپانوں کی؟“

اور پھر وہ آ گیا جس کا سب کوشدت سے انتظار تھا۔

عبید خان خود اسے لیز پورٹ سے لے کر آئے تھے۔

”میرا بچہ!“ دادی ہانپیں پھیلا کر آگے بڑھیں اور وہ ان کی مکلی ہانپوں میں سا گیا۔ دونوں بری طرح رو رہے تھے۔

”اماں! یہ تو بالکل کاشف ماموں کی ڈیو کا بی

تمہارے دونوں ماموں کتابوں سے ایسے بھاگتے تھے جیسے کو انہرے۔ نتیجتاً دونوں ماموں میٹرک سے آگے نہ پڑ سکے جبکہ تمہارے کاشف ماموں نے LUMS یونیورسٹی سے پڑھا تھا، ابا کو ان پر فخر تھا مگر یہ غرور و فخر اس وقت خاک میں مل گیا جب تمہارے ماموں ایک غریب کسان کی لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر کھر لے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ”کٹھوم ان کی کلاس فیلو تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے حدِ ذہن و فطین ہر سال LUMS یونیورسٹی گاؤں گاؤں جا کر غریب بچوں کے انٹرو پویتی ہے کہ شاید کہیں گڈری میں محل چھپا ہو۔ کٹھوم انٹر کر چکی تھی اس کی ذہانت سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ نہ صرف اس کو داخلہ مل گیا بلکہ اس کا رشب بھی مگر گاؤں کے وڈیرے کو جس کی اس پر بری نظر تھی یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ پہلے تو اس کا رشتہ دیا پھر اغوا کی دھمکی، تمہارے ماموں اس کی من موہنی صورت اور ذہانت سے پہلے ہی متاثر تھے مگر اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کٹھوم سے نکاح کر لیں۔ ان کو تمہارے نانا نانی سے اجازت لینے کی مہلت بھی نہیں ملی اور جب انہوں نے یہ سب بتایا تو اماں نے تو فوراً کٹھوم کو گلے لگالیا لیکن ابا آپے سے باہر ہو گئے ان کے ذات پات، حسب نسب اور خاندانی رکھ رکھاؤ کے اصول اتنے شدید تھے کہ بات بات پر گولیاں سینے کے پار ہو جاتیں، بے گناہوں کے خون سے زمین سرخ رہا اوڑھ لیتی اور کوئی دم نہ مارتا، دونوں بھائی تو پہلے ہی اس کی ذہانت اور مقبولیت سے خار کھاتے تھے۔ انہیں بھی بھس میں چنگاری ڈالنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ابا کو خوب بھڑکایا اور وہ مارنے مرنے پر تل گئے میں نے اور تمہارے ابا نے بڑی مشکل سے تمہارے نانا کو قابو کیا۔ پھر کاشف بیوی کو لے کر کہاں چلا گیا پتہ ہی نہیں چلا کیونکہ ابا کے پالتو کتے مدد تمہارے ماموؤں کے اس کی بوسو گھٹے پھر رہے تھے۔ تمہارے نانا ایک

ہے۔“ وفانے سرگوشی کی کیونکہ اس نے ماموں کی تصویریں ماں کے پاس دیکھی تھیں۔ بڑے ماموں کے بیٹے فہد نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔  
”یہ قائل ہے دادی اماں! خوشی کے موقع پر آنسو!“ فہد نے ہنس کر کہا اور اپنی کیلی آنکھیں ہتھیلی سے صاف کرنے لگا۔

فطر چاہتا تھا اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی کافی عادتیں اپنے ماموں جیسی تھیں اور وفا کے بعد بڑی بیگم سب سے زیادہ اسی کو چاہتی تھیں۔

”فہد بیٹا! تمہارے ابا اور چچا نہیں آئے؟“  
بڑی بیگم کو دکھ کے ساتھ ساتھ ندامت بھی تھی پھر دونوں ماموں بھی آ گئے۔ حمزہ بڑی گرجوٹی سے ملا مگر دوسری طرف یہ گرجوٹی مفقود کی۔ ان کا انداز بیگانہ اور سرد مہر تھا۔ جسے حمزہ نے محسوس ہی نہیں کیا۔ فہد حیرت سے سوچ رہا تھا۔

”آخرا ابا اور چچا کو حمزہ کے آنے کی خوشی کیوں نہیں ہو رہی خون ہے وہ ان کا!“  
مگر اس پاگل کو یہ پتہ نہیں تھا کہ دولت خون کے رشتوں میں دراڑ ڈال دیتی ہے۔

بڑی بیگم نوکروں کے ساتھ کاشف کے پورشن میں رہتی تھیں، جس پر دونوں بھائیوں کی نظریں تھیں اور اب یہ پورشن یقیناً حمزہ کو ملنے والا تھا۔

”دادی جان!“ حمزہ احترام کے ساتھ دادی سے مخاطب ہوا۔

”مجھے اجازت دیجئے۔“

”کس بات کی اجازت؟“

”میں نے ہوٹل میں کمرہ بک کرایا ہے آپ سب سے ملنا مقصود تھا کیونکہ ابو نے مرنے سے پہلے وعدہ لیا تھا کہ میں ایک مرتبہ آپ سب لوگوں سے ملنے ضرور آؤں گا اور مجھے اس وعدہ کی تکمیل کرنی تھی۔“ وہ نرمی سے بولا اور اپنی بھرائی ہوئی آواز پر کنٹرول کرنے لگا۔

بڑی بیگم بری طرح رو پڑیں۔ ”نہیں بیٹا! اب جانے کا نام نہ لینا ورنہ تیری دادی مر جائے گی۔ مجھے تیری شکل میں اپنا کاشف نظر آ رہا ہے، وہی قد بت وہی انداز گفتگو۔ جب تک میں زندہ ہوں مجھے چھوڑ کر مت جانا میرے نعل.....!“ وہ اس کو دیوانہ وار چومنے لگیں۔

”یار ہمیں بھی تھوڑی دیر خوش ہو لینے دو کیونکہ تمہارے آنے سے ہماری ویلیو تو ویسے ہی ڈاؤن ہو گئی ہے لیکن تمہاری شکل میں ایک اچھا دست ضرور مل گیا ہے۔“ فہد نے خلوص سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا پھر وفا کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”یہ ہیں ہمارے گھر کی اکلوتی بیٹی پھوپھی اماں کی صاحبزادی وفا۔ نام پر نہ جانا بے وفائی ان کی فطرت میں ہے۔ ناک پر بھی نہیں بیٹھتے دیتیں۔ بہت تک چڑی ہیں۔“ فہد کے انداز پر سب ہنسنے لگے اور وہ غصے میں بھٹا کرواک آؤٹ کر گئی۔

☆.....☆

اپنوں میں آکر وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا، گو دونوں چچاؤں کے خشک رویے سے وہ بدل ضرور ہوا تھا لیکن مایوس نہیں کیونکہ سب ہی لوگ پیار کرنے والے تھے پھوپھی، پچھو پچھا دادی اور فہد جس کی محبت اور خلوص کا وہ دل سے متحرف تھا۔

بڑی بیگم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کاشف کا پورشن اب حمزہ کا ہے اور وہ اب وہیں رہے گا۔ دونوں بھائی جزیرو تو بڑے ہوئے کیونکہ دونوں ہی کی سرشت میں خود غرضی اور لالچ کوٹ کوٹ کر بھری تھی یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ آصف کا ایک ہی بیٹا فہد اور واصل کا جینید تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی الٹ فہد ماموں کی طرح بے حد پڑھا کو مخلص اور ہمدرد انسان تھا۔ جبکہ جینید چچا اور باپ کا پرتو ہے حد ابن الوقت مکار خود غرض اور مصلی۔ وفا اس کے بچپن کی مگنیر تھی جو اسے

قطعی پسند نہ تھی مگر جائیداد کی لالچ کی وجہ سے وہ اسے پسند کرنے پر مجبور تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ماں باپ کے علاوہ دادی بھی اپنے اور کاشف کے حصے کی جائیداد نوآسی کو دے دیں گی اور اب اس حمزہ نے آکر سارا پلان چوٹ کر دیا تھا اور سب اس کے آگے پیچھے تھے۔ خاص طور پر فہد جو اس کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں سے متاثر تھا جو غیر ملکی ڈگریاں رکھتے ہوئے بھی سادگی کا پیکر اور غرور و تکبر سے کوسوں دور تھا اور جب وہ انگلش لب و لہجے میں اردو بولتا تو سب کو اور بھی خوبصورت لگتا۔

☆.....☆

حمزہ کو اپنی یہ سنجیدہ پروقار سادہ اور کچھ انٹری کزن وفا بے حد پسند آتی تھی۔ غرور اس پر بچتا تھا اس کا رویہ گوئے حمزہ کے ساتھ بے حد لیا دیا ساتھ تھا لیکن پھر بھی حمزہ اس سے دین بدن متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خاندان کی واحد لڑکی تھی جو پڑھنے یونیورسٹی جا رہی تھی۔ حالانکہ وفا نے اس کو کبھی قابل درخور اعتنا نہ جانا تھا۔ پھر بھی اس کا رکھ رکھاؤ بولنے کا انداز نوکروں تک سے احترام سے پیش آتا اور خاص طور پر خواتین کی عزت کرنا اس کے لئے اچھے کا باعث تھا کیونکہ اس نے گھر کے مردوں کو ہمیشہ حکمانہ انداز میں بات کرتے اور نوکروں کو جھڑکتے ہوئے ہی دیکھا تھا اور وہ خود بھی نوکروں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی لیکن فہد کے بعد یہ واحد فرد تھا جو نوکروں سے اس طرح گھلامار ہتا جیسے وہ اس کے ہم پلہ ہوں۔ نوکروں کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا اور کبھی مذاق کرنا اس کے لئے حیرت کا باعث تھا کیونکہ جمعہ اس کے ابا یہاں کی خواتین اسے ہمیشہ شوہروں اور بھائیوں کے سامنے گڑگڑاتی اور مہمانی نظر آئیں۔ اس کے لبا اس کو بے حد چاہتے تھے لیکن دوسروں کے لئے ان کا رویہ بھی گھر کے عام مردوں جیسا تھا۔ اس کا دل چاہتا حمزہ اس کے صن کی تعریف کرنے اس کی شان میں

قصیدے پڑھے اس کی قابلیت کے گن گائے کہ وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹر ڈگری بھی۔ اس کو سراسر یہ یقین جانے وہ کس مٹی کا پتا ہوا تھا کہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور یہی حسن کی توہین و فاکو چراغ پا کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس کو اپنے قدموں میں جھکانے کی تمنا اب اس کی خواہش ہی نہیں ضد بن گئی تھی اور اب صرف اس کو چلانے کے لئے وہ چند پرزادہ سے زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ جس سے بھی اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اب اس کے ساتھ مل کر حمزہ کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ قدم قدم پر اس کی تذلیل کرتی، اس کا مذاق بناتی مگر وہ ایسا بن جاتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کو گھر والوں کی طرف سے حمزہ کی اس قدر پذیرائی پر بھی غصہ تھا جہاں وفا کے نام کی صدائیں کوئی نہیں اب سارا دن حمزہ کے نام کی پکار پڑتی رہتی تھی۔ حد تو یہ کہ نوکر بھی اس کی شان میں رطب اللسان تھے۔ اس دن تو فہد نے سب کے سامنے ہی اس کا پیچھا پکڑ لیا۔

”بچ بتاؤ تم نے کہیں یورپ میں کسی گوری سے شادی وادی تو نہیں کر لی؟“

”ارے نہیں یار!“ وہ ہنس پڑا۔

”مشرق کو جو حسن ملا ہے اس کا عشر شیر بھی مغرب میں نہیں وہاں عزت و عصمت اور شرم و حیا کی داستانیں قصہ پارینہ ہیں صرف گوری چڑی پھیکا شلیم حسن تو نہیں۔ مجھے تو مشرقی لڑکیاں پسند ہیں۔ لمبے سیاہ بال، آہو چشم اور شاخ گل کی طرح لچاتی شرماتی شرم و حیا والی!“

”تمہارا اشارہ ہماری وفا کی طرف تو نہیں؟ مگر شرم و حیا تو بے توہ!“ اس نے شرارت سے گال پیٹے۔

”لا حول و لا قوۃ!“ حمزہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”حمزہ بھائی! آپ ہوش میں تو ہیں۔“ وہ غصے



یقیناً اکلوتی نواسی کو ملنے کی توقع تھی وفا سے محبت تو سے بگڑ کر بولی۔

ایک خوش رنگ ڈرامہ تھا۔

دوسری طرف وفادان بدن مزہ کی مردانہ جاہت اور اس کے اخلاق سے متاثر ہونے لگی تھی۔ اس کی مسکور کن شخصیت اور پروقا طرز زندگی نے اسے جنید سے مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کی ادھیجی اور گری ہوئی حرکتوں سے وہ پہلے ہی نالاں کی وہ اب اسے اجڈ اور گنوار لگنے لگا تھا جس کو نہ بات کرنے کی تمیز تھی نہ کھانے پینے کا ذہنک اور اوڑھنے پہننے کا سلیقہ۔ مگر اسے اپنی تسوایتیت اور اتنا بے حد عزیز تھی۔ مزہ کے آگے جھٹکا حسن کی توہین تھی وہ مزہ کو اپنے آگے جھکا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ واصف کی خواہش تھی کہ جلد از جلد جنید اور وفا کی ممکنگی کا اعلان کر دیا جائے اور دو ماہ بعد شادی لیکن عبید خان تذبذب کا شکار تھے۔

”بیگم! میں نے بڑی غلطی کی ہیرا چھوڑ کر پتھر کو چن لیا، کونسا شری عیب ہے جو تمہارے پیچھے میں نہیں دوسری طرف مزہ ہے بے حد شریف اعلیٰ ظرف اور خوبصورت و خوب سیرت۔ میں دورا ہے پر کھڑا ہوں۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ جانتے نہیں مزہ کی ماں.....؟“ ”زویا بگڑ کر بولیں۔“

”زویا اگر کوئی غریب کسی درخت کی آبیاری کرے تو کیا تم اس کے پھل نہیں کھاؤ گی؟ غریب ہونا جرم تو نہیں بلکہ ہم جیسے عیاش خود غرض اور موقع پرست لوگوں سے تو اس غریب کی بیٹی اچھی جس نے اپنے بیٹے کی اتنی اچھی تربیت کی بے شک تمہارے ماں باپ جدی پشتی امیر ٹھہرے اور خاندانی بھی تھے لیکن تم جانتی ہو تقسیم ہند کے وقت بے شمار کی کمزوریاں اور بڑوں کے کتے کھلانے اور گھوڑوں کو نہلانے کے صلے میں بے شمار زمینوں کے مالک بن گئے جبکہ مزہ کے نانا، نانی نہ صرف خوددار تھے جبکہ خاندانی

”یہ لاجول کس پر پڑھی ہے آپ نے میں تو آپ جیسوں کو منہ بھی لگانا پسند نہیں کرتی۔“

”سوری یہ لاجول آپ کے لئے نہیں فہد کے لئے تھی جس نے اتنی بے بسی کی بات کہی ہے۔“ وہ محذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں میں آپ جیسوں کے منہ لگانا پسند نہیں کرتی!“

”آپ جیسوں سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ مزہ نے متانت سے سوال کیا اور فہد جواب سے بغیر اسے باہر لے گیا۔

☆.....☆

موسم مسکور کن تھا خشک ہوائیں سرسرا رہی تھیں چٹھیلی، رات کی رانی اور موگرے اور موتیا کی خوشبو سے پورا لان مہک رہا تھا، مزہ سنگ مرمر کی بچ پر بیٹھ کر کچھ سوچ رہا تھا، بھی ماں باپ یاد آتے بھی دادی کی بے بسی پر ترس آتے لگتا ساتھ ہی بچاؤں کا خشک روپا اور وفا اور جنید کی طنز پر باتیں دل دکھانے لگتیں۔ اگر فہد کا خلوص، دادی کی محبت اور پچاسا پچاسی کی چاہت پیروں کی زنجیر نہ بنتی تو وہ کب کا یورپ لوٹ جاتا جہاں کا وہ شہری تھا اس کو دولت جائیداد سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ علم کی دولت سے مالا مال تھا، پھر والدین بھی ایک کثیر سرمایہ اس کے لئے چھوڑ کر مرے تھے فطرتاً وہ قناعت پسند اور صابر تھا اور صرف سچی محبت اور خلوص کی تلاش میں پاکستان آیا تھا، ورنہ یورپ میں ایک سے ایک لڑکیاں اس کے گرد منڈلائی رہتی تھیں۔

واصف کی جوانی بہت رنگین گزری تھی۔ ریس اور سے نوشی نے انہیں مالی اعتبار سے بالکل دیوالیہ کر دیا تھا اور جنید بھی انہی کے نقش قدم پر تھا اس ایک گھٹے پر دونوں ہی مشتق تھے کہ جلد از جلد وفا سے شادی کر کے اس کے حصے اور نانی کے حصے پر قبضہ جمایا جائے جو

بھی۔ تمہارے ابو بھی میرے لئے بہت اچھے انسان تھے لیکن اماں جان کی طرح مجھے بھی ان کے ذات پات اور حسب و نسب کے اصولوں سے اختلاف تھا وہ تو اماں جان اگر اپنے معتد خاص سے ان کو پرپ نہ سمجھتیں اور ان کی مالی مدد نہ کرتیں تو شاید تمہارے دونوں بھائی تو انہیں زندہ بھی نہیں چھوڑتے۔“

”آپ جانتے تھے۔“ زویا کی آنکھوں میں حیرت درآئی۔

”بے وقوف خاتون! اماں جان کا دست راست یہ آپ کا ناچیز خاوند ہی تو تھا جس نے بھاگ دوڑ کر کے کاشف اور اس کی بیوی کو لندن پہنچایا اور وہاں سیٹل ہونے میں مدد بھی دی مگر اماں جان نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا۔“

حزہ ایک طویل سانس لے کر دروازے کے پاس سے ہٹ گیا اتفاقاً ہی یہ راز اس کے کانوں میں پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے ماں باپ کو در بدر ہونا پڑا مگر می ڈیلی نے اسے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا وہ اپنے پھوپھا کی اعلیٰ عمری پر دل سے معترف تھا۔

☆.....☆

واصف کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور عبید خان کشکش کا شکار تھے۔ انہوں نے بہتر سمجھا کہ وفا سے ڈائریکٹ پوچھ لیا جائے۔

”ابا! اگر جنید بھائی دنیا کے آخری انسان بھی ہوں تب بھی مجھے ان سے شادی منظور نہیں، بے شک پھر آپ کسی سے بھی کر دیں میں انکار نہیں کروں گی مگر جنید بھائی تو مر کر بھی نہیں!“

اندر آتے ہوئے جنید کے کان میں جب یہ الفاظ پڑے تو وہ دبے پاؤں واپس پلٹ گیا۔

☆.....☆

آج فہد کے سلسلے میں سب لڑکی والوں کے گھر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے یہ رشتہ فہد کی پسند سے

خالہ کے گھر کیا جا رہا تھا لیکن وفانے بخاری وجہ سے جانے سے انکار کر دیا اور زویا کو بھی اصرار کر کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ لیٹے لیٹے بیزار ہونے لگی تو چائے پینے کے ارادے سے اٹھ کر بیٹھ گئی ابھی وہ دوپٹہ اوڑھ ہی رہی تھی کہ طوفان کی طرح جنید اندر داخل ہوا۔

”جنید بھائی آپ اور اس وقت؟“

جنید نے بغیر جواب دیئے کمرے کی کنڈی لگالی اس کی آنکھوں میں وحشت اور دیوانگی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ وہ گڑ گڑائی۔

”میں اپنی چیز سے اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہوتا، تمہیں آج بھی سمجھانا چاہتا ہوں!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھی اس کو اندازہ تھا گھر میں کوئی نہیں ہے اور اتنے بڑے گھر میں بند کمرے سے اس کی آواز بھی باہر نہیں جاسکے گی۔

”مطلب بالکل صاف ہے تم مجھ سے شادی کے لئے تیار نہیں اور میں آج تمہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ کوئی اور تمہیں منہ لگائے۔“

وہ اس کی طرف وحشیانہ انداز میں دانت پیستے ہوئے بڑھا۔

”آپ شاید اپنے ہوش میں نہیں ایک آواز لگاؤں گی تو آپ کا تماشہ بن جائے گا بہتر یہی ہے کہ آپ شرافت سے باہر چلے جائیں۔“

وہ غصے سے چٹکی اور جنید نے اس کو پتلی سے دبوچ لیا اور پھر وفا کی چیخوں سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔

جنید کو معلوم نہ تھا کہ فہد اور حمزہ اپنے کمرے میں شطرنج کی لیسٹ بجائے بیٹھے ہیں حمزہ کے کانوں میں وفا کی ٹھٹی ٹھٹی آواز آئی تو وہ بے ساختہ اوپر وفا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ جبکہ فہد بدستور شطرنج کی چالوں میں غرق تھا۔ اسی دوران گھر والے بھی آپہنچے تھے حمزہ نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تو جنید نے دروازہ کھول دیا وفا ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح

کہے تو میں نہیں مانوں گی کیونکہ وہ کاشف کا بیٹا ہے کسی شرابی کبائی کا نہیں۔“

بڑی بیگم کے لہجے میں اتنا یقین اور مان تھا کہ دونوں باپ بیٹوں کو آگے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

فہد دندنا تا ہوا دفا کے کمرے میں پہنچا اور چیخ کر بولا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا دفا؟ تمہاری خاموشی نے ایک بے قصور انسان کو مجرم بنادیا میں جانتا ہوں حمزہ بے قصور ہے کیونکہ وہ تو میرے ساتھ تھا۔“

”فہد بھائی!“ دفا بلک بلک کر رونے لگی۔

”میرے اعصاب جواب دے گئے تھے حواس معطل ہو گئے تھے میں اتنی حواس باختہ ہو گئی تھی کہ حمزہ بھائی کی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہہ سکی حالانکہ میں بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔“

”ایک بات پوچھوں دفا؟ جنید سے شادی سے انکار کی وجہ حمزہ تو نہیں؟“

فہد نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے سر جھکا کر رونا شروع کر دیا۔

”میں کیا کروں فہد بھائی! وہ پتھر ہے میں اس سے سر ٹکرا کر مر بھی جاؤں گی تو بھی وہاں اتر نہیں ہونے والا۔ میں ٹوٹ گئی ہوں ٹھہر رہی ہوں مگر میں بھی ایسا کچھ نہیں بولوں گی اور اس بے غیرت بے حمیت جنید کے ساتھ چپ چاپ رخصت ہو جاؤں گی کیونکہ یہ تو طے ہے کہ میں نہ جھگوں گی نہ حمزہ سے محبت کی جھک مانگوں گی وہ خود کو جھٹاتا کیا ہے میں اب اتنی بھی گئی غمزدہ نہیں ہو سکتی ہوں جھک نہیں سکتی۔“

”پاگل لڑکی!.....“ فہد نے اس کا شفقت سے سر تھپتھپایا۔

”میں تمہارے دشمن۔ دیکھو ذرا حمزہ سے دور ہی رہنا پتہ نہیں غصے میں وہ تمہارا کیا حال کرے اور تم

کو نے میں کھڑی قمر قمر کا پ رہی تھی، جنید ابھی پویش کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ عبید خان اور واصف بھی ہانپتے ہوئے پہنچ گئے، غالباً وہ بھی اسی وقت گھر میں داخل ہوئے تھے سب کو دیکھ کر جنید نے ایک گھونسا حمزہ کے منہ پر جڑ دیا۔

”پھو پھو جان! یہ ذلیل شخص دفا کے ساتھ دست درازی کی کوشش کر رہا تھا اگر میں بروقت نہ آ جاتا تو جانے کیا ہو جاتا۔“

یہ سنتے ہی واصف نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا اور بری طرح حمزہ کو پینٹا شروع کر دیا۔ دفا باپ سے لپٹ کر بری طرح رو رہی تھی، عبید خان کے کچھ سمجھنے سے پہلے دونوں باپ بیٹوں نے حمزہ کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

”نکل جاؤ کم ذات پنج عورت کی اولاد!.....!“

”بس چچا جان آپ نے بہت کہہ لیا اور میں نے سن لیا، میں اب اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہوں گا“

کیونکہ سچائی خود اپنے منہ سے بولتی ہے مگر آپ نے ایک لفظ بھی میری ماں کے بارے میں کہا تو میں نہ رشتے کا لحاظ کروں گا نہ عمر کا مجھے فخر ہے اپنی ماں اور اپنے نانائے بزرگ پر جو نہ عیاش تھے نہ شرابی نہ مکار۔“

یہ کہتے ہوئے حمزہ تیزی سے نکلتا ہوا چلا گیا اتنی دیر میں دادی اور فہد بھی چیخ پکار سن کر اوپر آ گئے۔

”کیا ہو رہا ہے یہ سب کیسا ہنگامہ ہے اور یہ حمزہ غصے میں کہاں جا رہا تھا؟“ دادی چیخ کر بولیں۔

”بہت فخر کرتی تھیں نا آپ اپنے پوتے پر رگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ حمزہ گھر کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا وہ تو میرا بیٹا جنید نہ آ جاتا تو آپ اس وقت منہ دکھانے کا قابل نہ رہتیں!“

اس دوران عبید خان دفا کے ساتھ کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

”خبردار!“ بڑی بیگم ڈپٹ کر بولیں۔

”اپنی زبان کو لگام دو کوئی چو لے پڑے کر بھی

دیکھتی جاؤ جنید کو تو میں ایسا سنی سکھاؤں گا کہ اپنے  
زخم چاٹنا ہی رہے گا۔“  
”مگر اس پتھر کے دیوتا سے دل لگانے کا مشورہ  
کس احق نے دیا تھا۔“  
آخر میں فہد کا لہجہ شرارتی ہو گیا اور وفا کھسانی  
ہی بننے لگی۔

☆.....☆

پورے گھر میں حمزہ کی ڈھونڈ مچتی تھی اور وہ غائب  
تھا۔  
”ارے کتنو! ڈھونڈو میرے حمزہ کو جانے کہاں  
کہاں بھگ رہا ہوگا، کس قدر گھٹیا الزامات لگائے  
میرے بچے پر کیسا کچڑا اچھالا اور اپنے گریبان میں  
جھانک کر نہیں دیکھا۔“  
”دادی کیوں پریشان ہو رہی ہیں عیش کر رہا ہوگا  
کہیں بیٹھ کر۔“

جنید نے ڈھٹائی سے ایک آنکھ دبائی تو بڑی  
نیگم نے ایک دو تھڑا اس کی کمر پر رسید کر دیے۔  
”کجبت یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے تجھے شرم نہ  
آئی اپنے بھائی پر جھوٹا الزام لگاتے اور میری نواسی  
بھی اس وقت منہ میں کھونٹکیاں ڈال کر بیٹھ گئی۔“  
”اور تم باپ بیٹے کو موقع مل گیا تم دشمن ہو اس  
کے آخر کس باپ کے بیٹے ہوا سے ڈھونڈ کر لاؤ ورنہ  
میں بھی ختم ہو جاؤں گی۔“

بڑی نیگم دھڑائیں مار مار کر رونے لگیں اور ان پر  
غشی طاری ہوئی سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔  
فہد نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گھر سے نکل گیا وہ  
جانتا تھا حمزہ کہاں ملے گا۔ وہ ہوٹل پہنچا تو حمزہ یورپ  
جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”گھر چلو دادی کی طبیعت بہت خراب ہے؟“  
”کس کے گھر کون سے گھر، میں ٹھہرا آوارہ  
بد معاش شرفاء کے گھر کیسے جا سکتا ہوں؟“ وہ دکھ  
سے بولا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ وہاں ایک لفظ اپنی صفائی  
میں بولے بغیر یہاں آ گئے اور اب جانے کو تیار نہیں  
تھیں بولنا چاہیے تھا۔“

”کیا بولتا اور کیوں بولتا جب وفا چپ رہی جو  
میری زندگی کی اولین اور سب سے بڑی خواہش تھی،  
وہ جنید کی سنگیتر تھی اور میں ایک لاوارث پھر وہ  
میرے حق میں اور جنید کے خلاف کیسے بولتی اور میں  
نہیں چاہتا تھا کہ جنید جو وفا کی محبت ہے سب کی  
نظروں میں گر جائے۔“

”واہ بھی تم تو جیج کے بھٹوں نکلے احق انسان  
اس وقت وفا اپنے حواسوں میں نہیں تھی بعد میں اس  
نے سب کو جیج بتا دیا تھا بلکہ اس نے تو وہ کچھ بھی  
مجھے بتا دیا تھا جو تم سن کر شاید شادی مرگ کا فکار  
ہو جاؤ فی الحال تو تم گھر چلو۔“  
فہد مسکرا کر بولا۔

”ہرگز نہیں اس بے عزتی کے بعد تو میں اس گھر  
میں قدم نہیں رکھوں گا۔“  
حمزہ غصے سے بولا۔

”جائیں گے تو تمہارے اچھے بھی یار کیوں ماش  
کے آنے کی طرح اینٹھ رہے ہو، وہاں دادی کی  
طبیعت بہت خراب ہے، رو رو کے انہوں نے زمین  
آسمان ایک کر دیا ہے اور صرف تمہیں پکار رہی ہیں  
پلیز میرے ساتھ چلو۔“

وہ دادی سے لپٹ کر رو پڑا قریب ہی وفا بھی  
سک رہی تھی۔

”بیٹا تو کیوں شرمندہ ہوتا ہے ڈوب تو میری وہ  
جنہوں نے یہ زہر مارا چایا۔ ارے کیا میں اپنے خون کو  
پچھانتی نہیں ہوں مگر ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی  
ہے شاید جو ہماری دلی خواہش تھی اسے اسی طرح پورا  
ہونے کے لئے اسی طرح کے ڈرامے کی ضرورت تھی  
کہ میں آج اپنے پوتے کی شادی اپنے ہاتھوں سے  
کروں گی جو صیاد نے تمہارے لئے جال بچھایا تھا



اس میں خود بھنس گیا۔“ اسے کہتے ہیں خدا کا انصاف اور اللہ کی قدرت کہ حق محمدؐ اور سیدؐ۔

حزہ کی سمجھ میں بالکل بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے کبھی پوچھا گلے لگا کر معافی مانگ رہے ہیں تو پوچھو بھی صدے واری ہو رہی ہیں اور ہند تو باقاعدہ بھنگڑہ ڈال رہا تھا۔

”دادی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔  
”تمہارا نکاح ہو رہا ہے وفا سے۔“ بڑی بیگم اطمینان سے بولیں۔

”دادی!“ حید نے احتجاج کیا۔  
”وفا میری سنگیتر ہے ایسا نہیں ہو سکتا میں ہونے نہیں دوں گا۔“ حید غصے سے دہاٹا۔

”تم ہوتے کون ہو جھ میں بولنے والے۔“  
”نہ کھلاؤ زبان میری بس اس کو یوں ہی رہنے دو۔ بقول تمہارے حید نے وفا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی تو اب شادی بھی اسی سے ہوگی۔“

حید خان نے اطمینان سے جواب دیا اور پھر حویلی کے کمینوں نے دیکھا وفا رخصت ہو کر کاشف کے پورٹن میں آگئی اس نے اپنی محبت بانی تھی جس پر اسے فخر تھا مگر دل اندر سے سوچنے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ جانے حید کس طرح لے گا مگر وہ خود کو ہر طرح کے سلوک کے لئے جتنی طور پر تیار تھیں۔ در اس کو یقین تھا کہ ایک نا ایک دن حید کو اس کی محبت چاہت اور وفا پر یقین آئی جائے گا۔

حید دروازہ بند کر کے قریب آیا تو وہ لرزاشی اس کے چہرے پر خوشنود اور چٹانوں جیسی تھی اور لب بچنے ہوئے وفا کی سانسیں رکے لگیں جوں ہی حید نے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا خوف سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں پھر کی گونج کانوں میں آنے لگی مگر جب گالوں پر انگلیاں سرسرا نے لگیں تو اس نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں۔ حید مکرار ہاتھ اس کی محبت پاش نظریں اس کے صبح چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”خوف زدہ ہو ہوا بھی چاہیے مگر محبت کی ہے تو ڈر کیا؟ وہ تو پوچھا بہت سمجھدار ہیں۔ ایک نظر میں انہوں نے حقیقت جان لی تھی خراشیں جنید کے چہرے پر تھیں تمہیں کے شن اس کے ٹوٹے ہوئے تھے انہیں تمہاری خواہش کا بھی پتہ تھا پھر انہوں نے ان کی چال انہی پر الٹ دی اس کو کہتے ہیں شامت وہ تو اگر ہند حقیقت نہ بتاتا تو ہرگز تم سے شادی نہ کرتا باوجود اس کے کہ تم میرے روم روم میں بسی ہو۔“

”ہند بھائی نے کیا حقیقت بتائی؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بہی کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟“  
”ہوتا ضرور اگر مجھے یہ پتہ نہ چلا کہ تم گوڈے گوڈے میری محبت میں ڈوبی ہوئی ہو اور میں تو پہلے ہی دن تمہاری زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا۔“

”پھر آپ نے اظہار کیوں نہیں کیا۔“  
وفا کی زبان سے شکوہ پھسل گیا۔

”کیونکہ اظہار وفا عشق میں تو بین وفا ہے۔“

تمہارا رعب حسن احساس برتری اور غرور و تکبر.... میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا تھا اور پھر

قدم قدم پر میری مرحومہ ماں کے طعنہ.....

”بس بھی کیجیے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا آخر

بھانجی کس کی ہوں۔“ وفا نے فخر سے کہا۔

”اور اب بیوی کس کی ہو زرا قریب آؤ تو بتاؤں“

وہ ساری جگر کی داستانیں محبت کی کہانیاں جسے سننے کو

تم بیتاب ہو اور میں کہنے کو بے چین۔“

اس نے مسکرا کر وفا کو خود سے قریب کر لیا اور

پوری کائنات ان کے من پر مسکرانے لگی۔

.....☆.....

افسانہ

# ریمانور رضوان

میرے دل کالے گئے جین  
”مسٹر..... تم.....؟“

اوبے خبر  
اوبے قدر

ملائکہ ڈسٹنگ چھوڑ کر آریان کے پاس آئی تھی۔  
ملائکہ نے آریان کو اپنی پرسل چیزیں لینے کے لیے  
مارکیٹ بھیجا تھا اور آریان مارکیٹ جانے کا کہہ کر گیا  
تھا لیکن واپس آ گیا تھا۔

”جان! ہم کیا کریں۔ تم بن کر کچھ اچھا نہیں  
لگتا۔ تم بن سب بے مزہ، بے رونق لگتا ہے۔ دل نہیں  
لگدا تیرے بنا سو بیو دل نہیں لگدا تیرے بنا۔“  
آریان نے حال دل عیاں کرتے کرتے ملائکہ کو  
بانہوں میں بھر لیا تھا اور گانا گنگنا تے ہوئے ایک شوخ

بے چہیاں بے تائیاں ہیں جواں  
ملائکہ فل والیوم میں گانا گا رہی تھی اور اپنے بیڈروم  
کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔  
آریان دروازے کی چوکت پر کھڑا ملائکہ کو یک  
یک دیکھ رہا تھا۔ پھر دیر سے سے گنگنایا۔

تاکتے رہتے تھے کو  
سناجھ سویرے نیوں  
میں لیاں جیسے نین یہ تیرے  
تیرے مست مست دو دین



ی شرارت کر ڈالی تھی۔ شادی کو ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ ملائکہ اس کی شوخیوں پر جھینپ سی گئی پھر دیر سے مسکرا دی تھی۔

☆.....☆

”آریان!“

ملائکہ اپنے کپڑے سیٹ کر رہی تھی۔ کچھ یاد آنے پر آریان کو پکارا تھا۔ آریان تو سب طرف سے بے خبر ہو کر بیوی دیکھ رہے تھے۔

”مسٹر آریان!“

ملائکہ نے سمجھ بھلا کر لگا تار چار پانچ آوازیں لگائیں۔

”جان! پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔ فلم بڑی زبردست چل رہی ہے۔ آ جاؤ تم بھی دیکھ لو ایکشن ری پلے، اچھی مودی ہے۔“ آریان نے پیار سے منہ کرنے کے ساتھ ہی ملائکہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس کھینچ لیا تھا۔

ملائکہ کا موز آف ہو چکا تھا۔ ملائکہ کو خود تو بیوی دیکھنے میں انٹرسٹ نہیں تھا۔ اسی لیے آریان کا بیوی میں گم ہونا اسے برا لگتا تھا۔

”ہم کہیں چلیں؟“ ملائکہ نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔ آہستگی سے آریان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ ”کہاں جانا ہے میری جانو کو؟“ آریان اس کے ہاتھ جوئے ہوئے بولا تھا۔

”کہیں بھی اچھی سی جگہ.....“

”میڈم! آپ دو ماہ میں پورا کراچی شہر گھوم چکی ہیں، اب آپ ہی سلیکٹ کریں کہ کون سی جگہ اچھی ہے۔“ آریان نے فیصلہ ملائکہ پر چھوڑ دیا تھا۔

”آج سال کا آخری دن ہے۔ کل نیا دن نئے سال کا آغاز ہوگا۔ ہم سال کا اچھا دن اچھی جگہ اچھے طریقے سے گزارنا چاہتے ہیں۔ تاکہ شادی کے بعد والا نیا سال ہمیں ہمیشہ یاد رہے اور اس سال کو ہماری یادوں میں منفرد حیثیت ملے۔“

”واؤ! ڈارلنگ! آئیڈیا تو اچھا ہے۔“

آریان نے ملائکہ کو سنا لیا تھا۔ ملائکہ عام سے لوگوں کی طرح نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس کی سوچ دوسرے لوگوں سے منفرد تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے ہر لمحے ہر پل ہر دن ہر رات سے ڈھیر ساری خوشیاں اور یادیں کشید کرنا چاہتی تھی اور ہر پل اور لمحے کو نئے نئے طریقے سے کے بھر پور گزارنے کا سوچتی تھی۔ جس میں اس کا شریک حیات بھر پور ساتھ دیتا۔ دونوں اپنی نئی نئی ازدواجی زندگی کے حسین ترین دن پلان کر کے حسین ترین طرح سے گزار رہے تھے۔

☆.....☆

سورج غروب ہونے سے قبل آریان ملائکہ کو سی دیوے لے کر آگیا تھا۔

”آریان! کل، ہم سال کا نیا دن نیا سورج دیکھیں گے پھر اگلے برس یہاں آکر ہم اس دن کو شہادت سے محسوس کریں گے۔ ایک سال میں ہماری زندگی یکسر بدل جائے گی۔ سہانے دن پہانی راتیں مصروف دن مصروف راتوں میں بدل جائیں گے۔“ ملائکہ آریان کے سینے کے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

”جیسے دیکھتے ہیں۔“ ملائکہ نے آریان کو محسوس کرتی ہو جیستی ہو، جنہیں زندگی جینے کا ڈھنگ آتا ہے، میں زندگی کو گزارتا تھا لیکن تم نے مجھے جینا سیکھا دیا پہلے میرے نزدیک کسی دن کسی پل کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں سب دن سب پلوں کو ایک سا سمجھتا اور گزارتا تھا لیکن تم نے مجھے بتایا کہ زندگی میں شامل ہونے والا ایک ایک پل ایک ایک لمحہ نیا اچھوتا پریم بھرا ہے۔ زندگی سچ بہت مختصر ہے سبیں سچ میں اس سے اتنی خوشیاں کشید کرنی چاہئیں کہ ہمیں زندگی سے پیار ہو۔ زندگی میں پیار محبت ایک دوسرے کا احساس و خیال ہے تو یہی ہے اصل زندگی اور محبت۔

☆.....☆

عائشہ زوالفقار

افسانہ

# سائیکو ٹریکس





”دادا جی!“ کمر کی تمام خواتین کو مصروف دیکھ کر عاشر دادا کے گھٹنے سے اٹکا۔

”کی تکلیف اے؟“ دادا کو اس کی آواز سے ہی شائد اس کا مدد مانگا گیا تھا۔

”دادا جی! پھر کب جائیں گے آپ صبحہ کے کمر؟“

اس کی ٹیف سی آواز میں کوئی اس کی ماں کے کانوں تک پہنچ سکتی، وہ جھٹ مریں چھوڑ کر قریب آگئی۔

”کی ہو یا اباجی!“ وہ دادا کے کان میں ہی کھس گئیں۔

”پرے ہو کے گل (بات) کرنی۔“ دادا ایک دم بد مزہ ہوئے۔ عاشر انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”میں نے تجھے کہا تھا کہ اپنے چھوکرے کو سمجھا، میں نہیں جاؤں گا اس لفظی کے کمر رشتہ لے کر۔“

عاشر تڑپ گیا۔ ”دادا جی وہ لفظی نہیں ہے۔“ دادا اس سے بھی اونچا چلائے۔ ”تو پھر کیا ہے

وہ جس نے تجھے اپنے پیچھے لگایا ہوا ہے اس نے۔“ دادا کی آواز سن کر دھیرے دھیرے تمام

خواتین جمع ہو گئیں۔ احمد نے آگے بڑھ کے عاشر کو حوصلہ دلایا۔

”اپنے کمر میں کڑیاں مر گئیں کیا؟“ دادا پھر بولے۔

”کوئی نہیں میں نے نہیں کرنی اس جن سے شادی، آئے آئے۔“ میں اور ماریہ اس پر چڑ

دوڑیں، عاشر ہمیں تشدد سے دیکھ کر رہ گیا۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا عاشر جب یہ بات کرنی

شروع کرتا، دادا جی پہلی دیوار کھڑی کر دیتے۔ ”غیر ہمداری میں دیاہ کرانے کا سوچنا بھی

مت، ہم لوگ چوہدری اور وہ لوگ .....!“ عاشر دلیلیں دے دے کر اس دیوار میں سوراخ کرتا تو

اگلی دیوار کھڑی ہو جاتی۔

”توبہ توبہ، اب تو غیر مسلک کی کڑی لائے گا، شرم کر بے غیرتا، ہم لوگ اجمہدیت اور وہ لوگ

بریلوی۔“ عاشر یہ دیوار توڑ ہی نہ پاتا۔ دادا جی کی حمایت کو ماریہ کی امی بھی آ جاتیں۔

”ہور کی اباجی (اور کیا اباجی) اس کمر میں بس اک بریلون کی کمی رہ گئی ہے جو مجھے پر (بھر

بھر) کے تم والے طوے کھائے، توبہ توبہ۔“ دادی کے الگ ٹین شروع ہو جاتے۔ ”میں

کہاوی تھا کہ منڈے نوں سنگل پاد پو پر میری سندا (سندا) کون ہے۔“

عاشر جھلا اٹھا۔ ”او دادی جی! میں کیا تیل ہوں جیسے سنگل ڈالنا ہے، حد ہوتی ہے۔“

شمینہ چچی کو اپنا یکہ یاد آ جاتا۔ ”میرے ماموں کی سالی کا بھائی بھی ایسے ہی بریلون لے آیا تھا،

پورے خاندان کو ختم۔“ وہ اپنے طوے غسوائی ہے اب۔

ان کی آواز سن کر ہی دادی کو قہر چڑھ جاتا۔ ”اے تو دغ ہو یہاں سے، کتنی خاندان کی اولاد۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔“ عاشر تک کراٹھ جاتا اور دادا جی جیت کا جشن مناتے۔

”دیے عاشر! اگر تیری صبحہ سے شادی ہو گئی تو ایک کام تو ہو جائے گا۔“ ہم سب بڑے تانیا کے

کمرے میں محفل لگائے بیٹھے تھے۔ ”تجھے گالیاں لگانے میں کمال ہو جائے گا۔“

احمد بڑا تھا۔ ”یکواس نہ کرو۔“ عاشر کو غصہ آیا۔ ”جی، ان لوگوں کی یہ ہی تو خاصیت ہے جب

تک ماں، بہن کا نام نہ لے لیں ان کی بات پوری نہیں ہوتی۔“ عاشر کو تڑا آ گیا۔

”اچھا، تو تم لوگ بڑے اچھے ہو، بزدل کہیں کے۔“ زین اور احمد نے عاشر کو بوجھ لیا۔

”ہاں گل، بزدل ہی تو ہے تو دور نہ اب تک کچھ نہ

کچھ بن چکا ہوتا۔“ عاشق کی بہن (شرہ) نے اسے لٹا رہا۔

”کیا کروں میں، سر پھاڑ دوں دادا جی کا؟“

وہ بولا۔

”دھمکی لگا کے دیکھ۔“ زین نے مشورہ دیا۔

”ہاں، اوئے عاشق تو کہہ دے کہ زہر کھالے

گا۔“ احمد نے زیادہ جذباتی ہو گیا۔

”نہیں بھئی کچھ ایسا ہو جو جگ بھی لگے۔“

”تیسری منزل سے چھلانگ لگا دے عاشق۔“

میں تو ویسے بھی بہت عقلمند تھی۔

”ٹھنڈا ہو گیا نا تو قربانی تجھے ہی دینا پڑے گی

کم عقل عورت۔“ وہ بولا۔

”عورت ہوگی تیری ماں، مردود۔“ میں نے

اس کے دو لگائے۔

”جھمی ٹھیک کہہ رہی ہے عاشق تو ایسے ظاہر کر کہ

جیسے کوڈ جائے گا پر کوڈے گا نہیں۔“ ہم سب نے مل

کر عاشق کی ایسی برین واشنگ کر دی کہ وہ اگلی صبح

چھت پر جا کے کھڑا بھی ہو گیا۔

”دادا جی! میں کوڈ جاؤں گا۔“ ڈر خوف سے

آواز خود کانپ رہی تھی۔

”کوڈ جا شاپاش۔“ دادا بولے۔

”پائے میرا پچھ، میرا لعل۔“ پھوپھو تو دادا پر

راشن پانی لے کر چل دوڑیں۔

”میں جاؤں گی اپنے پتر کا رشتہ لے کر، نہیں

کوئی جاتا نہ جائے۔“ بس پھر، عاشق کو تو صرف ایک

مکھنہ چھت سے لٹکانا پڑا بس۔ کس تو سارا پھوپھو

نے لڑا اور پھوپھو کی جب زبان چلتی ہے ناں تو

آرے کو بھی مات دے جاتی ہے۔

☆.....☆

آج ہمیں صبح کے گھر رشتہ لے کر جانا تھا۔

متوقع طوفان کے پیش نظر عاشق دادا ابا کی ہزار

گھوریوں کے باوجود خود ساتھ جا رہا تھا۔

”مجھے پتہ ہے آپ لوگوں نے وہاں جا کے کیا

تمنا لگاتا ہے۔“ واقعی اسے سب پتہ تھا، اسی تھالی کا

بند تھا وہ بھی، کوئی اور موقع ہوتا تو شاید دادا کسی کو بھی

نہ لے کر جاتے مگر اب جو عاشق نے پوچھا کہ ”کون

کون جائے گا“ تو جیسے اس کی عقل پہ ماتم کرتے

ہوئے کہہ دیا۔

”کون کون کیا مطلب .....؟ سب جائیں

گے۔“ عاشق باقاعدہ چکرا گیا۔

”دادا جی! کوئی بات ہے کرنے کی۔“ وہ

منمنایا۔

”اوئے زیادہ بکواس کی ناں تو یہیں بیٹھ

جاؤں گا، سمجھا۔“ عاشق نے ایک ایک کی تیش کریں

گھر بے سود۔

”بے غیر تو جب تمہارے اوپر یہ وقت آئے گا نا

تو پھر دیکھنا۔“

دادا نے باقاعدہ اسے ایک لسٹ تھمائی جس میں

وہ تمام کام درج تھے جو صبح کے گھر میں نہ ہو رہے

ہوں۔ بابا باقی قسم سے 25cm لمبی لسٹ بھی جو دادی

اور ماریہ کی امی کے تعاون سے تیار ہوئی تھی۔

”مجھ سے کوئی بجٹ نہ کرے ان کے گھروں

میں تصویریں نہ ہوں، دیپے نہ ہوں۔“ عاشق رونے

والا ہو گیا۔

”دادا جی وہ ان کا گھر ہے فٹ پاتھ نہیں۔“

دادا کا ایک ہی جواب۔ (بکواس نہ کراوئے) زرق

برق لباس دیکھ کر وہ اور کھول گیا۔ احمد اور علی سوٹ

پہن رہے تھے، زین موتیوں سے آراستہ جوڑا اور

ماریہ تو باقاعدہ شرارہ نکال لائی، عاشق کا اور کسی پر تو

زور چلانے، اس کی گردن دیو چلی۔

”چڈیل کچھ اور پہن لے، ورنہ ماردوں گا۔“

اور ماریہ کی ایک ہی جائے پناہ تھی ”دادا جی“۔

”ایک بار صبح کو فون کر کے یہ ساری لسٹ سنا

دے بہتر رہے گا۔“ عمیر وہ واحد بندہ تھا جو عاشق کے

ساتھ تھا۔ شاید اسے اپنا وقت یاد تھا 22 لوگ۔

دادا جی رشتہ لے کر جا رہے ہیں، بارات نہیں۔“ دادا نے ہوا میں اڑادی۔

دین میں بھر کے ہم لوگ صبحہ کے گھر پہنچے۔ سارا راستہ عاشر نے ایک ایک کی منٹیں کیں، سب سے پہلا اعتراض ان کے گھر پر ہوا۔  
”اُتنا چھوٹا گھر۔“ ٹمہنے چچی کی بات پر عاشر کھول گیا۔

”صرف چار افراد ہیں وہ، ہماری طرح پورا قبیلہ نہیں ہے۔“ اس موقع پر دادی عاشر کی ہنموا تھیں۔

”میں نے تو کہا وہی تھا کہ اس بڑھک ماری نوں نہ لے کے آؤ۔“ دومنٹ تو ان کے دروازے پر کھڑے لڑنے ہی میں گزر گئے۔

”اُو خدا کا واسطہ بس کرو۔“ عمیر نے کہتے ہوئے ٹیل بجا کی۔ دروازہ صبحہ کے والد نے کھولا، ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے دادا نے ان کا ایک تنقیدی جائزہ لیا اور نظریں خٹوں سے نیچے آتے پانچوں پہ ٹھہر گئیں۔

”دیکھ سنت دی خلاف ورزی۔“ انہوں نے باقاعدہ مڑ کر عاشر کو جتایا۔ صبحہ کے والد بھی شائد سو اسیر ہیں۔

”اوجی آپ ذرا ایک نظر اپنی فوج پر تو ڈالیں۔ آدھے سے زیادہ فرنگی کھاتے، پیئیں دیکھیں کہاں جا رہی ہیں۔“

توبہ، اتنی جرأت، دادا تو وہیں سے واپس مڑنے لگے۔ عاشر اور عمیر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اندر لے کر گئے۔ سارے گھر کا سکرے ہوا، چائے آئی تو دادا ایک بار پھر زبان نہ روک سکے۔

”اوجی اس کے اوپر کچھ پڑھا تو نہیں ہے، کوئی ختم دم۔“ عاشر نے کپ کوئی سودفہ اٹھایا اور بغیر پیچے نیچے رکھ دیا۔

”ہاں جی پڑھا تو ہے بسہ اللہ پڑھی تھی۔ وہ تو پڑھتے ہیں ناں آپ بھی۔“ تاک تاک کے سنانے لگے۔ صبحہ آئی تو ساقص اس میں نکلے۔

”اؤئے ہوئے، اس پہ مر گیا تو، یہ“ عاشر شرمندہ ہو کر آدھا بھی نہ رہا (لڑکی اچھی بھلی تھی) کھانے تک عاشر نے کوئی بحث نہ چھیڑنے دی۔ مگر کھانے والے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر دادا نے ایک تصویر ڈھونڈ لی۔

”فرشتے نہیں آتے اس گھر میں جہاں تصویریں ہوں، وہ بھی انسانوں کی۔“ صبحہ کے والد کی بھی شائد بس ہو گئی تھی۔ ”بمیر مرشد ہیں یہ ہمارے۔“

وہ بولے۔ ”دیکھ لے عاشر! یہ پیردوں فقیروں کے خاندان میں رشتہ جوڑے گا اب تو۔“

عاشر گھبرا گیا۔ ”دادا جی میری بات سنیں۔“ مگر دادا نے اب اس کی کہاں سنی تھی۔

”لو جی تم جیسے بے فقیروں سے تو ہم فقیر بھلے۔ سنت پہ چلتے ہیں ہم، سنی ہیں سنی۔“ دادا بھڑک گئے۔ ”شر رو کتارہ گیا۔“

صبحہ الگ ہاتھ رکھ رکھ کر اپنے باپ کو چپ کروائی رہ گئی مگر..... وہاں سنی، وہابی کی ایسی بحث چھڑی کہ برادری تو کہیں اندر ہی بہہ گئی۔ الامان الحفیظ۔ ادھر سے ہم دادا کو گھنٹنے اور ادھر سے صبحہ اور اس کا بھائی اپنے باپ کو۔ توبہ توبہ اچھا خاصا لڑ بھڑک دادا باہر آ گئے۔ عاشر تقریباً رونے والا ہو گیا۔

”انگل جی بات تو سنیں، کیا ہو گیا۔“ صبحہ کی آواز سن کر دادا ایک دم رکے۔ ”بھیری گل سن کڑیے! تو پڑھی لکھی ہے، اچھے برے کی تیز ہے تجھے، پھر یہاں آ کر میری عقل کہاں چلی گئی، کبھی سوچا ہے تو نے کہ یہ ویاہ کر کے تجھے کہا ملے گا۔ ایک خاندان ساری عمر ایک لڑکی کو عزت نہیں دے

گی۔ میری قبر میں، میں ہی سوؤں گی آپ نہیں۔ تو پھر فکر بھی مجھے ہی ہونی چاہیے ناں۔ شادی کے بعد میری پہلی اطاعت اپنے شوہر کی ہوگی اور بس۔ خدا نہ کرے شرک تو نہیں ہوں میں، کلمہ پڑھتی ہوں نماز پڑھتی ہوں۔ یہ سب مجھ سے میرے دل نے کہا ہے اکل جی وہ دل جس میں خدا رہتا ہے اور خدا کو تو آپ بھی مانتے ہیں ناں خدا تو آپ کے دل میں بھی رہتا ہے ناں، میرا زور اپنے ماں باپ پر چل سکتا ہے جو میں نے چلا لیا۔ اب اگر آپ مجھے ٹھیک سمجھیں تو کل ہم آجائیں گے ورنہ.....“ وہ ذرا دیر کو رکی۔ ”ورنہ یاد رکھیے گا کہ برادری اور مسلک کا یہ فرق آپ مجھے کسی کتاب میں نہیں دکھا سکیں گے۔“ آج صفیہ، دادا کو خاموش چھوڑ گئی تھی۔

☆.....☆

”ہوں..... کیا لگتا ہے آپ کو کہ کیا ہوا ہوگا۔ ہاں جی بالکل ایسی تقریر سن کر تو سنی و دہابی مولوی خاموش رہ جائیں تو یہ تو پھر ہمارے دادا جی تھے۔ اس کے جانے کے بعد بولے۔ ”اس کے آنے کے بعد عمیر کی قیمت کم ہو جائے گی اس سے زیادہ اچھی تقریر کرتی ہے یہ۔“

رات ہی صغد کے گھر فون کر دیا نئے سال کا پہلا دن عاشر کے لیے خوشیاں ہی لے کر آیا۔ کاش یہ بات تمام لوگ سمجھ لیں کہ ہر ایک نے اپنی قبر میں سوتا ہے اور اس قبر میں جانے کے لیے نامہ اعمال تیار کرنا بھی ہر فرد کا اپنا ذاتی کام ہے۔ کوئی دوسرا اس کے لیے یہ سب نہیں کرے گا۔ دوسروں کا بس ایک کام ہے راستہ دکھانا اور بس!!

☆.....☆

پائے گا۔ پوری زندگی بھی تو خدمت کرے تو ماریہ اور شمینہ جیسی شفتت نہیں کما پائے گی، حزاروں پر جانا بند، بیروں کی بیعت بند، قبروں پر جانا بند دو عقیدوں کے درمیان پھنس جائے گی تو۔ ہمارے جیسا بننا چاہے گی تو کھر والے ناراض۔ کیسے بیچہ کر کھایا کرے گی ختم کے چاول؟ کیسے منایا کرے گی اپنے پرداداؤں کی برسی، کہنا بہت آسان ہوتا ہے پتہ کی کہ محبت کے سہارے سب خود ہو جائے گا پر نہیں ہوتا۔ سمجھ لے اس بات کو، یہ کم عقل تو سمجھتا نہیں ہے۔“

دادا جی شاید حرف بہ حرف صحیح کہہ رہے تھے۔

☆.....☆

واپسی پر ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ سب خاموش۔ عاشر سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اگلا پورا دن گزر گیا مگر عاشر کمرے سے نہ نکلا۔ کل نئے سال کا سورج طلوع ہونا تھا۔ عصر کا وقت دعا جب ماریہ اور زین چلاتے ہوئے پھوپھو کے پورٹن میں آئے۔

”عاشر! صغد آئی ہے۔ عاشر.....“ عاشر حیر کی طرح اپنے حجرے سے باہر آیا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

وہ سیدھی دادا جی کی طرف گئی۔ ”اکل جی! بہت سوچا ہے میں نے، آپ کی ساری باتیں درست ہیں مگر پتا ہے ان ساری باتوں کا میرے دل نے کیا جواب دیا۔ دل نے کہا کہ پھر کیا ہوا۔ بخاری شریف میں تو نہیں دیکھا کہ برادری سے باہر رشتے جوڑنا گناہ ہے۔ دل نے کہا کہ عزت کا معیار برادری نہیں، انسان کا کردار ہوتا ہے۔ آپ بے شک نہ مانیں مگر میں مانتی ہوں اکل جی کہ میری خدمت مجھے اس گھر میں عزت ضرور دلائے گی کیا ہوگا جو ختم والے چاول میں اکیلے کھاؤں





سرمایہ کی دھیمی دھوپ نے ہر شے کو نکھارا ہوا تھا، مچن  
میں لگا بیڑ، چھبائی چڑیاں، مالٹوں کی ٹوکری اور دبیر  
کی اداسی..... سارا منظر واضح تھا۔ ہر کوئی مصروف تھا  
رومہ کو آج کھلی فراغت نصیب ہوئی۔ وہ اپنی جلد کے  
معالے میں کافی حساس تھی۔ اب بھی چہرے پر  
ماسک لگائے، آنکھوں پر کھیرے کے قتلے رکھے،



سائے پردہ تھا گر کان تو کھلے تھے۔  
 ”زین! تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے فحورث  
 نگر کے گانے کو بگاڑنے کی۔“ اعصاب تن پکے تھے  
 اور سانس تیزی سے آ رہی تھی زین تیری خبر نہیں۔  
 ”دیکھو ہوگئی۔“ وہ اسے چڑانے لگا۔  
 ”میں تمہیں کہہ رہی ہوں مجھے غصہ نہ دلاؤ،  
 ماسک لگا کر خود کو ریلیکس رکھتے ہیں ورنہ چہرے پر  
 جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ تبھی میں تمہارے ساتھ سکون  
 سے بات کر رہی ہوں ورنہ.....“  
 واہ رے مصومیت۔

بالوں کو سفید تو لپے میں لپیٹے، جسم کو بالکل ڈھیلا  
 چھوڑے کرسی پر بیٹھی دبیر کی دھوپ سینک رہی تھی۔  
 ”زین! سمسٹر کیسا رہا؟“ صحن میں آتی رابی کی  
 آواز ابھری۔ زین بھی ابھی گھر میں نمودار ہو رہا تھا۔  
 ”جینے لگا ہوں پہلے سے زیادہ، پہلے سے زیادہ  
 کھانا کھانے لگا ہوں۔“ لہک کر گاتے ہوئے وہ رکا  
 اور رومہ کو کھانا طلب کیا۔  
 ”او..... او کیا تھلاس کا میوزک دومہ تم بجاؤ وہ.....“  
 سدا کا کانوں کو بگاڑنے والا زین عادتاً کہہ رہا  
 تھا۔ رومہ کے ماتھے پر شکن ابھری، آنکھوں کے



”ورنہ تم مجھے قتل کرو تیں ہاؤ فی۔“ زین دل کھول کر ہنسا۔

”دیکھا میں کہتی تھی نا کہ تم میرے دشمن ہو، تبھی غصہ دلار ہے ہو کہ میرے چہرے کو جھریاں ڈھانپ لیں۔“ آواز میں بی سالی تھی۔ زین کو اپنی بہن سے وقتی ہمدردی ہوئی، رابی میگزین میں معروف ہو چکی تھی۔

”جھریاں تو نہیں مگر ماسک ضرور تمہارا چہرہ ڈھانپتا ہے۔“ رابی کی زبان میں گلدی ہوئی۔

”خبردار! میری بہن کو کچھ کہا۔“ زین اچانک

رومہ کا حمایتی بن گیا۔ اور پھر رابی اور زین کے درمیان جنگ عظیم سوئم شروع ہو گئی۔ کچھ دیر برداشت کر لینے کے بعد، رومہ نے ناگواری سے گھبرا کر آنکھوں پر سے کھیرے کے قتلے اتارے۔ اس کے ہوش کم ہو گئے۔ زین کی آنکھیں بند تھیں اور کچھ فاصلے پر بیٹھی رابی کی آنکھیں بھی بند تھیں، مگر ان کا باقی جسم ساکت ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو مسلسل چڑا رہے تھے، مگر زین نے آنکھیں بند کیس کے کہیں وہ رابی کو دیکھ نہ لے اور رابی کا بھی یہی حال تھا۔

”بد تیز، جاہل۔“ رومہ بوڑی۔

”تم لوگوں نے شرم کو بھی محسوس کیا ہے، اتنے

بوڑے ہو گئے ہو مگر متخل نام کو نہیں۔“ رومہ نے ناگواری سے کہا۔ وہ ایسی حرکتوں سے سدا کی الر جبک تھی۔

”تم ادھار دے دو۔“ رابی کہہ کر ٹھہری نہیں۔

زین بھی چلا پٹا۔ وہ کھڑی کھولتی رہی۔

”بے شرم، ڈھیٹ، سبکی بد تیز۔“ صرف رومہ

تیزدار۔“

☆.....☆

سردیوں کی وہ لمبی چٹھیاں شروع ہونا چاہتی تھیں جن کا سال بھر بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہے، بچے بالے بھی خوش تھے۔ امی نے آج ہی کھانے کی میز پر خوش خبری سنائی تھی۔

”تمہارے ابو کی بوا کا فون آیا تھا آج، انھوں نے

تمہارے ابو کو رضامند کر لیا ہے کہ تم لوگ دبیر کی چٹھیاں ان کے ہمراہ گزارو گے تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ وہ بھائی جان سے بات کریں گے کہ رابی اور سعد وغیرہ کو بھی تیار کر دیں۔“ امی کی بات پر ان کی باپھیں کھلیں تو آنکھوں نے بھی پٹ پٹنے کو ضد باندھ لی۔

”امی! صدقہ جاؤں آپ کے۔“ زین نے تو ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال لیں، تاہم رومہ کو حیرت دور کرنے میں وقت لگا۔

”اور کون جائے گا امی؟“ سوال رومہ کی طرف سے تھا۔

”تم سب بچے ہی جاؤ گے بائیں اور تمہاری تائی امی میں سے تم لوگوں کے ساتھ کوئی چلا جائے گا۔“

”ہوں..... بہت خوب۔“ زین پر جوش ہوا۔

”مگر امی یہ زین، سعد اور رابی بہت بد تیز کرتے ہیں، ہر کسی کے سامنے اپنی اوٹ چٹانگ حرکتوں سے انسٹل کراتے رہتے ہیں، ان لوگوں کے زرا کان کھینچ کر بھیجے گا۔“ رومہ نے دل کی بات کب بھی دل میں رکھی تھی۔

”تو تم بھی اوٹ چٹانگ حرکتوں کو انجام دیا کرو،

پھر کہاں کی انسٹل۔“ سعد نے حاضری دی۔ اپنے

مخصوص انداز کے ساتھ رومہ بھی ان تینوں کی ہی ہم

عمر تھی تاہم خود کو زرا تیز دار اور ان سب کو بہت بد تیز

سمجھتی تھی، بات بچ بھی تھی مگر۔

”تم تو اپنی زبان بندی پر کھو بجائے۔“

”مجاے شرم سے پانی پانی ہونے کے، بے شرمی

اور ڈھٹائی سے برف ہو گئے ہیں۔“ سعد نے اس کی

بات اچکی۔

”یہی کہنے لگی تھی نا غالباً مس رومہ۔“ زین نے

اشارے سے سعد کو داد دی۔ رومہ ”اوں“ کہہ کر منہ

بھیر گئی۔

”چی جان ابو ی جاندار خبر سنائی ہے ذرا جاندار

ہاںک کو توڑا۔ اور پھر اگلی ہی صبح سب بوا کے گھر کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بوا خاندان بھر میں کافی کجوس واقع تھیں، مگر وہ بھی شرم سے پانی ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے برف ہونے والے تھے، بوا کیا چہرہ تھیں۔

گھر سے بڑا کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ تاہم نصیحتوں کی ٹوکریاں اور مس نصیحت (رومہ) ان کے ہمراہ ہی تھی۔ بوا کا گھر یہی تھا۔

”اب منہ کیوں لٹکائے کھڑے ہو، دروازہ بجاؤ۔“ رومہ کو چاںک سے اخلاقیات کا دورہ پڑا تھا۔ ”تمہارے ہاتھ ٹوٹے ہیں۔“ سعد اس سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ رومہ نے ایک خطرناک گھوری سے اسے نوازہ اور دستک دی۔ تقریباً ان ہی کی ہم عمر لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ اور فرداؤسپ سے ملنے کے بعد ابھی تک دروازے ہی میں کھڑی تھی۔

”آپ کے ہاں ملنے ملانے کے علاوہ بھی کوئی رسم ہوتی ہے؟“ زین نے رازداری سے پوچھا۔ نا سمجھ لگا ہیں اس کی جانب انھیں، رانی اور سعد کی لمبی چھوٹ گئی۔ ابھن بڑھنے لگی اور رومہ کی گھوریاں بھی۔ ”ہم یہاں سے ہی لوٹ جائیں؟“ رانی نے پوچھا۔ لڑکی شاید حد سے زیادہ احمق تھی یا ہوتی بن رہی تھی۔

”آپ کے ہاں مہمان کو دروازے سے ہی ٹر خا دیا جاتا ہے۔“ سعد لمبی دباتے ہوئے بولا۔ ابھن سمجھی، چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور پھر لمبی چھوٹی۔

”اوہ..... اچھا اچھا آئیے۔“ راستہ دے دیا گیا۔ ”مہربانی جی“ زین نے لقمہ دیا۔ بوا صحن ہی میں پلنگ پر لیٹیں دھوپ سینک رہی تھیں۔

”میرا نام نازی ہے اور یہ رہی بوا۔“ نازی کو گویا یاد آ رہی تھی۔

ملنے ملانے کا سلسلہ تمام ہوا تو بوا کو خاطر، مہارت

سنا کھانا بھی کھلا دیں۔“ سعد، زین کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

رانی سر تک چادر تانے دھوپ میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور رومہ سعد اور زین قریب بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”تمہاری امی تو کافی فیلنگولیس واقع ہوئی ہیں۔ بے چاری رانی کب سے ”دھوپ ہڑتال“ کیے ہوئے ہے مگر نورسپوٹس۔“ زین گویا ہوا۔

”یہ آئیڈیا تمہارا ہی تھا اور کتنا بونگا ہے۔ بھلا اس قدر سردیوں میں دھوپ ہڑتال کرنے سے امی کو کیا فرق پڑنے والا ہے، تمہیں کوئی ایسا آئیڈیا دینا چاہیے تھا کہ مثلاً دھوپ میں پڑے رہنے کے بجائے اے سی روم میں لیٹی تو امی کو اس کی فکر ہوتی۔“ زین کافی سمجھ داری سے بولا۔ رانی تڑپ کر اٹھی۔

”تم سب دماغ کے بغیر ہی ہو، کیسے بے مروت کے مجھے AC میں لٹا رہے ہو، کوئی ڈھنگ کا آئیڈیا تو ہے نہیں۔“

”سوچتے ہیں۔“ رومہ بولی۔

”امی جان مجھے تم لوگوں کے ساتھ بوا کے ہاں بھیٹا نہیں چاہتیں، بقول ان کے مجھ میں تمیز نہیں اور اگر میں نے تم لوگوں امی کو اموشنل کرنے کا آئیڈیا مانگ ہی لیا، تو کیسے ہو سکے آئیڈیا زدے رہے ہو، دھوپ میں لیٹ جاؤ، AC میں لیٹ جاؤ۔ اب تو دھوپ میں لیٹ کر میں پریس ہی ہو چکی ہو۔“ رانی دانت پیس کر بولی۔

”چھوڑو ہم خود تانی امی کو منانا لیتے ہیں۔ ان پر ایسی ترکیبوں کا اثر نہیں ہونے والا۔“ رومہ نے بات ہی ختم کر دی۔

”میں نے دیکھا انھیں منا کے ہر اک ترکیب لگا کے، ہر نئے کو آزمایا کہ پروہ نہیں مائیں..... ہنگ اور.....“

”شٹ اپ۔“ رومہ نے ناگواری سے زین کی



کا خیال آگیا۔ ”جائنازی! مہمانوں کے لیے کچھ چائے پانی لا۔“

حکم کی تعمیل ہوئی۔ رومہ ان تینوں کی گھبراہٹ پر جربز ہو رہی تھی۔

”بدنیزوں! یہاں ہی سدھر جاؤ، شرم نہیں آتی پہلی دفعہ آئے ہو کیا سمجھیں گی بوا بھی۔“ رومہ آہستگی سے بولی۔

”مہربانی ہوگی اگر اپنا لکچر خود تک ہی محدود رکھو۔ اگر یہاں بھی استانی بننے کی کوشش کی تو قریبی نہیں دھکا دے جاؤں گا جاتے ہوئے۔“ زین کوفت سے پولا۔ احساس تحقیر سے رومہ غصے سے بے قابو ہونے لگی مگر ضبط رکھا۔

”تم لوگوں کو تو بچو! خوب سبق دلاؤں گی۔ یاد رکھو گے رومہ کبھی۔“ وہ دانت پیستے ہوئے سوچنے لگی۔

چائے پیش کی جا رہی تھی۔ ان سب کو زوروں کی بھوک لگی تھی۔ مگر یہ کیا پتلی چائے اور ایک پلیٹ میں اسکٹ۔ سب کو حیرت ہوئی۔ کسی نے بھی انہی چائے پنا شروع نہیں کی۔ وہ گلاب جاسن، رسلانی، سلاکس، بنگو، کھوئے دالی برنی، چکن پکڑے، بسوسے اور کبابوں کے بھی منتظر تھے۔ چائے ٹھنڈی ہوتی رہی مگر کچھ اور نہ آیا۔ آخر بوا کو کہا پڑا۔

”اے بے بچ! پانی کیوں نہیں رے چائے، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ حکم تھا اور کچھ مروت، گھونٹ گھونٹ، کڑوا اثر بت حلق سے اُتارا گیا۔ ابھی حیران ہونے کو اور بھی بہت کچھ تھا۔

☆.....☆

نازی ان سب کی حیرانگی بھانپ کر خوب ہنسی تھی، وہ جانتے تو تھے کہ بوا انجوس ہیں مگر اس قدر، پہلی دفعہ آئے مہمان کی تو ہیں۔

”بوا سے اگر خاطر مدارت کی توقع لگائے بیٹھے ہو تو غلط سوچ رہے ہو۔“ نازی کافی منہ پھٹ تھی۔ سب نے بیک وقت اسے گھورا۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں، بریانی بنا لیتے ہیں۔“ وہ اسید کی ڈوری کو تھام کر بولی جو بوا جانے انجانے میں اس کی جانب بڑھا چکی تھیں۔ ”آپ کے ہاتھ کی بریانی کی تو بوا ابھی تک گھر میں مثال دیتے رہتے ہیں۔“ زین نے لقمہ دیا۔

”مجھے تو نہیں یاد پڑتا کہ کبھی میں نے بریانی بنائی

ہو اور وہ بھی تمہارے پاؤں کھائی ہو۔“ بوا ان کے دام میں آنے والی نہیں تھیں۔  
 ”چلیں ہم دیا کریں گے اپنے بچوں کو آپ کی مثالیں۔“ سعد لا پرواہی سے کہتا ہوا چھت کی طرف جانے والی میز حیاں چڑھنے لگا۔

☆.....☆

سعد موہاگل پر کوئی مووی دیکھ رہا تھا، بریانی دم پر تھی۔ رابی بچن میں کھانے کی تیاری کروا رہی تھی۔ رومہ بھی چھت پر چلی آئی۔  
 ”اتنی بوگلی مووی دیکھ رہے ہو، بندہ کوئی ڈینٹ سی اسٹوری والی مووی دیکھے۔“ رومہ نے اسکرین پر نگاہ دوڑاتے ہی ناک چڑھائی۔

”دسمبر کے بعد ہماری مفتی ہونے والی ہے، اور بہار کی آمد کے ساتھ ہی خزاؤں مطلب شادی کی نوید بھی سنادی جائے گی، تب مس رومہ، ہمیں اتنی بوگلی مووی دکھاؤں گا کہ تم ڈینٹ، ناکس، اسٹوپ اور بوگلی جیسے ورڈز کو اپنی ڈکشنری سے ریو کر دو گی۔“

سعد طنز سے بولا۔ رومہ بھڑک اٹھی۔  
 ”شکل دیکھی ہے اپنی میں تم جیسے کسی غیر مہذب سے شادی ہرگز نہیں کروں گی، نان سیس، تم سے تو میری جوتی بھی شادی نہ کرے۔“  
 ”اب ذرا اپنے لفظوں پر غور کرو، تم کتنی مہذب ہو؟“ سعد کا وہی ساٹ لہجہ۔  
 ”اسٹوپ نہ کہیں گے تم تو میرے منہ ہی نہ لگو۔“ وہ

چلا اٹھی۔  
 ”سیم ٹو پو۔“ آرام وطمینان سے جواب آیا۔

رومہ جل جھن گئی، وہ جو بریانی کا بلاوا دینے آئی تھی، پتہ چلتی ہوئی نیچے چلی گئی۔  
 ”چھ سب کھانے کے منہ بیٹھے تھے۔“

”غائب ہم نے بریانی کا کہا تھا۔“ زین نے آلو والے جاؤل دیکھ کر منہ بتایا۔  
 ”بوا کو لڈ رنگ بھی لینے آئیے“ سعد نے ہانک

لگائی۔ بوا بڑبڑانے لگیں۔ ابھی وہ انکار کرنے والی تھیں کہ نازی بولی۔

”بوا! فریج میں پڑی ہے، آج جنگوا کی تھی میں نے۔“ وہ ہنسی دبا کر بولی۔ بوا ذات پیتے ہوئے چلی گئیں۔

”بوا! امیری پلیٹ میں ہڈی والے آلو (بوٹیاں) ڈالے۔“ رابی مسکرائی۔ رومہ نے اسے گھور کر دیکھا،

وہ کب سے ان کی بدتمیزی برداشت کر رہی تھی، مگر سعد سے تازہ لڑائی ہوئی تھی سو بول نہیں رہی تھی۔ کولڈ ڈرنکس آئیں۔ بوا نے ایک لیٹر کوک کوساٹ گلاسوں

میں ڈالا تھا۔ اتنی سردی میں اتنی برف..... کوک اپنا اصلی رنگ کھو کر شیشے کے گلاسوں میں سے شہری نظر آ رہی تھی۔

زین نے ”چہ“ کہہ کر افسوس سے گلاس کو دیکھا اور پھر بوا کو دیکھا۔ مگر ان کی ڈھٹائی عروج پر تھی۔

”بوا! رات کو کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ نازی بولی۔

”رات تو دور کی بات پہلے شام کی چائے کے بارے میں سوچا جائے۔ کیوں نا بوا! پکا پکلا اہتمام کر لیں۔“ رابی مسکرائی۔ بوا کی چٹنی چٹنی آواز ”ہاں“ میں نکلی۔

”شام میں چائے کے ساتھ ساتھ کاجر کا حلوہ، دہی بھلے اور کباب بنا لیتے ہیں۔ فروٹ کشر ڈرات

کے کھانے میں ہو جائے گا، اور پھر سب مل کر بوا کی طرف سے آئس کریم کھانے جائیں گے۔“ زین جوش سے بولا۔ تاہم بوا کو چرانے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیل رہی تھی بوا جوتی لمبی لسٹ پر ہونٹ سی دیکھ رہی تھیں آخری فرمان پر تو اچھل گئیں۔

”اے، ہے لڑکے! میری طرف سے آئس کریم حیرت سی کیوں؟ میرا کوئی پرائز باٹھ نکلا ہے۔“ حیرت سی

حیرت۔ بے مروتی حد سے سوا۔  
 ”بوا! ہم آخری بار آپ کے ساتھ آئس کریم کھانا

چاہتے ہیں تو مضائقہ کیا ہے۔“ سعد مزنی سے بولا۔ بوا  
منہ لٹکائے بیٹھی رہیں رومہ بھنائی رہی۔

☆.....☆

”بدتمیز لڑکی میرے بھائی پر لائن مارتی ہے۔“  
محسن میں زین، رابی اور نازی کو دیکھ کر برآمدے میں  
کھڑی رومہ بڑبڑائی۔

”ہینسل سے یا چین سے؟“ قریب سے سعد کی  
آواز ابھری۔ رومہ کی تیوری چڑھ گئی، جواب دینا  
ضروری نہ سمجھا۔ رابی مرغی کے انڈے نوکری میں لیے  
برآمدے کی طرف آ رہی تھی۔ زین کو شرارت سوچھی،  
اس نے ایک مرغی کو رابی کی طرف اچھالا۔ مرغی، رابی  
کے سر پر لگی اور عمل کارو عمل ہوا۔ بالکل اگر مخالف سمت  
میں، نیوٹن کا قانون امر ہوا۔ جواباً انڈوں کی نوکری  
زین کی طرف اڑی، چیخیں بلند ہوئیں دونوں کا برا  
حال تھا، انڈے ٹوٹ چکے تھے۔ زین کے جسم پر جابجا  
انڈے لگے ہوئے تھے اور رابی کے بال ایسے جیسے بم  
بلاست ہوا ہو، دونوں پوکھا گئے اور جواباً ایسی دھواں  
دار لڑائی ہوئی (صرف زبانی کلامی) کے لیے۔ سعد  
نازی ہنس رہے تھے، ہنسی تو رومہ کو بھی آ رہی تھی، مگر  
چھپائے رکھی اور پھر زین اور رابی بھی ہنسنے لگے اور دل  
خھول کر ہنسنے بوائے سر پٹ لیا ان کا اتنا نقصان ہو گیا  
تھا، دسمبر کی آخری شام میں تھیں، وقت آگے  
بڑھ رہا تھا رومہ کا غصہ بھی بڑھ رہا تھا۔

”سدا کے بدتمیز ہوتم دونوں، شرم نہیں آتی، بوا کے  
سارے انڈے توڑ کر رکھ دیے۔“ وہ روانی میں بولتی  
چلی گئی۔

”مانسڈ یو لینگو ج مس رومہ! انڈے مرغیوں کے  
تھے۔“ زین اسے تہانے کو بوا کے گلے میں بازو  
جھانک کر ہوتے ہوئے بولا۔ ان کا غصہ بھی تو دور کرنا ہی  
تھا۔ بوانے اسے جھٹکے سے پرے کیا۔

”زیادہ پرے رہ کر بات کرو بچے۔“ زین کے جسم  
سے انڈوں کی مہک آ رہی تھی۔ سب نے بمشکل ہنسی

دہائی۔

”خبردار! آئندہ گڑبڑ کی، میں ہرگز کوئی لحاظ نہیں  
کروں گی۔“ بوا کی برداشت بس اتنی ہی تھی.....  
برداشت بھی بے وفائی کر چکی تھی۔ بوا کا تو کوئی قصور  
نہیں تھا۔

”بوا! چھوڑیں انھیں میں گھر جا کر ابو کو ان سب کی  
شکایت لگاؤں گی۔“ رومہ، بوا کی اچھی مہمان بن کر  
بولی۔ رابی نے کوفت سے اسے دیکھا۔

☆.....☆

”زین! آج امی کا نون آنا تھا کہہ رہی تھیں کہ  
جنوری کے پہلے ہفتے انجمنٹ ہے۔ اپنے لیے ڈریس  
سلیکٹ کر لو، میں اتنی دیر سے چپک کر رہی ہوں مجھے  
تو کوئی پسند ہی نہیں آ رہا پلیئر ملب می۔“ رابی نے  
موہاگل زین کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ نیٹ سے  
ڈیزائن کیے ہوئے مختلف ڈیزائن دیکھ رہی تھی۔  
”غائباً رابی کی ممکن زین سے ہونے والی ہے۔“  
مالٹنی کی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے نازی بولی۔  
”اور رومہ کی سعد سے۔“ دوسری پھانک بھی منہ  
کے اندر سب جھپٹ پر بیٹھے دھوپ سے لطف اندوز  
ہورہے تھے۔

”اور واہ بھئی رابی۔“ فیانسی صاحب کی پسند کا  
ڈریس بوانے کا اچھا بہانہ بنایا۔“ نازی کی زبان پھر  
سے پھسلی۔

”مجھے بہانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ممکن تو  
بعد کی بات، زین میرا بوا اچھا دوست ہے۔ میں اس  
سے مشورے کے بغیر اپنا اتنا اہم ڈریس کیسے بھاگتی  
ہوں۔“ رابی کے جواب پر نازی کو افسوس ہوا۔ وہ تو  
مشرقی لڑکی کے چہرے کے ان رنگوں کو دیکھنے والی تھی  
جو ممکن شادی کے نام پر اس کے چہرے پر چھاتے  
ہیں مگر رابی کے معاملے میں ایسا کچھ نہیں تھا وہ کافی  
اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہے رومہ۔ یہ شرم سے پانی نہیں،

ڈھٹائی سے برف ہوتے ہیں۔“ نازی بڑبڑائی۔  
 ”رومہ! تم نے کس کی پسند کا ڈریس بنانا ہے؟“  
 نازی کی زبان کو بریک بھی لگ ہی نہیں سکتا۔ No  
 Response  
 رومہ نے بھی اتنی ان سنی کر دی۔

”بہری ہو گئی ہو تم؟“ نازی پھر سے بولی۔  
 ”تم چپ نہیں رہ سکتیں؟“ رومہ چڑھ گئی۔  
 ”لک اٹ، یہ مجھے اور زین دونوں کو پسند آیا  
 ہے۔“ رابی نے موبائل رومہ کی طرف اچھالا اس کی  
 نظروں میں ستاکش اتری۔

”بہت اچھا ہے۔“ رومہ نے نازی کو موبائل  
 پکڑایا۔ وہ کافی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔  
 ”رومہ! میری مانو تم بھی ایسا ہی بنالو۔“ رابی  
 نے کافی خلوص سے مشورہ دیا۔ رومہ نے اس کی  
 طرف دیکھا۔

”میں نے اس کے متعلق کچھ سوچا نہیں۔“  
 ”تو سوچ لو، چند دن تو باتی پیرا۔“ رابی جانتی تھی  
 کہ وہ اس گفتگو سے خوش نہیں ہے تب ہی ایسا سرد سا  
 رد عمل کر رہی ہے۔ اس نے گفتگو سے سعد کی طرف  
 دیکھا۔ وہ اس کا بھائی تھا اور وہ اپنی دانست میں اس  
 کے احساسات خوب سمجھ رہی تھی مگر مایوسی ہوئی رومہ  
 اگر لاپرواہ تھی تو پرواہ اس طرف بھی نہیں تھی وہ اس  
 سارے قصے سے دور موبائل میں مگن تھا۔

”رومہ! ابھی دیکھ لو، اے پہلے ہی اتنا غصہ کر رہی  
 تھیں کہ ذرا سا کام نہیں کر سکیں تم لوگ، نہیں تو میں  
 سعد سے پوچھ لیتی ہوں۔“ رابی پھر سے بولی۔  
 ”مجھے دھکانے کی ضرورت نہیں۔ جس نے پہننا  
 ہے اس سے پوچھو۔“ سعد کہتا ہوا چلتا بنا۔ رابی دانست  
 پیش کر رہ گئی۔

☆.....☆

”اتنا اداس کیوں ہو رہی ہو؟ کتنی فضول سی بات کو  
 لے کر اتنا نہیں ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے

کہ سعد کوئی سٹرل سا لڑکا نہیں اور ہم کون سا سدا  
 کے بدتمیز ہیں، بس کبھی کبھی ہنسی مذاق کو دل  
 کرتا ہے۔ کوئی زیادہ فرق تو ہے نہیں سعد میں اور تم  
 میں۔ ایک ہی گھر سے ہو، ایک ہی کالج سے پڑھے  
 ہو، عمریں بھی ایک جہی ہیں اور مزاج تم نے خود اپنے  
 خراب کر رکھے ہیں۔“ رابی، رومہ کے پاس بیٹھ گئی۔  
 ”سٹرل تو خیر سے آج کل سعد بھی بہت ہو رہا  
 ہے۔ کوئی لفت ہی نہیں۔ جانے سمجھتا کیا ہے خود کو  
 ٹان سینس۔“ رومہ محض سوچ مکی بولی بس اتنا ہی۔  
 ”تمہارا بھائی ہے اس لیے ہی تمہیں پسند ہے،

میں ہی بری ہوں۔“  
 ”بات اگر بھائی کی ہو تو مجھے تو زین بھی پسند ہے  
 اور بھائی وہ تمہارا ہے۔ تم اس کے بھی سر پر چڑھی  
 رہتی ہو۔ بات صرف سوچ کی ہے اور تم سب کو غلط ہی  
 سوچا کرو۔“ رابی پہلے تو ہنسی مگر پھر سنجیدگی اوڑھ لی۔  
 ”امی نے چچی کو کہہ دیا تھا۔ میں نے اپنے جیسا  
 ہی تمہارا ڈریس آرڈر کیا ہے اور اتنی ٹینشن نہ لو، کئی  
 دن سے تم نے فیشن بھی نہیں کیا۔ کوئی ماسک نہیں تم تو  
 کبھی منہ سے ماسک اترنے ہی نہیں دیتی تھیں۔“  
 ”آج کل اس لیے نہیں لگاتی کہ بڑی ٹینس ہوتی  
 ہے، لہذا کہیں جھریاں ہی نہ چہرہ ڈھانپ لیں۔“  
 سعد نے رابی کی بات اچھی رابی اٹھ کر چلی گئی اور وہ  
 اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”سنو! کتنی سے انکار کب تک کرنے والی ہو؟“  
 اس کے سوال سے رومہ کے چہرے پر حیرانگی چھائی  
 مگر اس نے دھیان نہ دیا۔  
 ”خیر مجھے تو کبھی چھکی ہو بڑوں کی بابت استفسار  
 کر رہا ہوں۔“ حیرانگی پر قرار کھی۔ سعد ذرا سا  
 مسکرایا۔ وہ بڑے اطمینان سے بول رہا تھا جیسے اسے  
 کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔

”زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج کل  
 تمہارے چہرے کے تاثرات تو کچھ ایسا ہی عیاں۔



کر رہے ہیں۔“ رومہ نے منگلی دکھائی اور رخ موڑ لیا۔  
 ”میرا سر کھانے کی ضرورت نہیں۔ میری مرضی،  
 میں جو جی میں آئے وہی کروں برائے مہربانی مجھے  
 کچھ دیر کو اکیلا چھوڑ دو۔“ بے رخی سے جواب آیا۔ کچھ  
 دیر پہلے جو جلیسی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ سعد کی  
 آمد کے ساتھ ہی دم توڑ گئے۔ دل خواہ خواہ خوش فہم  
 ہونے لگا۔ سعد کندھے اچکا تا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ فرق  
 اب بھی اسے نہیں پڑا تھا۔ کم از کم اس کے تاثرات  
 سے تو یہی عیاں تھا۔

☆.....☆

”کبھی کبھی ہم دوسروں کو بات پر جس بات  
 پر سرزنش کرتے ہیں۔ وہ ہم میں خود اتنی وافر مقدار  
 میں موجود ہوتی ہے مگر ہمارا دھیان دوسروں سے بٹے  
 تو ہم خود میں جھانکیں۔“ سعد مسلسل رومہ کو سنائے  
 جا رہا تھا اور وہ محض ہوں کچھ کر نخوت سے سر جھٹک  
 دیتی۔ سال کی آخری شام تھی اور وہ واپس گھر کے  
 لیے بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔

”زین! اکول گئے کھاتے ہیں۔“ رابی کا دل لچلایا  
 تھا۔ سعد کو پسند نہیں تھے اور رومہ سڑک پر کھڑے ہو کر  
 کچھ کھانے کو بدلتہ تہذیب تھی۔ لہذا وہ دونوں ٹھیلے کی  
 طرف بڑھے اور وہ دونوں پیچھے کھڑے رہ گئے۔

”کیا ہے مجھ میں جو مجھے نظر نہیں آتا؟“ رومہ  
 حساب برابر کرنے کو خونخوار طور لیے سعد کو گھور رہی  
 تھی۔ سعد کا اسے چڑانے کو دل تو چاہا اس نے سوچا  
 کہ وہ کہہ دے وہ کون سا رومہ کو کہہ رہا ہے اور یہ رومہ  
 کو کیسے پتہ کہ وہ اسے کہہ رہا ہے۔ مگر آج سب ٹیکسٹر ہو  
 ہی جانا چاہیے تھا۔

”تم میں بدلتہ تہذیب ہے۔ بدلتہ تہذیب ہے، بونگی ہو تم  
 اسٹوڈنٹ لڑکی۔“ رومہ حیرانگی سے اس کے الفاظ سن  
 رہی تھی۔

”ماتا کہ میں بدلتہ تہذیب ہوں، بدلتہ تہذیب ہوں مگر خود  
 کون سا تم میں تہذیب آگئی ہے۔ ہم تو پھر کبھی کسی کی بات

کا آرام سے جواب دے دیتے ہیں اور تم جب بھی  
 میں نے تم سے بات کی تم نے مجھے سیدھے منہ جواب  
 نہیں دیا۔ جانے اتنی مرچیں کہاں سے کھا لیتی ہو۔ بوا  
 سے آکس کریم کی فرمائش کرنا ہی بدلتہ تہذیب نہیں، بلکہ  
 جب کسی کو کہہ دیا جائے کہ میرا سر کھانے کی ضرورت  
 نہیں، یہ بھی بدلتہ تہذیب ہی ہے۔ کسی کو بات پر  
 ٹوکنے سے تمیز نہیں آجانی بلکہ خود عمل کرنے سے آتی  
 ہے۔“ سعد بہت نرمی سے کہہ رہا تھا اور وہ منہ کھولے  
 سنتی جا رہی تھی۔ وہ اتنی غلط تھی؟ اور وہ بھی تو غلط تھا وہ  
 مانتا تھا مگر وہ مانتی نہیں تھی۔ تھوڑا فرق تھا۔

وہ جوابا خاموش رہی۔ سعد بہت کرارے جواب کا  
 منتظر تھا۔ منتظر ہی رہ گیا۔ شام ڈھلنے والی تھی انہیں  
 جلدی لگنا تھا۔ سعد، زین اور رابی کو بلانے چل دیا۔

☆.....☆

کسی نے رکشے سے ایک پوری سڑک پر پھینکی  
 تھی۔ رومہ کی حساست بیدار ہوئیں۔ اسے اچانک  
 سے ٹی وی میں بتاتی جانے والی باتیں یاد آئیں۔ اگر  
 کوئی اپنا سامان کہیں چھوڑ دے یا پھینک دے تو فوراً  
 پولیس کو اطلاع کی جائے۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد  
 پڑ گیا۔ تیزی سے بس آ رہی تھی اور اگر وہ اسے چل  
 دیتی پھر بلاسٹ ہوتا۔ ”اف!“ رومہ نے بھر جھری لی  
 اسے کچھ کرنا چاہیے تھا۔

”بم..... بم..... بم.....“ وہ حلق پھاڑے چلانے  
 لگی۔ بس پوری سے چندفٹ کے فاصلے پر رگ گئی،  
 ارد گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ کوئی ڈرنا آگے نہیں  
 بڑھ رہا تھا۔

”اس میں بم ہے، میں نے خود دیکھا۔ وہ کچھ  
 لوگوں نے اس پوری کو پھینکا تھا۔“ وہ ہلکا رہی تھی۔  
 پولیس موبائل قریب آ کر رک کر جلدی مزید فورس کو بلالیا  
 گیا۔ لوگوں کا ہجوم وسیع تر ہوتا گیا۔

”پلیز سب لوگ یہاں سے جگہ خالی کر دیں۔  
 خطرہ ہے۔“ ایک کانٹیل سب کو اس جگہ سے ہٹا رہا

ڈھٹائی سے رف ہو جاتے ہیں۔ آخر دسمبر ہے کل سے جنوری بھی شروع ہو جائے گا اگر برف ہو بھی جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہونے والا بن جاؤ برف۔“ راہی اسے چھیڑنے لگی۔ جوش سے آواز بلند ہو رہی تھی۔

”مس نصیحت! ایسی چیزوں کو دل پر نہیں لیتے۔ نہ ہی سوگ مناتے ہیں بلکہ بے غم ہو جاتے ہیں۔ بونگیاں تو زندگی میں چلتی ہی ہیں۔“ زین نے پیار سے اس کا سر تھکا۔ وہ اس کی شرمندگی مٹانا چاہتے تھے۔

”یا..... پو آ رایت۔ ڈھٹائی سے برف بن جاتے ہیں اور بے غم بھی۔“ رومہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

اس سال کی ساری بدگمانیاں اس سال پر ہی چھوڑ دی گئیں۔ اگلا سال بڑا تروتازہ ہونا تھا۔ خوش خوش سا کیوں کہ دل خوش تھا کچھ نیا کیا تھا۔

”نئے سال کی آس کریم ہوا کے شہر کے بازاروں میں کھائی ہے یا اپنے شہر کے بازاروں میں؟“ سعد پوچھ رہا تھا۔

”اپنے شہر سے۔“ رومہ کھلکھلائی۔

”بار! بس پکڑو شاید آخری ہے جو اپنے شہر کو

جاری ہے۔“ زین چلایا۔

”میں نے تو ابھی اس شہر سے اپنی مگنی کی شاپنگ

بھی کر لی تھی۔“ رومہ نے منہ بسور اور ان سب کو حیرت

نہ ہوئی۔

”شاپنگ کل اپنے شہر سے کریں گے۔ اگر یہ بس

نکل گئی تو اپنے شہر کی آس کریم بھی نکل جائے گی۔“

زین اور راہی بس میں بیٹھ چکے تھے۔ سعد نے ہاتھ

بڑھا کر رومہ کو بھی بس میں بیٹھ لیا۔ قیدیا نیا سال اچھا

ہونے والا تھا۔ جب بے غم ہو جائیں تو سب اچھا ہی

لگتا ہے۔ غم تو زندگی کو چاٹ جاتے ہیں۔ بس کوش

ہونی چاہیے بے غم ہونے کی ”فینشن فری“۔

Happy new year

☆.....

تھا۔ یں، راہی اور سعد بھی تیزی سے رومہ کی طرف بڑھے۔ وہ اس تماشے کو لگا دیکھ کر آئے تھے۔

”کیا ہوا؟ ٹھیک ہو تم؟“ سعد تکتیش سے پوچھ رہا

تھا۔ رومہ زرد رنگت لیے پوری کو دیکھے جاری تھی۔ ایک

اور مو بائل آ کر رکی چند کتے اور کچھ پولیس مین نکلے۔

کتوں نے پوری کو دنگھا اور پھر سے منہ پیچھے کر لیا۔

ابھین بڑھ رہی تھی۔ چند کانٹیل آگے بڑھے۔ ہم کی

موجودگی کو چیک کرنے والے آلات ان کے ہاتھوں

میں تھے۔ پوری کو کھولا گیا۔ حیرت کی حیرت۔

پوری کو کڑے سے بھری پڑی تھی۔ کوڑے کو بھی

چیک کیا مگر وہ ہم میں نہ بدلا۔ کوڑا ہی رہا۔ سب کی

ملا متی نظریں رومہ کی طرف اٹھیں۔ اس کی نظریں

شرمندگی سے جھکیں۔

”کس نے اطلاع کی تھی کہ یہاں ہم ہے؟“

خشمگین نظریں تو کسی آفیسر کی ہی لگتی تھیں۔ سب

نے رومہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کئی لمحوں تا سف سے

اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لوگ دبی دبی ہنسی رہے

تھے۔ شرمندہ کر دینے والی تھی۔

”ہمارے عوام بھی کیا کریں۔ اتنے بلا سٹ ہو

چکے ہیں کہ ہر جگہ ہم ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا قصور

نہیں۔“ اسے شاید رومہ پر ترس آ گیا جو کہہ کر چلا

گیا۔ جوم بھی چھٹا گیا۔

کب کی چھائی تھی کو نکلنے کا راستہ مل گیا۔ زین،

راہی اور سعد کے قہقہے اس کے کان میں پڑ رہے تھے۔

وہ شرمندگی سے سرخ ہوتی گئی۔

”میں نے کہا تا تم بونگی بھی ہو۔“ سعد نے اس

کے کان میں سرگوشی کی۔ رومہ کی آنکھوں میں آنسو

آگئے اور وہ تینوں بے چین ہو گئے۔

”سمجھو تم نے بھی نیو ایئر کے لیے ایک یادگار

جوک مارا ہے۔ جیسے ہم بونگیاں مارتے ہیں۔ ڈونٹ

وری ردما۔“ سعد اسے بہلانے لگا۔

”ہم تو شرم سے پانی پانی ہونے کی پائے،

## بکھر گئی سہیلی

”حسب توفیق“ برا بھلا کہا۔ پہلے میں نے سوچا کہ گاڑی سے اتر کر ان چھکوں کو اٹھا کر سائیکل پر ڈال دوں لیکن سڑک پر اتنی تیز ٹریفک تھی کہ کوئی بھی رک کر ان چھکوں کو اٹھا نہیں سکتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے کسی گاڑی کی زد میں آ کر جان گمنائے کا خدشہ تھا اب آپ سے کیا پردہ مجھے اپنی زندگی بہت پیاری ہے اس لیے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ لہذا میں نے دل میں یہ دعا کی کہ اس چھکے پر سے کوئی موٹر سائیکل سوار نہ گزرے اور کوئی گاڑی والا ان چھکوں کو اپنی گاڑی سے کچل کر ”ناکارہ“ کر دے۔ گاڑی کا کیلے کے چھکے سے پھسلے کا خطرہ نہیں ہوتا نا۔ چار پیوں والی سواری جو ہوئی۔ چھکے کو ناکارہ کرنے والا کام ہم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہماری گاڑی دوسری لین میں تھی۔ آپ تو جانتے ہیں ”بحیثیت قوم“ اسی فیصد مسائل صرف دعا کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے اس وقت میں نے بھی یہی حکمت عملی اپنائی تھی۔

خیر اگلے سیکل پر بایک ہماری گاڑی کے بالکل آگے کھڑی تھی۔ (ہاں ہاں وہ دونوں اسٹوڈنٹ بھی بایک پر سوار تھے۔ آپ کیا سمجھتے تھے بایک اکیلے ہی وہاں کھڑی تھی۔

”کمال ہے بھئی! آپ کہ بھی کیا کہنے؟“ مجھے تا جانے کیا ہوا میں نے بغیر سوچے سمجھے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تو میرے بھائی نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔

”کیا کر رہی ہو کیوں سڑک پر تماشا لگواتا ہے؟“

جیسے ہی ہماری گاڑی سیکل کر اس کے مین روڈ پر آئی، وہ دوا اسٹوڈنٹ میری توجہ کا مرکز بن گئے جو بایک پر سوار مین روڈ پر چلے جا رہے تھے۔

ارے! یہ نہ سمجھیں کہ میں ان لڑکوں کو تاڑ رہی تھی۔ وجہ موٹر بایک کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لڑکے کے ہاتھ میں موجود دو کیلے تھے جن میں سے ایک کو پچھل کر وہ کھار ہا تھا۔ آپ پھر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ بھئی میں کوئی ندی کی نہیں ہوں نہ ہی مجھے اس کے کیلے کھانے پر کوئی اعتراض ہے میں مسلسل اس لڑکے پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ نہ جانے مجھے یہ ”خوش فہمی“ کیوں تھی کہ وہ لڑکا کیلا کھا کر اس کا چھلکا مین روڈ پر نہیں پھینکے گا لیکن اس وقت میری خوش فہمی چاروں شانے جت ہو گئی جب اس نے کیلا کھا کر چھلکا بغیر سوچے سمجھے سڑک پر پھینک دیا۔ اس نے یہ زحمت بھی نہ کی چلو اگر چھلکا سڑک پر پھینکنا اتنا ہی ”ضروری“ ہے تو اسے سڑک کے کنارے پر ہی پھینک دے۔ یہ دیکھ کر میرا دم ہی نکل گیا (محاورتا حقیقت میں نہیں۔ حقیقت میں نکل جاتا تو میں اس وقت آپ سے بات نہ کر رہی ہوتی۔) کہ پیچھے سے تیز رفتاری سے آنے والے دو موٹر سائیکل سوار اس کیلے کے چھکے سے پھسلے پھسلے بچے۔

یہ صورت حال دیکھ کر میرے بھائی (اب یہ نہ پوچھیے گا وہاں میرا بھائی کہاں سے آگیا؟ یاد رہے گاڑی میرا بھائی چلا رہا ہے۔) نے دونوں لڑکوں کو

کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ شیشہ اوپر کر دیا۔ سکتل  
 ابھی پوری طرح گرین بھی نہیں ہوا تھا، مطلب ابھی  
 پہلی لائن ہی آن ہوئی تھی کہ لڑکے زن سے گاڑی  
 نکال کر لے گئے اور میرے لیے سوچوں کے در ”دا“  
 کر گئے۔  
 ”آپ کیا جانیں میرے لیے سوچنا کتنا تکلیف  
 دہ عمل ہے۔ دو دو گھنٹے سوچنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں  
 چلتا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟“ خیر آج قسمت



حاصل کرتی رہتی ہوں۔ ان سب کا خیال ہے کہ میں حقیقت میں ”پاگل“ (میں ان کے خیال سے بالکل بھی متفق نہیں ہوں۔) بھلا میں ایک ریسرچر یا چھلکا وہاں نہیں پھینکوں گی تو کوڑے کے اس ڈھیر کو کیا فرق پڑے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ کوڑے کے ڈھیر کو ”ایک ریسرچر“ کا فرق تو پڑ ہی گیا ہے نا۔ اب آپ لوگوں سے بات کی ہے تو ممکن ہے ہمارے ارد گرد جگہ جگہ کوڑے کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں انہیں لاکھوں نہیں تو ”ہزاروں ریسرچر اور چھلکوں“ کا فرق تو پڑ ہی جائے گا۔

آپ سب سے میری درخواست ہے کہ کوئی چیز یا پھل کھا کر اس کا ریسرچر یا چھلکا سڑک پر ہار نہ پھینکیں بلکہ اگر آپ گاڑی میں سفر کر رہے ہیں تو ان چیزوں کو شاپنگ بیگ میں ڈال کر گاڑی میں ہی رکھ لیں اور راستے میں کسی کوڑے دان یا گھر واپس آ کر گھر کے کوڑے دان میں ڈالیں اور اگر بایک پر ہیں یا پیدل چلتے ہوئے کوئی چیز کھا رہے ہیں تو کھانے کے بعد ریسرچر یا چھلکے کسی ایسی جگہ پر پھینکیں جہاں سے کسی گزرنے والے کے پھسل کر گرنے کا خدشہ نہ ہو بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ ان چیزوں کو کوڑے دان میں ڈالیں۔ اس ”چھوٹی“ سی بات سے بچنے کی کوشش ضرور کریں جو کسی کے لیے ”بڑے نقصان“ کا باعث بن سکتی ہے اگر آپ کو میری یہ بات ناگوار گزری ہے تو گزری رہے (آپ کیا سمجھتے تھے میں معافی مانگنے لگی ہوں) کیونکہ مجھے یقین ہے جب آپ میری اس بات پر غصہ ڈالے دل سے غور کریں گے تو آپ کو یہ بات بہت معقول لگے گی اور آپ میرے شکر گزار ہوں گے۔ (بی پوزیٹو۔ ارے یہ میرا بلند گرد پ نہیں ہے بلکہ یہ میں اپنی حوصلہ افزائی کے لیے کہہ رہی ہوں۔) اچھا پھر اللہ حافظ لیکن مجھے بتائیے کا ضرور کہ آپ نے اس بارے میں کیا سوچا ہے۔

☆.....

نے ”یادری“ کی اور میں یہ سوچنے میں کامیاب ہو گئی کہ یہ طالب علم ملک و قوم کی بہتری کے لیے کیا کریں گے جن کو یہ تک معلوم نہیں کہ ان کی لا پرواہی کسی کی جان لے سکتی ہے یا کسی کو معذور کر سکتی ہے۔“

”میرا خیال ہے میں نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔“  
ان لڑکوں کا پوچھا ہم دیکھ کر مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایک ”مشہور“ پرائیوٹ کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ اب ماں باپ لاکھوں روپے فیس بھرتے ہیں تو بچوں کو اتنا ”حق“ تو ملنا چاہیے کہ وہ جو چاہیں وہ کر سکیں اگر ہم بچوں کو روکیں گے تو ان کی ”کریڈیٹی“ متاثر ہوگی لیکن پھر بھی والدین اور تعلیمی اداروں سے ”پروڈ“ (شاید کوئی میری بات سن لے۔) اہل ہے خدا را! اپنے بچوں کو ”اچھی تعلیم“ کے ساتھ ”اچھی تربیت“ بھی دیں کیونکہ اچھی تربیت کے بغیر اچھی تعلیم بے فائدہ ہو جاتی ہے۔

اب دیکھیے نا! کیلے کا چھلکا سڑک پر پھینکنا بظاہر ایک چھوٹی اور عام سی بات ہے لیکن اس سے ہونے والے نقصان کا شاید ہمیں اندازہ نہیں ہے۔ یقیناً اس لڑکے کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ اس نے جو چھلکا سڑک پر پھینکا ہے وہ کسی کے لیے بم بلاسٹ جتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن میں اس بات کے لیے بہت حساس ہوں کیونکہ میں اپنے پردی کو اس حادثے کا شکار ہوتے دیکھ چکی ہوں اور اس دن سے میرا یہ ریکارڈ (کمینز بک آف ورلڈ ریکارڈز نہیں بھئی اور نہ ہی بچے والا ریکارڈ) رہا ہے کہ میں نے کسی کی چیز کا ریسرچر یا کسی پھل کا چھلکا سڑک تو کیا کہیں ایسی جگہ بھی نہیں پھینکا جہاں پہلے سے کوڑے کا ڈھیر ہو اور لوگ اس ڈھیر کو ”ترتی“ دینے میں دل و جان سے جتے ہوں اگر مجھے کوئی کوڑے دان یا ڈسٹ بن نظر نہ آئے تو میں وہ چھلکا یا ریسرچر جو میرے ہاتھ میں ہوتا ہے اسے آرام سے اپنے بیگ میں ڈال کر اپنی دوستوں اور عزیز واقارب سے ”پاگل“ کا خطاب



# جہڑو عشق میں تیار وہ عشق ہی جہاں

اور جانے پہچانے نمبر نے اسے اتنا بوکھلا دیا کہ وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر پارون کی کال ریسیو کر گئی تھی مگر دوسری جانب چھائی گہری خاموشی پر اس نے ایک نگاہ احتیاطاً غریب پر ڈالی تھی اور پھر دھڑکتے دل کے



ساتھ بیڈ سے اترتی دے قدموں گلاس وینڈ کے قریب جا پہنچی تھی۔  
”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے کس طرح معذرت کروں۔“ بھاری دلکش آواز نے منیزہ کی دھڑکن مزید  
تیز کر دی تھی۔

”پتا نہیں کیسے میری زبان سے یہ الفاظ پھسل گئے کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔“  
”آپ نے سچ کہا تھا۔ اس میں معذرت کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ دم لمبے میں بولی تھی۔  
”مگر یہ سچ مجھے عارش کی موجودگی میں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جب کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس کی وجہ سے



بہت مختصر رہتی ہو، اس نے کچھ کہا نہیں مگر میری بے تکلفی پر شاید اس نے ناگواری محسوس کی ہو۔“  
 ”آپ پریشان مت ہوں، یہ عارش کو کبھی معلوم ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور یہ کہ انٹرنیٹ کے  
 باہر بھی میری ملاقات آپ سے ہوئی ہے۔“ اس کی بات نے ہارون کو حیران کیا تھا۔

”یہ تم نے عارش کو بتایا تھا؟“  
 ”نہیں..... مگر میرے معاملات سے وہ پتہ نہیں کیسے باخبر ہو جاتا ہے۔“  
 ”تمہیں کچھ کہا تھا اس نے یا میرے بارے میں کوئی سوال کیا تھا؟“

”نہیں مگر اس نے باور کروادیا کہ وہ انجان نہیں ہے۔“

”کس بات سے انجان نہیں ہے؟“

”اس سچ سے جو آج اس کے سامنے آپ کہہ گئے۔“

”میں نے کون سا سچ کہا تھا؟“

”میرے خدا۔ میری رہی کسی نیند بھی آپ اڑا دیں گے۔“ میزہ زچ ہوئی تھی مگر اگلے ہی پل ہارون

کی مدھم پھٹی نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

”معافی چاہتا ہوں۔ میں نے تمہاری نیند کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ بولا تھا۔

”میں جاگ ہی رہی تھی۔ خرمین کے گھر میں ہوں اس نے آج یہیں روک لیا تھا۔“

”میں تمہیں دیکھ کر چونک گیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے کیا تم رورہی تھیں؟“ ہارون کو یاد آیا تھا۔  
 ”امی کے دور جانے کی وجہ سے سرگودھا میں میرے تایا ابو کی سرجری ہوئی ہے ابو تو خرمین کے پیرٹس

کے ساتھ پہلے ہی جا چکے تھے۔“

”اب کیسی طبیعت ہے تمہارے تایا ابو کی؟“

”وہ ابھی ہاسپٹل میں ہی ہیں۔ ڈاکٹر ز ابھی ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔“ وہ مجھے لہجے میں بتا

رہی تھی۔

”پریشان مت ہونا، وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے۔“ ہارون کا تسلی آمیز لہجہ اسے

اچھا لگا تھا۔ وہ مزید کچھ کہہ رہا تھا مگر میزہ بری طرح چونک کر اچانک قریب ہوئی خرمین کو دیکھا تھا جو بغیر کچھ  
 بولے اس سے سیل فون لے چکی تھی۔

”میزہ! میں نے جو کہا تم نے سنا۔“ ہارون کو اس کی خاموشی کا احساس ہوا تھا تو پوچھا تھا۔

”بولتے رہیں بولتے رہیں ہمیں بھی تو ذرا اپنی باتوں سے مستفید کیجیے۔“ خرمین کے مسکراتے لہجے نے

یقیناً ہارون کی سماعتوں کو دھچکا پہنچایا تھا۔

”میرے اگلے شو میں یہ اعلان ہونے والا ہے کہ خرمین کو ہارون جیسے لفظوں کے ساحر پر پریزنٹر کی بولتی

بند کروانے کا اعزاز مل چکا ہے۔“ ہارون کی خاموشی پر وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

”سوچ لو، تمہارے زیادہ تر سٹریٹرز میرے بھی فین ہیں۔ کسی کو تمہارا اعزاز ہم نہیں ہوگا۔“ ہارون نے  
 مسکراتے لہجے میں کہا تھا۔

”اس دھمکی کا اثر مجھ پر نہیں ہونے والا، ویسے آپ کی خبر تو میں بعد میں لوں گی مگر میزہ کی اب خبر نہیں ہے۔ آپ کے جانے کے بعد یہ بڑی ڈھٹائی سے یہی کہتی رہی تھی کہ یہ بس سرسری سا آپ کو جانتی ہے اور یہ کہ انٹی ٹیوٹ کے بعد ایک پارا اتفاق سے آپ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔“ بولتے ہوئے خرمن نے اسے گھورا تھا جو چورسی بنی ہوئی تھی۔

”جب وہ کہہ رہی ہے تو یقین کر لو۔“  
 ”پھر آپ کہیں گے کہ آنکھوں دیکھی کبھی بھی نکل لوں۔“ اس کے خشمکین لہجے پر وہ دیرے سے ہنسا تھا۔

”ویسے آپ بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہیں۔“ خرمن کے معنی خیر لہجے پر میزہ نے ہول کر اس سے سیل فون لینا چاہا تھا مگر وہ بد وقت پیچھے ہوئی تھی۔  
 ”جس خاتون کو بقول آپ کے آپ جانتے ہیں ان پر لو میرج کا بھوت سوار ہے۔ آپ ذرا بچ کر رہیں تو اچھا ہے۔“

”خرمن! مجھ سے بالکل بات مت کرنا تم۔“ میزہ شدید ناراضی سے اس کے ہنستے چہرے کو دیکھتی بیڑ کی سمت چلی گئی تھی۔  
 ”بہت شکریہ مجھے خبردار کرنے کے لیے اب فون بند کروں میں یا عارش کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے تیار رہوں؟“ ہارون کے سوال پر ہنستے ہوئے اس نے خدا حافظ کہہ دیا تھا کہ ابھی تو اسے میزہ کی ناراضی بھی دور کرنی تھی۔

☆.....☆

کچھ تذذب کے ساتھ خرمن نے دیرے سے اس کے شانے کو تھپتھا کر پکارا بھی تھا، گہری نیند سے بمشکل آنکھیں وہ کھول سکا تھا۔

”عارش! مجھے ابھی ریڈیو جانا ہے۔“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی تھی۔  
 ”کیا، اس وقت؟“ پوری آنکھیں کھول کر عارش نے ایک نظروال کلاک کو اور پھر اسے دیکھا تھا۔  
 ”کسی وجہ سے ہارون آج رات تک شو کے لیے نہیں جاسکتے۔ ابھی عثمان سے پتا چلا ہے کہ مجھے اور عثمان کو ہارون کا شو ہوسٹ کرنے کے لیے ریڈیو جانا ہے۔“

”کہیں نہیں جاری ہو تم۔“ سرعت سے اٹھتا وہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔  
 ”صبح 7 بجے نہیں بچے ہیں ابھی چپ کر کے بیٹھی رہو گھر میں ریڈیو سے فون آیا تو میں بات کر لوں گا۔“ وہ بگڑ کر بولا تھا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو، میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ریڈیو نہیں جاسکتی تھی تو ہارون نے میرا پروگرام ہوسٹ کیا تھا اب ان کو میری ضرورت ہے تو.....“

”میں کچھ نہیں جانتا، مجھے کچھ مت سمجھاؤ۔“ بری طرح جھلا کر وہ پھر اس کی بات کاٹ گیا تھا۔  
 ”اب میں عثمان سے کیا کہوں گی؟“ بے بس نظروں سے خرمن نے اسے دیکھا تھا۔

”جنم میں بھیج دوا سے۔“ بگڑے لہجے میں ہی بولتا وہ دوبارہ کبل میں چہرہ چپائے لیٹ گیا تھا۔  
 ”نہ تم کہیں جا رہی ہو نہ میں تمہیں لے کر کہیں جاؤں گا۔ میری چھٹی کا دن غارت مت کرو۔“ وہ کبل کے اندر سے ہی بولا تھا۔

”میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کر رہی۔ عثمان مجھے ساتھ لے جا رہا ہے۔“ وہ التجائی لہجے میں بولی تھی۔  
 ”اے گھر میں داخل بھی مت ہونے دینا۔“ کبل چہرے سے ہٹا کر اس نے تنبیہ کی تھی۔  
 ”گھر میں نے تو اسے گھر میں بلا لیا ہے۔ وہ باہر ہی بیٹھا ہے۔“ خرمن نے انتہائی مصعومیت سے اسے سنا دیا تھا۔

”اس شیطان کو تم نے گھر میں آنے کیوں دیا؟“ جھنجھلا کر بولتا وہ پھر اٹھ بیٹھا تھا جب کہ خرمن اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔

”تمہیں ہنسی آرہی ہے میں کیا بے وقوف نظر آتا ہوں۔ یہ ایک ہی دن ملتا ہے اور اس میں بھی تم.....“  
 شدید ناراضی سے اسے دیکھتا ہوا وہ چپ ہو گیا تھا۔

”عارش! ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا جاب ہے یہ اب تم اس طرح ناراض ہو گے تو میں کیسے جاسکوں گی؟“  
 وہ آنکھوں میں مظلومیت سجائے بولی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں پتا، جو کرنا ہے کرو۔“ ہاتھوں سے بکھرے بال درست کرتا وہ خفت سے بولا تھا مگر پھر رک کر اسے دیکھا تھا جو خاموشی سے اسے ہی دیکھ رہی تھا۔

”کتنا وقت لگے گا؟“ وہ خشکی سے ہی پوچھ رہا تھا۔

”صرف دو گھنٹے۔“

”جانتا ہوں تمہارے دو گھنٹے“ جل کر بولتے ہوئے وہ کبل دور پھٹکتا بیڈ سے اترتا چاہ رہا تھا۔ جب خرمن نے ہنستے ہوئے چہرہ اس کے شانے سے مس کیا تھا مگر اس کا موڈ ہنوز بگڑا ہوا ہی تھی۔

”میرے لیے ناشتہ تیار کرو۔“ ہٹ دھرمی سے آرڈر دیتا وہ واش روم کی طرف گیا تھا جب کہ وہ گہری سانس لیتی کمرے سے نکل آئی تھی۔ لاؤنج میں ہی صوفے پر نیم دراز عثمان ٹی وی کے چینلوں چینیج کرنے میں مصروف تھا۔

”عثمان! مجھے عارش کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ لاؤنج کی طرف بڑھتی وہ بولی تھی۔

”ظاہر ہے، اب تو ہر حال میں اسے ناشتا چاہیے ہوگا۔ اس کی فرمانبرداری بننے کی کوشش کرو گی تو ایسے ہی وہ سر پر چڑھے گا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی کراہی زبان استعمال کر لینا اسے سمجھ میں بھی تمہاری وہی زبان آتی ہے۔“ عثمان نے حسمکین نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اچھا اب چپ رہو، عارش کا موڈ پہلے ہی خراب ہو چکا ہے۔“

”تھوڑا سا چیخ چلا کر اجازت لیتیں تو وہ اپنے سارے موڈ بھول جاتا، اب اٹھاؤ وغرے، میرے لیے بھی کچھ لے آؤ کھانے کے لیے، میری بیوی اس وقت آرام کر رہی ہے اور میں اسے بے آرام نہیں کر سکتا تھا۔“



”اب تمہارے لیے بھی ناشتا بناؤں؟“ پہنچ گئے پھر ہم وقت پر۔“ خرمن جھلائی تھی۔  
 ”جلدی کرلو، تمہیں اپنے سنگھار بھی مکمل کرنے ہوں گے۔ آٹھ بجے تک لازمی ریڈیو پہننا ہے۔“  
 عثمان کے گھر کے پردہ غلت میں مکن کی طرف گئی تھی۔  
 ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹاتا عثمان اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو کافی کینہ تو ز نظروں سے اسے دیکھتا  
 سو نے پر براجمان ہوا تھا۔  
 ”صبح، صبح تم بڑے نکھرے نکھرے لگ رہے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ استانی کے تیر مگر جائیں۔“ عثمان نے  
 مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اب تم مزید میرا دماغ خراب مت کرو۔“ وہ ناگواری سے بولا تھا۔  
 ”پتہ نہیں کون سا گناہ کیا تھا میں نے جو تمہیں برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔“  
 ”استانی! ذرا آکر سن لو یہ عارش غصے میں جانے تمہارے بارے میں کیا کیا بول رہا ہے۔“ عثمان نے  
 مکن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی تھی اور پھر عارش کے تاثرات پر اس کی ہنسی بلند ہو گئی تھی۔  
 ”میرے لیے پراٹھے بنانا، مجھے پراٹھے ہی چاہئیں۔“ عارش نے تپ کر مکن کی طرف آرڈر بھیجا تھا  
 جب کہ عثمان کی ہنسی غائب ہو گئی تھی۔  
 ”ہاں بھی چھوٹے! پانچ پراٹھے، مرغ چھوٹوں کے ساتھ دو کرما کر م چائے لے آلائی مار کے۔“  
 مکن کی طرف اپنا آرڈر بھیج کر وہ عارش کی طرف متوجہ ہوا تھا جو لہجہ جانے والی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا  
 تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں ہو جاؤں باؤلا جو ناشتے میں مل رہا ہے شرافت سے ہضم کرلو۔“ عثمان بول رہا  
 تھا جب خرمن مسکرا ہٹ چمپائے لاؤنج میں آئی تھی۔  
 ”کیوں ڈانٹے جا رہے ہو عارش کو، میں نے زیادہ وقت تو نہیں لگایا۔“ گرم گرم پراٹھے اور آلیٹ کی  
 پلیٹیں ٹیبل پر رکھتی وہ بولی تھی۔

”زیادہ اس کی طرف داری مت کرو اور جلدی ناشتہ کر کے چلنے کی تیاری کرو، اس کی فکر میں بے حال  
 ہونے کے ڈرامے میرے سامنے ایسے کر رہی ہو جیسے میں تمہیں جانتا نہیں۔“ عثمان کے طہریہ لہجے پر خرمن  
 نے شکایتی نظروں سے عارش کو دیکھا تھا۔  
 ”اب ناشتہ شروع کرو گے یا مجھے اور مزید باتیں سنوانی ہیں؟“ ناراضی سے عارش کو مخاطب کرتی وہ  
 مکن کی طرف گئی تھی۔

☆.....☆

دم بخود میٹھی وہ کبھی عارش کو دیکھ رہی تھی اور کبھی عثمان کو وہ دونوں ہی بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ آج  
 چھٹی کے دن عارش اسے غلت میں پک کر نے گھر پہنچا تو وہ یہی سمجھی تھی کہ خرمن نے گھر پر بلایا ہو گا مگر وہ  
 دونوں اسے گھر لے جانے کے بجائے اس ریسٹورنٹ میں لے آئے تھے اور جو کچھ عارش نے اس کے  
 گوش گزار کیا تھا وہ اس کے لیے شدید قسم کا جھکا ہی تھا۔

”نیزہ! جو باتیں ابھی میں نے کی ہیں، اتنا یاد رکھنا کہ وہ ہم تینوں کے درمیان ہی رہیں اور مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔“ بہت سنجیدگی سے عارش نے اسے تسبیح بھی کی تھی۔

”عارش! میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے واقعی شک لگا ہے۔“ نیزہ دنگ تھی۔  
 ”ہارون اور ایک سے ملنے کے بعد اب یہ سب تمہیں حیرت انگیز نہیں لگتا چاہیے۔ کبھی کبھی حقیقت حیران کن ضرور ہوتی ہے مگر حقیقت تو اپنی جگہ مسلم موجود رہتی ہے۔“ عثمان نے کہا تھا۔  
 ”مگر یہ یقین تو تم دونوں بھی نہیں ہو۔“ نیزہ بولی تھی۔

”ہاں، ہارون کے ماں باپ سے ملنے کے بعد بھی مجھے سو فیصد یقین نہیں ہے مگر مجھے یہ بھروسہ ہے کہ سو فیصد یقین بھی مکمل ہونے والا ہے اور اس کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ عارش کے سنجیدہ لہجے پر وہ حریفانہ بھی تھی۔

”دیکھو! میں اب تک ہارون کی فیملی کے بارے میں جس حد تک معلومات کر چکا ہوں وہ ناکافی ہیں۔ اہم بات بس یہ پتہ چلی ہے جو کہ بعد میں ہارون نے بھی کنفرم کر دیا کہ ان کی فیملی ہمیشہ سے اس شہر میں نہیں رہی ہے۔ حریف جو کچھ میں جانتا چاہتا ہوں وہ مجھے صرف تمہارے ذریعے ہی ہارون سے معلوم ہو سکتا ہے اور تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔ ورنہ مغربی مہم انڈوس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے۔“  
 ”مگر میں ہارون سے کیا کہوں گی؟ میں کیسے ان کے پرسنل کے بارے میں جان سکتی ہوں؟“ نیزہ حق دق رہ گئی تھی۔

”ابھی میں اپنی زبان کھولوں؟“ عثمان کی خستہ نظروں پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔  
 ”نیزہ! تم میری اس الجھن کو سلجھانے میں مدد کرو، اس کے بعد ہارون سے تمہاری شادی کروانا میری ذمہ داری ہے۔“ عارش کی سنجیدگی نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

”یہ کیا بول رہے ہو تم، وہ کیوں کرنے لگے مجھ سے شادی؟“  
 ”اس کے خشتوں کو بھی کرنی پڑے گی۔ کیا وقت گزاری کے لیے تمہارے ساتھ لٹج کر رہا ہے۔“  
 فیٹیبول میں گھوم رہا ہے فون کالز کر رہا ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ اس کے پاس تمہارا نمبر بھی نہیں ہے۔“  
 عارش نے بری طرح اسے گھرک دیا تھا وہ کچھ بول بھی نہیں سکی تھی۔

”جو کام عارش نے دیا ہے اسے اب پوری ایمانداری اور ہوشیاری سے کرنا، ہارون کو کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے تم پر اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو یاد رکھنا تمہارے اماں ابا کو کون کھڑکا دوں گا اور تمہارے بھائی کی غیرت بھی جگانے میں دیر نہیں لگے گی مجھے۔“ عثمان کی دھمکی پر نیزہ نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا جب کہ عارش ہنسنے لگا تھا۔

”میں اپنی پوری کوشش کروں گی مگر صرف خرمن کی وجہ سے۔“ نیزہ ہنسنے لگی تھی۔  
 ”اب چلو یہاں سے سب ہماری فیملی کی طرف ہی نظریں بجائے بیٹھے ہیں ان محترم کی وجہ سے۔“  
 نیزہ نے بولتے ہوئے عثمان کی فخریہ مسکراہٹ کو گھورا تھا۔

”اے فیہر کہتے ہیں۔ اس سارے بیٹے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ تم کیوں بل رہی ہو؟“

”ابھی کچھ عرصے میں ہی پتا چل جائے گا کہ یہ قیم کتنی بھاری ہوتی ہے۔ پبلک پرائیٹی بن کر رہنا آسان نہیں ہے، میزہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے تم اب اس قابل نہیں رہے کہ تمہارے ساتھ باہر گھوما جائے۔“ عارش کے ہنسنے لہجے پر وہ بڑھنٹائی سے مسکراتا رہا تھا۔

☆.....☆

ریڈ پرائیٹیشن میں اسے واقعی دو گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ وہاں وہ اسٹاف کے درمیان ہوا اسٹوڈیو میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہاں گھر آنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ عارش کا موڈ اچھا نہیں تھا مگر اسے کوئی فکر نہیں تھی جانتی تھی کہ عارش کی ناراضی دور ہو جائے گی اگر وہ اس سے کوئی فرمائش کر دے لہذا اس نے شام کو باہر جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا تھا کہ کچن کی طرف سے بے فکر ہو کر اس نے وارڈ روم کو ٹھیک کر لیا اور کچھ دوسرے ادھورے کام بھی کر لیے۔ بیلا کے پارلر میں معمول کی طرح اس کی کچھ سیلپ کر دی تھی اور اپنے چہرے کی ٹوک پلک بھی سنوارنے کا موقع مل گیا تھا۔ عارش کے ساتھ باہر جانے کا مقصد ادھر ادھر گھومنا ہرگز نہیں تھا۔ عارش کے انکار کے باوجود وہ زبردستی اسے شاپنگ مال کی طرف لے گئی تھی۔ کافی دن گزرنے کے باوجود عارش نے اپنے لیے ایک شرٹ تک نہیں خریدی تھی۔ آج وہ اس کے لیے شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بار بار احتجاج کے باوجود عارش کسی چیز میں انٹرست نہیں لے رہا تھا۔ خرمن جانتی تھی کہ اپنے جوتوں سے لے کر لباس تک کی خریداری وہ عثمان کے ساتھ کرتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ عثمان کی چوٹیں زبردستی تھیں مگر وہ بھی اب ایسی مٹی گزری نہیں تھی سو عارش سے بحث کرنے کے بجائے اس کے لیے جو کچھ اسے اچھا لگتا رہا وہ خریدتی رہی تھی۔ بیلا کے پارلر کے لیے اور اپنے لیے اس نے کاسٹیکس کا کچھ سامان لیا تھا اور آخر میں جب وہ عثمان کے لیے ایک پرفیوم اور جیکٹ لے کر فارغ ہوئی تب تک عارش شاپنگ بیگز سنبھالے اچھی خاصی کوفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

”تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی حسرت میں دل میں لیے گزر جاؤں گا۔ آج کچھ امید جاگتی تھی مگر تم نے یہاں خوار کر کے میری امید کا گلا گھونٹ دیا۔“ وہ شدید ناراضی سے بولا تھا۔

”بیوی کے ساتھ کون اتنی موڈ ڈیٹ پر جاتا ہے؟“ خرمن حیرت سے ہنسی تھی۔

”میں ہوں وہ احمق مرد۔“ ہنسنے لہجے میں بولتا وہ دوسری طرف متوجہ ہوا تھا اور اگلے ہی پہل اس کے قدم رک گئے تھے۔ آگے جاتی خرمن بھی چونک کر رکتی اس کی طرف ہنسی تھی۔

”اب کیوں رک گئے؟“ حیرت سے بولتے ہوئے خرمن نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اس بڑی سی شاپ کو دیکھا تھا جہاں بے بی، بابا کلاتھ کا سائن جگمگا رہا تھا۔ خرمن کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ اگلے ہی پہل وہ تیزی سے عارش کی طرف بڑھی تھی۔ جو شاپ کی گلاس والے ڈسپلے میں بھی چیزوں اور خوب صورت کپڑوں سے نظر ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس پوری شاپنگ کے دوران پہلی بار عارش نے کسی چیز میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔

”عارش! فوراً چلو یہاں سے۔“ اس کے ارادے بھانپتے ہی وہ جگمگت میں بولی تھی۔

”یہاں اتنا وقت برباد کر دیا مگر جو لینا چاہے تھا اسے ہم بھول گئے۔ مجھے اس شاپ میں جانا ہے اور تم انکار نہیں کرو گی۔“ وہ قطعی لہجے میں بولا تھا۔

”عارش! ابھی سے اس کی کیا ضرورت ہے اس کام کے لیے بہت وقت ہے۔“ وہ شیشائی تو مگنی تھی۔

”ہرگز نہیں، وقت کم ہے اور مجھے اس کے لیے بہت کچھ خریدنا ہے۔“

”عجیب لگے گا، مجھے شرم آئے گی وہاں۔“ سرخ چہرے کے ساتھ وہ ہچکچائی تھی۔

”چلو میرے ساتھ۔“ اس کا ہاتھ پکڑے وہ شاپ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ تو اپنی جینپ میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر پاتی تھی مگر عارش بہت پر جوش تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے چھلکی جا رہی تھی۔ چلتی رفتار سے وہ پکڑے اور دیگر چیزیں پسند کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اپنے بچے کے لیے سب کچھ وہ آج ہی خرید لے گا۔ خرمن نے بمشکل ہی اسے کنٹرول کیا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ کتنا بے تاب اور بے چین ہے۔ رات میں سونے سے پہلے تک وہ بچے کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے لیے ابھی سے وہ پلاننگ شروع کر چکا تھا۔ خرمن کو یقین تھا کہ جب وہ اپنے بچے کا چہرہ دیکھے گا تو پاگل ہوا ٹھے گا کیوں کہ وہ ابھی سے اس کے لیے بہت حساس ہوتا جا رہا تھا۔

بہت اچھا سا ڈیزائن کرنے کے بعد وہ دونوں عروسہ کی طرف پہنچے تھے۔ فاران کی خیریت دریافت کرنے، وہ پہلے سے کافی بہتر ہو چکا تھا مگر بازو اور ہیکر کا پلاسٹرا کرنے میں ابھی وقت لگتا تھا۔ خرمن کو مگر کامیابی اور فاروق کا حراج دونوں ہی نارمل لگے تھے۔ عروسہ کے اصرار کے باوجود وہ زیادہ دیر ان کے پاس نہیں رک سکی تھی کیوں کہ اسے بہت زیادہ محکم محسوس ہو رہی تھی۔

گھر کی طرف واپس روانہ ہوتے ہوئے وہ مطمئن تھی۔ آج کا دن بہت اچھا گزر رہا تھا۔ کچھ چونک کر اس نے عارش کو دیکھا تھا جو اپنے اپارٹمنٹ کے مین گیٹ میں داخل ہونے کے بجائے آگے بڑھ آیا تھا۔ ”ہارون کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے کا فرض بننا ہے تمہارا انہیں اچھا لگے گا۔“ اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بولا تھا۔

”اس وقت؟“ خرمن نے حیرت سے اپنی رست و اچ میں وقت دیکھا تھا۔

”عارش! 11 بج چکے ہیں۔ وہ ہماری وجہ سے ڈسٹرب ہو جائیں گے۔“

”مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔“ عارش کا مکمل ارادہ تھا جانے کا لہذا وہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔

گیٹ پر ہارون نے ہی ان دونوں کا استقبال کیا تھا۔

”میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ F.M ریڈیو کی اتنی مشہور آر جے میرے گھر خود تشریف لائی ہیں۔“ ہارون کے مسکراتے لہجے پر خرمن ہنسنے ہوئے ایک کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو دھینا خوشی میں ہی چیخا ان کی طرف آیا تھا۔

”مجھے معلوم تھا عارش آپ کو یہاں لے کر آئیں گے۔ مجھ سے وعدہ جو کیا تھا۔“ ایک چہکا تھا جب کہ ان سب کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے خرمن میسج کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو گھر کے داخلی دروازے پر کھین

ان سب کی ہی منتظر تھیں۔

”آپ نے فون پر مجھ سے شکایت کی تھی کہ میں خرمن کو آپ کے پاس نہیں لایا۔ اب میں نے آپ کی شکایت دور کر دی ہے۔“ عارش نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا تھا جو بڑی محبت سے خرمن کو گلے لگا رہی تھیں۔

”نہیں اب تو حریہ یہ شکایت ہو گئی ہے تم سے کہ اپنی اتنی پیاری بیوی سے تم اتنی دیر سے ملو رہے ہو مجھے۔“ صبیحہ کی پر شفقت نظروں پر خرمن مسکرائی تھی۔ وہ اسے بالکل اجنبی نہیں لگی تھیں۔ ان کے چہرے پر پھیلا نقدس، آنکھوں میں چمکتی شفقت اور لہجے کی حلاوت، ان کا لہجہ سب کچھ اسے فاطمہ جیسا ہی لگا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے تک صبیحہ نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا اور اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا تھا۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ خرمن نے ہارون سے پوچھا تھا۔

”اب میں بہتر ہوں، صبح شاید بدلے موسم کا اثر تھا جو طبیعت نا ساز تھی۔“

”آپ کو پورا یقین ہے کہ موسم کا ہی اثر تھا؟“ عارش کے مسکراتے لہجے پر وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”آپ بھائی سے ناراض نہیں ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کو سنڈے کو بھی ریڈیو جانا پڑا۔“ ایک نے خرمن کو مخاطب کیا تھا۔

”خرمن! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری جگہ تمہیں اور عثمان کو ڈسٹرب کیا جائے گا۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔“ ہارون نے فوراً کہا تھا۔

”اب مجھے شرمندہ مت کریں۔ ہم سب تو حیران تھے کہ آپ اپنا کوئی شومس نہیں کرتے ہیں۔“ خرمن بول رہی تھی جب کہ اس کے قریب ہی موجود صبیحہ بنور اسے دیکھ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کی تیز روشنی میں ڈارک مردونہ قیس سے اسکا روم میں قید اس کا جگمگا تا چہرہ اس کی آواز سب کچھ ان کے دل میں اتر رہا تھا۔ ہارون کے عارش کی طرف متوجہ ہونے پر وہ صبیحہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”بہت پیاری ہوں، اپنی آواز سے بھی زیادہ۔“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ خرمن کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”تمہارے ماں باپ بھی بہت اچھے ہوں گے جنہوں نے تمہاری اتنی اچھی تربیت کی ہے وہ خیریت سے ہیں؟“

”جی وہ دونوں خیریت سے ہیں مگر ابھی اس شہر میں نہیں ہیں۔ بابا اپنے بڑے بھائی کے پاس گئے ہوئے ہیں سرگودھا، ابھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔“

”تمہارے والد کے بڑے بھائی تمہارے تایا ہوئے۔“ صبیحہ مسکرائی تھیں جب کہ کچھ شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تب ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہشام قزلباش کی نظر میں خرمن پر ٹھہر گئی تھیں۔ جب کہ ان کی رعب دار شخصیت نے اسے سنجیدہ اور مرعوب کر دیا تھا۔ عارش نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے معاف کیا تھا۔ خرمن نے مدھم لہجے میں ان کو سلام کیا تھا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ ہشام قزلباش کے بیٹھے ہی صبیحہ اٹھ رہی تھیں جب خرمن نے ان کا ہاتھ



تھا تھا۔

”ابھی آتی ہوں تم پہلی بار یہاں آئی ہو، ایسے ہی تو نہیں جانے دوں گی۔“ اسکارف میں چھپے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں وہ بہت محبت سے بولی تھیں۔

”کوئی تکلف مت کریں۔ میں پہلی بار آئی ہوں مگر آخری بار نہیں، ہم بس اب اجازت چاہیں گے۔“  
”خرمن! ابھی تو تم دونوں آئے ہو اور اتنی جلدی تم جانے کی بات کر رہی ہو۔“ ہارون نے کچھ ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ ناراض مت ہوں ابھی تو صرف ہم آپ کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ آئندہ جب آئیں گے آپ کی مرضی سے ہی جائیں گے۔“ خرمین نے پہلے ہی عارش نے کہا تھا۔  
”دراصل ہم شام سے ہی گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہوئے یہاں آنے کا ارادہ ہو گیا۔ ورنہ اتنی رات میں ہم آپ سب کو ڈسٹرب نہیں کرتے۔“ خرمین نے کہا تھا۔

”یہ بات عارش کہتے تو میں یقین کر لیتا کیوں کہ یہ جلدی سو جاتے ہیں مگر آپ تو 12 بجے تک ریڈیو پر شو ہو سٹ کر رہی ہوتی ہیں۔“ ایک نے فوراً ہی کہا تھا جب کہ خرمین بس عارش کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔  
”عارش! کم از کم کافی کے لیے تو رک جاؤ تمہاری وجہ سے ہمیں بھی مل جائے گی اور زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔“ ہشام تزلہاںش بولے تھے۔

”اب تو رکنا ہی پڑے گا۔“ عارش نے مسکراتی نظروں سے صبر کو دیکھا تھا۔  
”ایسے ہی کہہ رہے ہیں ورنہ روز اسی وقت میں ان کے لیے کافی بناتی ہوں۔“ جھینگی مسکراہٹ کے ساتھ بولتیں وہ اٹھ گئی تھیں۔

”خرمن! آپ دوبارہ آئیں گی تو میں آپ کو اپنے پالتو مور دکھاؤں گا۔“ ایک نے اچانک اسے مخاطب کیا تھا۔

”ایک! اس طرح بڑوں کا نام نہیں لیتے ہیں۔“ ہشام تزلہاںش نے اسے فوراً ٹوکا تھا۔  
”پاپا! ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے ناموں سے ہمیں نہیں پکارتے۔“ ہارون نے بھی خرمین کے لیے میں ایک کو حریذ مرندہ کیا تھا۔

”ایک کو اجازت ہے ہمارے نام لینے کی، اس لیے آپ اس کو مت روکیں۔“ عارش نے کہا تھا۔  
”ویسے تم خرمین کو مور دکھا کر مجھے کسی مشکل میں نہ پھنسا دینا کیونکہ ہمارے گھر میں کبوتروں کے بعد اب کسی انجیر سے کی جگہ نہیں ہے۔“

”آپ کے گھر میں کبوتر ہیں، مجھے کیوں نظر نہیں آئے؟“ ایک نے شدید حیرت سے کہا تھا۔  
”اب گھر آؤ گے تو میری پر جا کر ان کا دیدار کر لیتا۔“ عارش نے کہا تھا۔  
”عارش! تم کبوتروں کے لیے نام کیسے نکالتے ہو؟“ ہارون بھی حیرانی سے بولا تھا۔

”میں اپنے لیے نام نہیں نکال پاتا آپ کبوتروں کی بات کر رہے ہیں ان محترمہ سے پوچھیں۔ بچپن سے کبوتروں سے عشق ہے ان کو۔“

”خرمن! تم نے کیو تر پالے ہوئے ہیں؟“ ہارون نے ہنستے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا تھا جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

”بس اب تیار ہو جاؤ، ریڈیو پر تمہارا ریکارڈ لگنے والا ہے۔“ ہارون کے کہنے پر وہ ہنسی مٹا کر اگلے ہی لمحوں میں اس کی ہنسی محسوس ہو گئی تھی۔ جب اس نے ہشام قزلباش کو بہت سنجیدہ نظروں سے اپنی جانب دیکھنا پایا۔ بہت عجیب سا کچھ محسوس کرتی وہ دوبارہ ان کی جانب دیکھنے سے گریز کرتی رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں جب صبیحہ کافی کے ساتھ واپس آئیں تو وہ ایک سے ہی بات کر رہی تھی جب کہ باقی تینوں مرد حضرات ملکی اور سیاسی حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ کافی پینے کے دوران صبیحہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی تھیں ان سے نظر بچا کر وہ ہشام قزلباش کی طرف متوجہ ہوتی رہی تھی۔ کیوں؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی کافی کے بعد عارش نے جانے کی اجازت چاہی تھی کیوں کہ اسے اندازہ تھا کہ خرمن اب گھر جانے کے لیے بے چین ہوگی۔

”خرمن! تم سے اچھی طرح بات بھی نہیں ہو سکی۔ اب جانے کب آؤ گی تم۔“ صبیحہ کی آنکھوں میں اسے حسرت سی نظر آئی تھی۔

”آپ فکر مت کریں، میں جلد ہی دوبارہ آؤں گی۔ قریب ہی تو گھر ہے۔ آپ بھی جب چاہیں میرے گھر آ سکتی ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بہت خلوص سے بولی تھی۔ اسے واقعی صبیحہ بہت اچھی اور دل کے قریب لگی تھیں۔

”اچھا! اب جو میں تمہیں دے رہی ہوں۔ بہت محبت سے دے رہی ہوں تم انکار مت کرنا۔“ صبیحہ بولی تھیں اگلے ہی لمحوں میں خرمن دنگ رہ گئی تھی جب انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک انگوٹھی اتاری تھی۔ ”یہ کیوں کر رہی ہیں آپ، اس کی کیا ضرورت۔ ہر؟“ خرمن نے انہیں روکنا چاہا تھا مگر وہ ان سنی کیے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پہنا چکی تھیں۔ جب کہ اس نے مدد طلب نظروں سے عارش کو دیکھا تھا۔ ”عارش کی طرف مت دیکھو وہ کچھ نہیں کہے گا اور اگر کہے گا تو میں اس سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ صبیحہ نے مسکراتی نظروں سے عارش کو دیکھا تھا۔

”آپ یہ اس لیے کہہ رہی ہیں کہ آپ کو یقین ہے میں آپ کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اب ہمیں یہاں سے رخصت کرنے سے پہلے کچھ توجہ آپ مجھے دیں گی؟“ عارش نے مسکراتے ہوئے سر ذرا ان کے سامنے جھکایا تھا۔

”ظاہر ہے تم میرے لیے خرمن سے پہلے ہو۔“ پر شفقت انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتی تھیں۔ صبیحہ کے ہمراہ باہر آتے ہوئے اسے ہشام قزلباش ارد گرد دکھائی نہیں دیئے تھے۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ دور کے ہشام قزلباش اس کی طرف ہی متوجہ تھے جو گڑبڑا کر فوراً ہی اپنے ساتھ چلتی صبیحہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

دو اسکرین سے نگاہ ہٹا کر عارش نے ایک نظر اسے دیکھا تھا جو اپنی انگلی میں چمکتی نازک سی انگوٹھی پر نظر جمائے بالکل خاموش تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ عارش کی آواز نے اسے چونکایا تھا۔  
 ”مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کا زیور اتار کر مجھے دے دیا۔ انہوں نے اتنی محبت اور عزت دی وہ کافی تھا۔“ وہ تذبذب میں مبتلا ہوئی تھی۔  
 ”یہ ان کی محبت کا اظہار ہے جس کے لیے دل میں محبت ہوتی ہے اس کے سامنے قیمتی سے قیمتی چیز بھی اہم نہیں رہتی اور تم اس قابل ہو کہ تمہیں اپنا سب کچھ دے دیا جائے۔“ ایک گہری نظر اس پر ڈالنا وہ بالکل سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔  
 ”تمہیں کیسے لگے ہارون کے بدش؟“ اس کی خاموشی پر وہ پوچھ رہا تھا۔  
 ”بہت اچھے۔“ وہ بالکل سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ہشام قزلباش کا چہرہ آگیا تھا۔ ان کی پرکشش شخصیت نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

☆.....☆

شدید گھبراہٹ، بے چینی اور بے قراری نے آج پھر انہیں غر حال کر رکھا تھا۔ رات دھیرے دھیرے قیامت بن کر آج پھر ان پر گزر رہی تھی۔ چار سوت بھیلی تاریکی اور ٹھن میں زعد کی کہاں تھی۔ ٹھنکی سانسوں کے ساتھ ان کے جسم سے جان چھٹی جا رہی تھی۔ لرزتے قدموں سے چلتیں وہ اسٹڈی روم کے کھلے دروازے پر رک گئی تھیں۔ سامنے وہی منظر تھا وہی عذاب ناک خاموشی میں دل کو جبر دینے والی گریہ وزاری کی کرب ناک کراہیں جو اس شخص کے دل سے ابھرتی لہروں سے آزاد ہو رہی تھیں۔ صبح کو اپنے دل میں کئی خنجر ایک ساتھ اترتے محسوس ہوئے تھے۔ یہ اذیت ناقابل برداشت تھی۔  
 سجدے میں گرے اپنے دل کے زخم اللہ کو دکھاتے ہوئے اس انسان کو کتنے سال گزر چکے تھے۔ دیوار کا سہارا لیے وہ بمشکل توازن قائم رکھ سکتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کا درد ہرگز بھی اس انسان کے درد سے کم نہیں تھا جو سجدے میں تھا یہ فریادیں کب تک دل سے نکلتی رہیں گی اور جانے کب آسمان والے لنک پہنچیں گی۔ یہ صبر تو اب زندگی کے ساتھ ختم ہونا تھا اور زندگی اب وہ بھی کتنی رہ گئی تھی۔ ان کے بے آواز آنسو اور دل کے اندر اٹھتا درد کا عظیم سیز کوئی پر جبور کر رہا تھا۔ یہ نہیں کس طرح وہ اپنے بکھرتے وجود کو بھینچتیں دار ذروب تک گئی تھیں۔ وہ قیمتی بیگ جس میں ان کی جان ان کی سائیں اور خوشیاں تک بندھیں اسے سینے سے لگائے وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی تھیں۔ اسٹڈی روم سے باہر آتے ہشام قزلباش ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ کئی چابک ان کی پشت پر پڑتے عذاب کو بڑھا گئے تھے۔ بیگ میں سے ایک ایک چیز نکالتیں وہ دیوانہ وار ان سب چیزوں کو چومنی جا رہی تھیں۔ یہ کام وہ پہلی بار نہیں کر رہی تھیں۔ وہ کام جو موت سے بڑھ کر اذیت ناک تھا۔ رات کے پہرے دل میں یہ کام کرنا ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکا تھا۔ اپنے وجود کے گم شدہ حصے کو اس کی خوشبو کو اس کے لمس کو ڈھونڈنے کے لیے جو کہیں وقت کے اندھیروں میں گم ہو چکا تھا۔ اس کی تلاش میں انہیں اس بیگ کو کھولنا پڑتا تھا۔ جس میں ان کی زندگی قید تھی۔ ڈبڈبائی نظروں سے صبحی نے ان کو دیکھا تھا جو بہت خاموشی سے قریب آئے تھے۔ شدت ضبط سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر

وہ کھری چیزوں کو واپس بیک میں ڈالنے لگے تھے۔

”یہ سزا کب ختم ہوگی۔ میں دن رات اللہ سے پوچھتی ہوں مگر مجھے جواب نہیں ملتا۔ آپ اللہ سے پوچھیں اسے ہم پر رحم کب آئے گا۔“ زار و تظار رو تھیں وہ کہہ رہی تھیں۔

”اللہ سے سوال نہیں کیے جاتے صبیحہ! اس کے لیے جو مہر تم کرتی آئی ہو اسے ضائع مت کرو۔“ وہ لرزے لہجے میں بولے تھے۔

”اور کتنا صبر؟ یہ صبر تو مجھے ختم کر چکا ہے۔ اب کیا بچا ہے۔“ ان کے بازو سے سر لگائے وہ ہلکے آغوش تھیں اور ہشام قزلباش کے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ بھی نہیں رہا تھا۔ تسلی کے لفظ صبر کی تلقین یہ سب سالوں سے دہراتے دہراتے وہ تھک چکے تھے۔ لفظوں کی تاخیر ختم ہو چکی تھی اور اب تو تمام لفظ بھی مگر طویل عرصے سے تڑپتی بگلتی عورت کو ان کے لفظوں کا ہی تو سہارا رہا تھا اب تک وہ جانتے تھے کہ اگر صبیحہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تو وہ مر جائیں گی اور وہ خود بھی تو اندر سے کھو کھلے ہو چکے تھے۔

”اللہ کی رضا میں راضی رہو صبیحہ! وہ کب تمہاری آپیں سن لے کب اپنے کرم کی بارش کر دے کون جانتا ہے وہ کبھی اپنے ہندوں کو واپس نہیں کرتا۔“

”مگر میری ساری امیدیں ختم ہو چکی ہیں اور میں بھی۔ کوئی ایک بار مجھے اس کا چہرہ دکھا دے۔ اس کے بعد زندگی بھی مجھ سے چھین لے۔“ ہذیبانی انداز میں روتی چھینٹیں وہ جیسے دیوانہ وار کمرے سے نکلی تھیں مگر پھر یکدم ہی ان کی چھینٹیں دم توڑ گئی تھیں۔

وحشت زدہ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھیں جو ریگ پر ہاتھ رکھے آخری اسٹیپ پر رکھا ہوا تھا۔ صبیحہ کو دیکھتے ہوئے اس کا دل کسی اپنی جگہ سے ہلنے میں جکڑنے لگا تھا اور چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں ان پر ہی ساکت تھیں جو دھیرے دھیرے چلتیں اس کے قریب آ چکی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے مگر وہ پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا۔

”ہارون! تم جانتے ہو اس کی آنکھیں بالکل تمہارے جیسی تھیں۔“ لرزے لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر اسے اپنی طرف جھکا یا تھا۔

”آخری بار تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔“ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ بے اختیار اس کی آنکھوں کو چوم رہی تھیں۔ بار بار چوم رہی تھیں۔ ان کے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھی بھج گئی تھیں جو آج بھی اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم تھا اس بے بس تڑپتی عورت کا گناہ گار تھا۔

”آخری بار تم نے اسے چھوا تھا۔“ وہ اب دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھیں۔ ساکت کھڑے ہشام قزلباش نے بیشکل آگے بڑھ کر صبیحہ کے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ چمڑائے تھے۔ ضبط سے خون رنگ ہوئی آنکھوں سے ہارون نے باپ کے چہرے پر پھیلی اذیت کو دیکھا تھا اور اگلے ہی بل میز میاں چڑھتا گیا تھا۔ صبیحہ کی کراہوں نے اسے کسی پاتال میں لے جا کر غرق کر دیا تھا۔

”اسے کوئی بد دعا مت دینا صبیحہ! ہمارے ساتھ وہ بھی مستقل اذیت کو سہتا آرہا ہے۔ میں مرتے دم تک تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی کی بھجک مانگتا رہوں گا مگر تم اسے.....“ آج پھر وہ بھجکتے لہجے میں

ان سے التجا کر رہے تھے جو ان کے سینے سے لگیں روتے روتے غم حال ہو چکی تھیں۔

☆.....☆

گہری نیند ٹوٹنے کا سبب شاید اس کی سانسیں بھی تھیں جو سینے میں پھنس رہی تھیں۔ سن دماغ اور وجود کے ساتھ وہ اب تک ان دردناک کراہوں اور تاریک ہیولوں کے درمیان گہری ہوئی تھی۔ چند لمحے اسی طرح ساکت رہنے کے بعد اس نے ایک نظر گہری نیند سوئے عارش کو دیکھا تھا اور پھولی سانسوں کو سنبھالتی اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلودہ تھی۔ اندر گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک بے بسی سے اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ یہ سب اب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اب پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ وہ جانتی تھی کہ کتنی بار خود کو مار کر اس نے زندگی کو اپنے موافق بنایا تھا۔ ہر سوچ ہر خیال ہر سوال کو کھرچ کر دل و دماغ سے نکال پھینکنے میں اس کو زمانے لگے تھے۔ خود کو چاک مار مار کر سدھایا تھا۔ ایک ایک کرچی کو سینے کے بعد وہ اب پھر سے بکھرتا نہیں چاہتی تھی۔ ایک نئی زندگی میں داخل ہو کر بڑی مشقتوں سے اس نے خود کو ایک سانچے میں ڈھالا تھا۔ کم از کم اب وہ اپنی اس نئی زندگی تک، ماضی کے کسی تاریک سائے کو رسانی حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ جو خلا تھا اسے اب کبھی نہیں بھرنا تھا۔ وہ یہ قول کر چکی تھی اسے قبول کرنا ہی تھا ورنہ اس دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اپنی زندگی کی وہ اب قدر کرتی تھی۔ زندہ رہنا اسے عزیز ہو چکا تھا۔ اب اس مقام تک آ کر وہ بار بار مرنے کی اذیت نہیں سہتا چاہتی تھی۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ان ابلہ نکالتے ہوئے وہ اپنے اعصاب کو مضبوط کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو رہی تھی۔ اس کا حال اس کے ماضی سے زیادہ طاقتور ہے اور اسے صرف اپنے حال میں جیتا ہے۔ اپنے مستقبل کو تباہ کرنا ہے جو گزر گیا سو گزر گیا۔ دھیرے دھیرے پانی کے گھونٹ لیتی وہ پرسکون ہونے لگی تھی۔ خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتی وہ چونک کر عارش کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا، بس پیاس لگی تھی اس لیے اٹھ گئی۔“ اس کے استفسار پر وہ بتا رہی تھی۔

”تم بالکل برف کی طرح سرد ہو رہی ہو۔“ اس کا ہاتھ تمام کر قریب کرنا وہ تشویش میں جھلا ہوا تھا۔

”مجھے تمہاری طبیعت بہتر نہیں لگ رہی۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، کبیل سے باہر تھی اس لیے میرے ہاتھ ٹھنڈے محسوس ہو رہے ہیں۔ تمہیں اب

مجھ سے دو۔“ اس کے بازو پر سر رکھے وہ بند آنکھوں کے ساتھ بولی تھی۔

”میں پریشان ہو گیا تھا۔“ اس پر کبیل ٹھیک کرنا وہ بولا تھا۔

”تمہیں پریشان ہونے کا شوق ہے۔“

”سن کر اچھا لگا۔“ اس کے مراض لہجے پر بند آنکھوں کے ساتھ بس مسکرائی تھی۔

(جاری ہے)



مہرین کنول

افسانہ

## سینے اور سالی نو

سبحو کل عی کینڈا سے آیا تھا چھ سال قبل وہ بڑے بھی بھالیا تھا۔ سب آہروالے، بازو اور احر پڑھنے گیا تھا۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہ ہیں اپنا (سبحو کے ماں باپ) اور چچا چچی احسن اور ہادیہ



تھی۔ سلوک ایک ہاتھ میں ڈرائیو تھا ہے اور ایک ہاتھ میں برش لیے بالوں کو سکھا رہا تھا۔ صبح ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔  
 ”ہماری جوتی کتنی اچھی لگتی ہے ناں؟“ آئینے میں اس کے ساتھ بننے والی شبیہ کو ہنوز دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”مجھے تمہاری یہ حرکتیں اور بے نگاہیوں سے چڑ

اس سے مل کر بہت خوش تھے۔ وہ صبح جلدی بیدار ہو گیا تھا۔ داش روم سے نہا دھو کر نکلا تھا بلیک کلر کی ڈریس پینٹ شرٹ گوری رنگت میں اس کا چہرہ خوب دکھ رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔  
 ”yes, come in“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر لگے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے کہا تھا۔  
 دروازہ کھول کر صبح ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی



دوست اشعر کی کزن تھی۔ کینیڈا میں ہی اشعر کی پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی، زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

☆.....☆

دوپہر کے کھانے کی ٹیبل پر سب ہی موجود تھے سلوٹو بھی اپنے کمرے سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل پر کرسی گھٹک کر بیٹھا تھا۔

”واہ آج کھانا لگتا ہے مام آپ نے بنایا ہے؟“  
سلوٹو نے مازہ کو مخاطب کیا جو اس کی پلیٹ میں تو رمد ڈال رہی تھیں۔

”نہیں بیٹا آج یہ سب کھانے تھیں نے بنائے ہیں“  
خاص تمہارے لیے۔ بڑی سعادت مندی ہے۔“  
مازہ نے شفقت سے بیٹے کو کہا تھا۔

”لیکن مجھے یہ کھانے بالکل پسند نہیں۔“ سلوٹو نے پلیٹ پر سے ہٹا کر تخت سے کہا۔

”لیکن بیٹا یہ سب تمہاری پسند کے کھانے ہیں تم تو بڑے شوق سے کھاتے ہو۔“ مازہ نے حیرت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی مام! لیکن مجھے تھیں کے ہاتھ کے کوئی پکوان نہیں پسند۔“ سلوٹو ناپسند لہجے میں کہہ کر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھیں اپنی آنکھوں میں آنی نمی کو چھپائے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”معاف کیجیے میں ذرا دیکھتی ہوں۔“ حیرت سے دیکھتے احسن اور ہادیہ سے نظریں چراتے ہوئے مازہ نے کہا تھا اور سلوٹو کے کمرے میں آئی تھی۔

”سلوٹو ایہ کیا تیزی ہے کیا بھی اخلاق سکھ کر آئے ہو کینیڈا سے نہ بڑوں کا لحاظ مروت کچھ نہیں تمہارے چچا بھی کیا سوچتے ہوں گے تمہارے بارے میں کل تھیں کی رہتی ہے وہ اب ہمیشہ کے لیے

تمہارے پاس آ جائے گی ایسے میں تمہارا رویہ ہر کسی کو ناگوار گزرے گا۔“ مازہ نے سلوٹو کو ڈپٹے ہوئے کہا۔

”سلوٹو فوراً آجینے کے سامنے سے ہٹا تھا۔  
”ہا ہا ہا ہا۔“ وہ بے اختیار ہنسی تھی اور پھر رے کی طرف بڑی گئی۔

”یہ لہجے چائے۔“ تھیں نے کیتلی سے چائے کپ میں ڈال کر سلوٹو کو دیتے ہوئے کہا۔

”میں چائے نہیں پیتا۔“ سلوٹو نے ناگواری سے تھیں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ تو ہر صبح چائے پینا پسند کرتے ہیں۔“  
تھیں کو حیرت ہوئی تھی۔

”مجھے تمہارے ہاتھ کی چائے پینا پسند نہیں۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ تھیں زیادہ بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں اس لیے چائے کا کپ واپس ٹرے میں رکھ کر بولی گئی۔

”happy new year“ تھیں نوا بیز کارڈ سلوٹو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔  
”مجھے یہ جو نچلے بالکل پسند نہیں ہیں۔ کیا جتنا چاہ رہی ہو؟“ سلوٹو نے کارڈ لے کر بیڈ کے ایک طرف بے دردی سے پھینکتے ہوئے کہا۔

”ایسی بھی کیا بے رخی، آپ کی بچپن کی مسکود ہوں، بھئی بچپن میں آپ ہم پر بہت مرا کرتے تھے ناں۔“ تھیں شرارت سے بولی گئی۔

”اب اپنی شکل لے کر یہاں سے چلی جاؤ“ میں بچپن کے نکاح کو نہیں مانتا۔ وہ سب صرف گڈے گڑیا کا عمل تھا، جسے ہمارے بڑوں نے کھیلا تھا میں بھول چکا ہوں تم بھی بھول جاؤ۔“ سلوٹو نے سفاکی سے کہا تھا۔

تھیں اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں آنی نمی کو صاف کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔  
تھیں کے جانے کے بعد سلوٹو نے اپنا موبائل اٹھایا اور ایک سٹاسٹافو ٹوڈ کیونے لگا، کتنا معصوم اور بھولا بھالا چہرہ تھا اس کا جسے تمکین حیدر کہتے تھے۔ اس کے

”کیا کہہ رہی ہیں آپ! میری اور سلج کی شادی! سلج کی رخصتی امپائل! اور مجھے بتایا بھی نہیں۔“ گویا سلج کو اوپر ہم چٹا تھا۔  
 ”مام! یہ رخصتی نہیں ہو سکتی، میں سلج کو پسند نہیں کرتا۔“ سلج نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔  
 ”ہمارا ارادہ تمہیں سر پر اتار دینے کا تھا مگر تمہیں نہ جانے کیا پریشانی ہے سلج سے، جب سے آئے ہو سلج سے ٹھیک طرح سے سلوک نہیں کرتے وہ تمہاری منکوحہ ہے بچپن میں ہی تم دونوں کا نکاح کر دیا گیا تھا“ یہ سب تمہیں پتہ ہے میں اب مزید تمہاری ایک نہیں سنوں گی کل شام ہی رخصتی کی ہے رخصتی تم تیار رہنا۔“  
 ”مام! یہ سارا فساد وہ نکاح ہے جو سلج کے ساتھ بچپن میں ہوا تھا، میں ابھی جا کر اسے طلاق.....!!“  
 ”چٹاخ!“ ایک چھڑکھجوت کے گال پر مازہ نے مارا تھا۔

”اتنی بڑی بات تم سوچ بھی کیسے سکتے ہو اگر ایسا کیا تو میرا اموازا دیکھو گے۔“ مازہ سلج کو ہکا بکا چھوڑ کر چلی گئیں۔ سلج نے مہم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ رخصتی نہیں ہونے دے گا۔

صبح شام میں ہونے والی تقریب کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سلج کو ناشتہ کرانے کے بعد مازہ اسے ایک دیدہ زیب لباس دے کر اسے تاکید کر کے چلی گئی تھیں اور دوسری طرف سلج سہانے خواب ملنے کی خوشی میں تیار ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ شام بھی ہو چلی تھی۔ مہمانوں کی آمد بھی ہو رہی تھی۔ کیا کیا نہ آرائش اور زیبائش کی گئی تھی۔ مہندی چڑیاں، بندیا، نت جھومر، رانی ہار، جھمکے، انگوٹھیاں، پائل اور پنک کٹر کا خوبصورت سا بھاری نقیس کام کا شرارہ۔ اس پر پوری لہن کا نکھار آیا ہوا تھا۔

مازہ سلج کو دیکھ کر سلج کے کمرے میں آئی تھیں۔ ”سلج..... سلج بچا!“ مازہ نے کمرے کا

جائزہ لیا۔ وہ کہیں موجود نہ تھا۔ اچانک مازہ کی نظر ٹیبل پر رکے کاغذ پر پڑی وہ اسے اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

”مام! جس وقت آپ میرا خط پڑھ رہی ہوں گی، میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔ میں سلج کو پسند نہیں کرتا۔ میں کینیڈا واپس جا رہا ہوں۔“ مازہ کے ہاتھ سے خط گر چکا تھا۔

سلج کو جب یہ پتہ چلا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ احسن اور ہادیہ، بیٹی کے غم میں پاگلوں کی طرح مازہ اور احمر پر برس پڑے۔

”بھائی صاحب اور بھابی ہم نے اپنی بیٹی آپ کو کیا اس لیے سوچنی تھی کہ ایک دن آپ کا بیٹا اسے یوں بھری محفل میں تماشہ بنا کر چھوڑ کر چلا جائے۔ ہماری بیٹی کی زندگی برباد کر دی سلجوت نے۔“ احسن نے احمر اور مازہ کو کھنور پین سے لڑا۔

”نہیں بابا جان! اس میں تا تا لہ اور تاکی اسی کا کوئی قصور نہیں، سلجوت نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا ہے میرا ان سے نکاح ہوا ہے نکاح کے وقت عمریں ہی کیا تھیں۔ میری گیارہ سال اور ان کی اٹھارہ سال میری رخصتی وقت پر چھوڑ دیجیے۔“ مہمان تو سلجوت کے جانے کا سن کر چہ گویاں کرتے چلے گئے تھے۔ احسن اور ہادیہ منہ بنا کر اپنے کمرے میں چلے آئے اور مازہ اور احمر، سلج کو خود سے لگائے اپنی نالائق اولاد پر آنسو بہاتے رہے۔

☆.....☆

”سلجوت یہ بریسلٹ کس کے لیے لے رہے ہو؟“ جیولری شاپ پر کھڑے سلجوت کو بریسلٹ خریدتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”وقت آنے پر بتا دوں گا۔“ سلجوت نے رازداری سے کہا تھا۔

”اور یہ کب آئے گا وقت؟“ اشعر نے معنی خیزی

چلا رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا کہ ایک فیملی فوٹو ہاتھ میں آئی اس سے پہلے کہ اسے پہچانے ہاتھ روک لیا اپنے ماں باپ اور چچا چچا کے پر شفیق چہرے جیسے اسے دیکھ رہے ہوں اور ان کے ساتھ ایک معصوم چہرہ شریہ آنکھیں لیے اس سے سوال کر رہا تھا۔  
 ”سلوٹو دل ٹوٹنے کا مزہ چکھا؟ کیا لگ رہا ہے؟“ سلوٹو کی آنکھوں سے سِل رواں تھا جو اس کے چہرے کو گِلا کر رہا تھا اور کب وہ نیند کی دایوں میں چلا گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

☆.....☆

”سلوٹو آفس سے سیدھا گھر پہنچا تھا۔ عاقب، سلوٹو کا خالہ زاد کزن پاکستان سے آیا تھا اس کے گھر پہلے سے موجود تھا۔  
 ”ارے عاقب تم یہاں کیسے؟“ سلوٹو نے حیرت اور خوشی کی کئی جلی کیفیت سے پوچھا تھا۔  
 ”بھی تم سے سخت ناراضی کا اظہار کرنے آیا ہوں تم اتنے بڑے بڑول نکلو گے میں نے سوچا بھی نہیں تھا آخر کیا برائی تھی شیخ بھائی میں؟ تو کہتا ہوں جا کر دیکھو وہاں پر تمہارے ماں باپ کی جو تم نے ان کی خدمت کرنی تھی وہ بھی شیخ بھائی سر انجام دے رہی ہیں اگر کچھ شرم سے تو جیلے جاؤ وہاں۔“ عاقب یہ کہہ کر وہاں سے چلا بنا سلوٹو جیل سا ہو کر شیخ کی فوٹو کو تکتا مخاطب ہوا۔

”لگتا ہے آپ ہمارا انتظار کر رہی ہیں، اب آپ کا انتظار ختم۔“ اور پھر سب حیران رہ گئے سلوٹو ایسا کب لوٹ آیا۔ مازہ اور باد یہ کی آنکھیں اٹکبار تھیں سلوٹو نے ان کو کہا تھا۔  
 ”آپ رخصتی کی تیاری کیجیے۔“ سلوٹو نے ماحول

نوٹو اور کیا تھا۔ اس بات پر احسان اور اصرار نے سب کچھ بھلا کر اس کو گلے لگالیا۔ شیخ نے اس کی آمد کا سنا تو خوشی کے بجائے اس کے آنسو رواں ہو گئے۔ مازہ

سے کہا۔  
 ”بہت جلد۔“ سلوٹو نے شاپ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اشعر کو اس کے گھر ڈراپ کر کے سلوٹو حکمین حیدر کے گھر آیا تھا۔ حکمین آئے روز اس کا استقبال کرتی سلوٹو کے لائے ہوئے گفٹ لے لیتی اور کبھی کبھی ریٹورنٹ بھی جاتی اور کبھی بھاری شاپنگ کرتی۔ سلوٹو دل کے ہاتھوں مجبور اس کے خُزے اٹھاتا۔ ایک دن سلوٹو کا دل ٹوٹا تھا حکمین کے گھر اس نے اس کا رشتہ مانگا تھا۔

”حکمین اپنے کزن کے ساتھ منسوب ہے۔“ حکمین کی ماں نے ہی سلوٹو کو بتایا تھا۔ حکمین نے بھی بے رخی برتی تھی۔ اشعر بھی وہاں موجود تھا اور سلوٹو پر غصہ ہوا تھا۔

”سلوٹو مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا کہ تم حکمین میں انٹرسٹ ہوتا کہ میں تمہیں پہلے روک لیتا۔“ اشعر نے نوحہ سے کہا۔

”لیکن کیوں، اگر مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا تھا تو مجھ سے وہ ختے کیوں لیے گئے اور حکمین اتنے آرام سے میرے ساتھ شاپنگ اور ریٹورنٹ کیوں جاتی تھی؟“ سلوٹو کو بھی غصہ آیا تھا حکمین سے زیادہ خود پر کہ وہ کیسے اتنی کٹھور اور بے مروت لڑکی کے جھانسنے میں آ گیا۔

”تم سے وہ ختے کسی نے نہیں مانگے تھے، تم خود لاتے تھے۔ شاپنگ اور ریٹورنٹ بھی خود لے کے جاتے تھے۔ آئندہ یہاں قدم مت رکھیے گا۔“ حکمین نے سلوٹو کو دو ٹوک لہجے میں کہا۔ اشعر الگ منہ سے ہنس رہا تھا۔

سلوٹو بڑی ریش ذرا یوگ کر کے گھر پہنچا تھا۔ آنکھوں میں آنی نمی کو روک نہیں پارہا تھا۔ اپنے کمرے کی ہر چیز اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔ سچ رہا تھا،



سلجوق خمار لہجے میں گنگنا ہوا ایک ڈائمنڈ  
بریلیٹ سلجوق کو پہنانے لگا۔

”چھوڑ دس میرا ہاتھ۔“ سلجوق نے ہاتھ چھڑانے  
کی کوشش کی تھی۔

بھئی آپ ہماری منکوحہ ہو، کل آپ کی رخصتی ہے  
بارات لے کر آؤں گا تیار رہنا۔“ یہ کہہ کر سلجوق  
کمرے سے نکل گیا اور سلجوق انکسٹ بدعلاں رہ گئی۔

سلجوق دھوم دھام سے بارات لے کر ہال میں آیا  
تھا۔ رخصتی شاندار ماحول میں ہوئی تھی کہ سب کی  
آنکھیں خوشی سے انگھار تھیں۔ سلجوق وہیں بنی سلجوق کی  
سچ پریشانی تھی۔ سلجوق کمرے میں داخل ہوا تھا سلجوق کی  
آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”آہ ہم!“ سلجوق نے گھاٹھنکارا۔ سلجوق نے پگلیں  
اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سلجوق نے ایک قطعی ڈیبا کھول کر  
ڈائمنڈ رنگ سلجوق کی انگلی میں پہنا دی۔

”سال نو مبارک ہو سلجوق!“ ایک نواہیز کارڈ سلجوق  
کے ہاتھ میں تھا جسے وہ سلجوق نے کہنا شروع  
کیا۔

”سلجوق ہاسٹی میں جو مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں وہ  
دوبارہ نہیں دہرائی جائیں گی۔“ سلجوق نے سلجوق کا  
ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”ودعدہ!“ سلجوق نے کہا۔  
”نکاودعدہ آؤ اب ہم تینوں خوشی کی بہاروں کو ایک  
ساتھ well come کریں۔“

”تینوں؟“ سلجوق نے حیرت سے پوچھا۔  
”میں ہم اور سال نو ہا ہا ہا۔“ سلجوق اور سلجوق مسکرا  
دیے تھے۔

سال نو ان کی نئی زندگی کی شروعات میں ساتھ  
ساتھ تھا۔

☆.....

نے اسے آکر سلجوق کے لیے پکوان بنانے کے لیے  
کہا اور سلجوق منع نہ کر سکی۔

”واہ بہت خوب یہ قورمہ کس نے بنایا ہے؟“  
سلجوق نے کھانا کھاتے ہوئے بازو سے پوچھا۔

”پہنا پہنچنے نے بنایا ہے مگر تم کو تو اس کے ہاتھ کا  
کسا پہنڈ نہیں، میری طبیعت ڈرانا ساز بھی اسی لیے  
سلجوق سے کہہ دیا تھا۔“ بازو نے سادگی سے کہا تھا۔

”مام! سلجوق واقعی بہت اچھا کھانا بناتی ہے  
after اب اسی کے ہاتھوں سے زندگی بھر کھانا  
ہے۔“ سلجوق کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا اور سلجوق  
وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

رات کو سب سے نظرسیمیا کر سلجوق سلجوق کے  
روم میں آیا۔ سلجوق اپنی سوچوں میں کم ڈریکٹ ٹیل پر  
لگے آئینے کے سامنے بیٹھی تھی کہ اچانک ایک اور

شہید اس کے سامنے بنی تھی۔  
”ہماری جوڑی تھی اچھی لگتی ہے نا؟“ سلجوق  
نے شرارت سے کہا۔ سلجوق کے بے اختیار ہٹنے پر سلجوق  
حکا اٹھا تا قہقہہ لگنے لگا۔

”آپ یہاں سے چلے جائیں مجھے ایسی حرکتیں  
پسند نہیں۔“ سلجوق نے ناگوار سی کہا۔

”ایسی بھی کیا ہے رنی، مجھے میرے بھائی سے  
پہلے تم ہم پر بہت مرا کرتی تھیں نا؟“ سلجوق نے  
شرارت سے کہا۔

”دیکھیے میری نقل مت اتار دینے کیا جتنا چاہ  
رہے ہیں آپ؟“ سلجوق نے ہڈھکھو انداز میں پوچھا  
تھا۔

ہم نہ رہے ہم جو تھے کبھی  
خود کو چھوڑا پیچھے کہیں  
تیری اور بڑھنے لگے  
تیری طرح بننے لگے  
اب تو محبت میں لٹنے چلے

# الغزل

”ارے غمیزا تم نے قمر ماں کی دہن کو دیکھا“  
 ارے کروڑوں کا جہیز اپنے ساتھ لائی تھی، کرین کے  
 ذریعے جہیز اڑا تھا..... کرین کے ذریعے؟“ مونے  
 بھدے نقوش والی عارفہ رحیم اپنی مردانہ آواز کے



چاہے، بس آپ دو کپڑوں میں اپنی بیٹی کو بیاہ کر  
ہمارے حوالے کر دیں لیکن اس بندے نے بھی اپنی  
شان دکھا دی، بیٹی کو اتنا جہیز دیا کہ سب کی آنکھیں  
پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔“

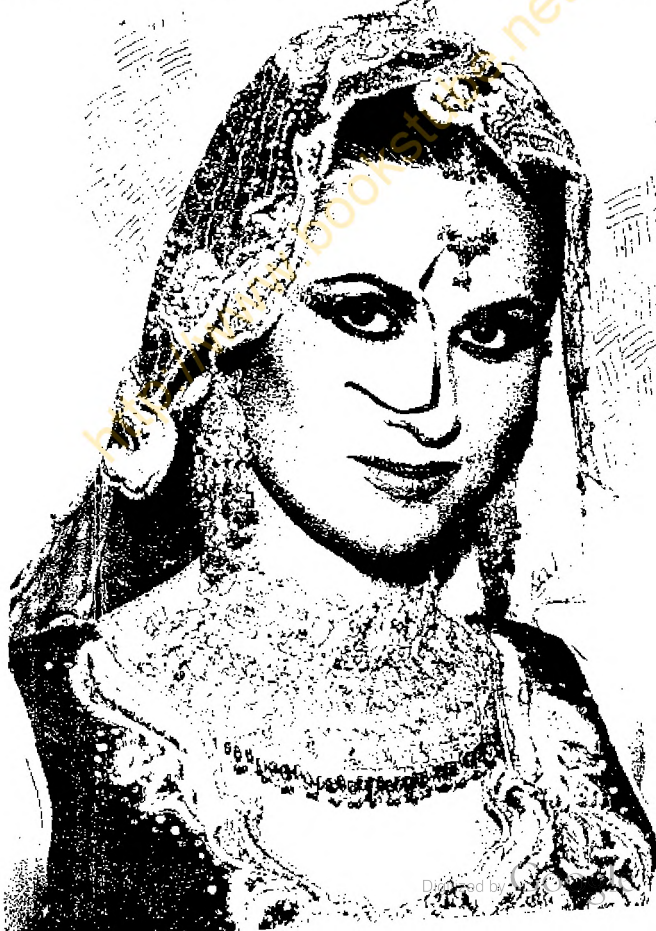
عارفہ رحیم اپنے بیٹے کی دلہن کا ذکر ایسے خرد غرور  
سے کر رہی تھیں کہ جیسے وہ خودی کرین سے جہیز لے  
کر اتری تھیں۔

”ارے عارفہ! تم نے وہ برابر والی مدیحہ باجی کو  
نہیں دیکھا کس قدر جہیز دیا ہے انہوں نے اپنی بیٹیوں  
بیٹیوں کو اور کیا فانیو اسٹار ہوٹل میں اپنی بیٹیوں بیٹیوں

ساتھ جو گفتگو تھیں۔

”اور یہ بھی نہیں کہ قمر میاں کی دلہن کوئی بد شکل یا کم  
شکل لڑکی تھی جس کی خانہ پوری کے لیے اماں بابا نے  
بیٹی کو جہیز سے لاد دیا ہو، ارے میں تو کہتی ہوں ارشد  
بھائی کی بہو چاند کا گلہوا ہے چاند کا گلہوا۔“ وہ اپنی پھولی  
سانسوں کے ساتھ تھوڑی دیر کو رکی اور ایک دم سے  
پھر شروع ہو گئی۔

”ارے ارشد بھائی نے تو صاف کہہ دیا تھا لڑکی  
والوں سے کہ ہمیں جہیز دینے کا کچھ نہیں چاہیے۔ اللہ کا  
دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے، میں تو بس آپ کی بیٹی



کی شادی کی واہ واہ! شہینہ بیگم نے بھی عارفہ بیگم کی تائید میں ایک اور المدار پارٹی کا قصہ چھیڑ دیا۔  
 ”ہاں ہاں شہینہ! مجھ سے زیادہ اور کس کو علم ہوگا اس بات کا اور تمہیں پتہ ہے وہ بے چاری تھی کیا؟ ایک معمولی اسکول ٹیچر زمانہ دلکش عیش گزر رہا تھا ان کی بیٹیوں کی شادی پر۔“ عارفہ رحیم نے اپنی بات ختم کر کے داؤد طلب نظروں سے شہینہ کی طرف دیکھا۔ تو شہینہ بیگم نے بھی ان کی تائید میں بولنا اپنا فرض سمجھا۔

”ہاں عارفہ! بڑی محنت کی اس غریب عورت نے ایک معمولی اسکول ٹیچر ہو کر پانی پانی جوڑ کر لاکھوں کا جہیز بنایا ہے اس عورت نے اپنی بیٹیوں کے لیے۔ ویسے عارفہ سنا ہے تمہاری بہو بھی بڑے المدار گھرانے سے آئی ہے پھر تو کھر بھر دیا ہوگا اس نے تمہارا؟“ شہینہ بیگم راز داری سے عارفہ رحیم کے قریب ہوتے ہوئے سر کوئی والے انداز میں گویا ہوئیں تو عارفہ رحیم جیسے پیش میں آ کر پھٹ سی پڑیں۔

”ارے بس بس رہنے دو شہینہ! کہنے کو بڑی المدار ہے چار چار بھائی ڈاکٹر، انجینیر ہیں۔ باپ اتنا بڑا بزنس من ہے اور بیٹی کو دیا کیا ہے ایک معمولی سا بیٹا روم سیٹ اور بس! ایسا لگتا ہے جیسے کسی تعمیر کی بیٹی کو بیاہ کر لے آئے ہیں۔“

”آف میرے خدا یاد ہوتی ہے کسی بات کی۔“ زارا کہنے بھر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی ساس عارفہ رحیم اور پڑوسن شہینہ بیگم کی باتیں سن رہی تھی جس دن سے وہ اس گھر میں دکن بن کر آئی تھی اس دن سے آج تک عارفہ رحیم نے اس کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دولت مند لڑکی ہونے کے باوجود بھر پور طریقے سے جہیز نہ لانے کے طے دیتی رہتی تھیں اور پھر اسی پر ہی برا بھلا کہنے پر اکتفا نہ کرتی، بلکہ ہر آنے جانے والے لئے جلتے والے پڑوسی سے بہو کے معمولی جہیز لانے کا رونا روتی رہیں اور خاص طور پر شہینہ آئی اور زبیدہ کے

ساتھ مل کر اسے سنانے کے لیے کرین اور ٹرل بھر کر جہیز لانے والی لڑکیوں کے سچے جھوٹے قصے سنایا کرتیں اور وہ پانچ سال سے ان کی یہ کڑوی سی باتیں خاموشی سے سن رہی تھیں اور غصے کا کھوٹ بی رہی تھیں۔ حالانکہ یہ تو چاہتا تھا کہ ایسی جاہل عورتوں کو چیخ چیخ کر گالیاں دے اور کوسے لیکیں پھر وہی سسرال کا مسئلہ آڑے آ جاتا وہ نصیر سے ان کی جاہلانہ حرکتوں اور رویوں کی شکایت کر کے گھر میں جھگڑا فساد نہیں کرانا چاہتی تھی، اپنا اور اپنے مایاں کا سکون برباد نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے تو وہ صبر کا کھوٹ خاموشی سے بی رہی تھی۔ گھر کی بڑی اور بزرگ ہونے کے ناتے وہ عارفہ بیگم کو کچھ تو نہیں کہتی تھی ہاں احتجاجاً کہنے دو کھٹنے کی جو بیٹھک گھر والوں کے ساتھ ہوتی تھی جس میں وہ ایک اچھی بہو ہونے کے ناتے انہیں تھوڑی بہت کہنی دینے کی غرض سے شرکت کر لیتی تھی وہ احتجاجاً ضرور ختم کر دیتی تھی اس کی ساس عارفہ رحیم اور نندہ شہینہ بیگم جہالت کی وہ منہ بولتی تصویریں تھیں کہ شیطان بھی پناہ مانگتا نظر آتا تھا۔

ہر آنے جانے والوں اور ملنے جلتے والوں سے وہ دونوں اس کی برائیاں کرتی تھیں ہی لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جب گھر کے کمیزوں سے فارغ ہو کر گھنٹہ دو گھنٹہ ان کی کہنی میں گپ شب لگانے کی غرض سے آ بیٹھتی تو دونوں نندہ اور ساس باری باری شروع ہو جاتیں بھی جہیز و مال دولت کا موضوع چھیڑ کر تو بھی حسین و جمیل حور پر لڑکی کا ذکر جو ان کے بھائی بیٹے سے شادی کے لیے مری جا رہی تھی تب زارا کے لیے دو منٹ بھی دہاں مزید بیٹھنا دو بھر ہو جاتا لیکن وہ پھر بھی بڑی ہمت اور صبر کے ساتھ بیٹھتی ان کی گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش میں لگ جاتی اور پھر گھنٹے آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی لیکن اب حد ہو گئی تھی اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے کھاتے پیتے جہاں اس کا سامنا

ہوتا ماں بیٹی کی لعن طعن شروع ہو جاتی کچھ نہیں تو اپنے پاس بٹھا کر پلاننگ کے تحت دونوں ماں بیٹیاں شروع ہو جاتیں۔

”امی آپ کو یاد ہے سسلی آئی نے جو بھینٹا کا رشتہ دیکھا تھا کتنی بڑھی لکھی اور حسین لڑکی تھی نا اور گھریا دے آپ کو ہزار گز کا۔ کوشی کیا بھی پورا محل لگ رہا تھا قیمتی نوادرات سے ساجھل اور لڑکی کیا تھی۔“

”ارے اسے چھوڑو! جنہیں وہ وکیل صاحب کی لڑکی یاد ہے کیا لڑکی تھی اور کیا دولت کی ریل پیل تھی ارے کئی تو پیڑوں پر چل رہے تھے اس کے باپ کے اور کتنی سنت ساجت کر رہے تھے وہ لوگ لیکن بس اپنی قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔“

”میں سالن کا چولہا لگا کر دوں؟“ عارفہ رحمہ منہ سرورے سرورے کہیں تو وہ سالن دیکھنے کے بہانے وہاں سے اٹھ جاتی۔ ان کے منہ جو نہیں لگتا چاہتی تھی اور پھر لگ کر بھی کیا کرتی ادھر وہ کچھ کہتی ادھر وہ دونوں عورتیں مل کر ذرا سی بات کورانی کا پھاڑ بنا کر اس کے میاں کے کان بھرنا شروع کر دیتیں اور پھر خواہ مخواہ ہی ایک ہنگامہ اور فساد کی فضا پیدا ہو جاتی اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ خاموشی سے خون کے کھونٹ پیتی رہے اور کم سے کم ان کی جاہلانہ کھنٹی میں اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرے لیکن آج تو حد ہو گئی تھی۔ زارا کچن میں جانے کے لیے کوریڈور سے گزر رہی تھی کہ عارفہ رحمہ اپنی خالہ زاد بہن نبیلہ کے ساتھ مل کر منہ بھر بھر کر اسے خوب برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ تب ہی اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔

”ارے جنہیں کیا پڑے نبیلہ! دیکھنے کو مصحوم ہے اندر سے کتنی کاتیاں اور بھری ہوئی ہے ارے مجال ہے جو غلطی سے بھی کبھی ساس تندوں کے پاس بیٹھ جائے“ غرے تو دیکھو مہارانی صاحبہ کے کل کی چھو کر ایسے اکڑتی پھرتی ہے جیسے اپنے ساتھ لاکھوں کا جہیز لائی ہو۔“ لے دے کہ عارفہ رحمہ کی ٹانگ بھر جہیز پر

آ کے ٹوٹی۔

”ارے دو دو بھائی ڈاکٹر انجیتر ہیں باپ بزنس میں ہے اور جہیز دیکھو بیک بنگلوں والا کل کی چھو کر اور اکڑو دیکھو شرم تو ذرا آتی نہیں ہے۔“

”اف میرے خدا! اتنی بے عزتی! اتنی اسٹلٹ اب بہت ہو گیا اب یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے آج تو وہ ان کو آئینہ دکھا کر رہے کی اب چاہے اس کا گھر بے یا اجڑے۔“

”آئی ہے بہت شرم آئی ہے مجھے آپ بھی عورتوں کی سوچوں پر، حرکتوں پر آپ بھی عورتوں کی بے حسی اور سفاکی پر بہت شرم آئی ہے مجھے عارفہ بیگم! آپ بھی عورتوں کو ایک مسلمان قوم کا فرد کہتے ہوئے جو کہنے کو تو خود کو مسلمان قوم کا فرد کہتے ہیں لیکن فعل اور عمل کا فرد اور جاہلوں سے بھی بدتر ہیں شرم آئی ہے مجھے آپ جیسے لوگوں کو انسان کہتے ہوئے جو انسانیت کے نام پر بد نما دھبہ ہیں۔ شرم آئی مجھے اپنے آپ پر جو ایک مسلمان ہونے کے نام پر اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سنت کی پیروی کرنے کے بجائے جنہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کو جہیز میں صرف ایک لوٹا جائے نماز اور چٹائی دی تھی اور میں ان کی سنت اور احکام کے خلاف بیڈروم سیٹ اور ٹی وی بنوڑ لائی۔ شرم آئی ہے مجھے اپنے آپ پر مسلمان کہتے ہوئے جس نے اللہ اور نبی کے احکام بھلا کر دنیا کے خوف اور دکھاوے کے لیے عمل کیا۔ شرم آئی ہے مجھے اپنے آپ پر آپ لوگوں کی سوچ پر.....!!“ زار و قطار روئی ہوئی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور عارفہ بیگم اپنی کزن نبیلہ کے سامنے شرم سے نکالیں جھکائے اپنے کیے پر شرمندہ بیٹھی تھیں۔ اس کل کی چھو کر نے ان کو ان کی اوقات جو یاد دلادی تھی۔

☆.....



# بہارِ لہو

غصہ نے بھی بھر باجرے کے دانے چڑیوں کے  
میں چبے ننھے منے کیڑے کوڑے کھا رہی تھیں لیکن  
غول کی طرف اچھال دیے جولان کی لمبی لمبی گھاس  
اسے حریت کا جھلکا لگا جب اس کے پھینکے ہوئے



ایسا کیا تھا ان دانوں میں جو انہیں دھکا رو دیا گیا تھا؟  
وہ سمجھ نہ سکی۔

☆.....☆

وہ بچپن سے ذہین تھا۔ بے تحاشا ذہین، جس عمر  
میں بچے ایک کر بولنا سیکھ رہے ہوتے ہیں اس عمر  
میں وہ روانی سے انہیں تقریباً یاد کر کے سنا تا۔

Twinkle Twinkle Little Star اور

دانوں کو چکنے کے بجائے ساری کی ساری چڑیاں  
آسمانوں کی طرف پرواز کر گئیں۔ یوں جیسے مٹی بھر  
باجرے کے دانے تلکتی ہوئی چنگاریاں ہوں۔ صبح  
سے شام ہو مٹی لیکن کوئی برعہ ان دانوں کو کھانے  
نہیں اتر اتری کہ کوئی چوٹی مٹی انہیں نہیں لے کر گئی۔  
باجرے کے وہ چند دانے گھاس میں پڑے رہ گئے۔  
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو کھانے کا حکم نہیں دیا گیا



**Humpty Dumpty** اسے ازبر تھیں۔ اماں حیران

ہوئیں اور سورتیں پڑھ پڑھ کر اسے دم کرتیں۔ نظر اتار تھیں  
برہنچے گلے میں سورۃ الناس کا تنوید ڈالتیں۔ ایک ہی تو  
بچہ تھا وہ بھی شادی کے آٹھ سال بعد ہوئے والد اول دجان  
سے پیارا تھا۔ ابا البیتہ فخر کرتے تھے۔ ایسا ذہین و فطین بچہ  
جو ملا تھا انہیں جہاں جاتے کاندھے پر سوار وہ ساتھ ہوتا۔  
پر پڑ بائیں کرتا، ہرگز رتا بندہ رک رک کر دیکھتا تھا۔

”ارے سلیم صاحب یہ آپ کا بیٹا ہے؟ ماشاء اللہ  
کیسا پیارا بچہ ہے۔“

”ارے دیکھو، ہاں وہی بچہ وہ جو کاندھے پر سوار  
ہے۔ کیسی صاف زبان ہے۔“

”اوئے ہوئے آج پایا کے ساتھ زین آیا ہے۔  
چلو اکل کو لقمہ بناؤ۔“ ابا فخر سے چلتے، فخر سے سب  
سننے، شکر کرتے ابویں کہتے ہیں اولاد فتنہ ہے۔ ایسی  
پیاری اولاد کیسے فتنہ ہو سکتی ہے۔ پھر وہ اسکول میں  
داخل ہو گیا۔

وہاں بھی یہی حال رہا۔ ننھا مٹا سا زین سلیم  
ساروں کی آنکھوں کا تار مار فتنہ پورا اسکول اسے  
جان گیا۔ ہر کوئی اس کا خیال رکھنا فرض سمجھتا کوئی  
پاس سے گزرا چاکلیٹ تھما دی۔ لقمہ سنی اور ٹافی کھلا  
دی۔ بریک میں اپنے ساتھ پراٹھا کھلایا۔ کیسا پیارا  
ہے ہاں؟ کیسی پیاری بائیں کرتا ہے۔

اور زین میاں کو ساروں کے نام ازبر تھے۔  
نیل آنکھوں والی زویا، موٹا سا اسد، لمبی کی 5th  
کی مار بے، دانش، ظہیر، عجبک والا علی اور زویا، اسد ظہیر  
وغیرہ خوش رہے کہ زین کو وہ یاد ہیں۔

پڑھائی میں تو میں نے پہلے عرض کی کہ وہ بے  
مثال تھا، کوئی ہم سری کرنے والا نہیں تھا اس کی، ہر  
سوال کا جواب موجود تھا۔ بچے درود کر سوتک لفظی یاد  
کرتے اور زین کو ہزار لاکھ تک کی باتیں معلوم  
تھیں۔ اردو کا سبق بغیر اگلے فقرہ پڑھ لیتا، ہاتھی بچے  
وہی سبق چار سو اٹھتر غلطیوں کے ساتھ تین دن میں

پڑھتے۔ مانو کوئی لپیٹ فرٹ تھا دماں میں۔ مٹا۔  
تک، سوال انڈیکس اور کلک کرتے ہی جواب حاضر۔  
ایسا بچہ پیارا کیوں نا ہوتا سب کو، سو پیارا تھا سب  
کو۔ تین سال میں پانچ جماعتیں پاس کر ڈالیں۔  
پانچویں کے امتحان میں پورے سو بے میں اول رہا۔  
دیکھ لاء، مبارک بادیں ملیں اور ہر طرف واہ۔  
واہ..... ہو گئی۔

ابا کا سینہ پھیلنا چلا گیا۔ فخر سے، خوشی سے، اماں  
کی چھوٹیں بھی بڑھ گئیں۔ ماشاء اللہ آٹھ سال کا تھا  
اور بغیر اگلے فقرہ انگش میں بات کرتا تھا۔ خاندان  
میں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی تو وہ خاص طور پر  
دعو کیا جاتا تھا۔ زین زین ہی ہر طرف۔

آنکھوں جماعت میں ایک بار پھر معرکہ کیا،  
پورے ملک میں چوتھی پوزیشن پر آیا تھا۔ وزیر اعظم  
صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے شیلڈ دی تھی۔  
اماں، ابا شکر کرتے نہ جھگھتے تھے۔ آٹھ سال کے ممبر  
پر کیسا اچھا انعام ملا تھا ناں۔

☆.....☆

ابا اور اماں کسی شادی میں شرکت کی غرض سے  
اسلام آباد آگئے تھے۔ وہ امتحانوں کی وجہ سے کمرے  
تھا۔ اسکول سے واپس آیا تو بازی پلٹ چکی تھی۔  
اماں ابا کے خون میں تر ہٹ لائے، وہ رو بھی نہ سکا۔  
صدے کے مارے برف کی سیل کی مانند رہ گیا۔ بخ  
شعنا..... بغیر کسی احساس کے۔

قسمت تھی، قسمت سے کون لڑتا؟ جیسا بھی ذہین  
و فطین ہو۔ نہیں لڑ سکتا۔ وہ بھی نا لڑ سکا۔ ورنہ بچا لیتا  
اپنی اماں کو ابا کو۔

وہ اکیلا تو رہ گیا تھا مگر.....  
”میں ابا کی طرح ہوں تمہارے لیے زین۔ فکر  
مت کرو۔“

”مجھ سے کہنا، جو بھی چاہے ہو۔“  
ماموں، چاچا، خالا میں سب موجود تھے۔ پھر اکیلا

اس کے کالج میں ریاضی کے نئے استاد آئے تھے۔

”سر عمران علی۔“

وہ بہت عرصے سے تھے۔ شائستہ سے، دھیمہ سا بولنے والے، ساری کلاس کے غورٹ تھے اور پھر رفتہ رفتہ پورے کالج کے غورٹ بن گئے تھے۔

”سر عمران کو دیکھا کہیں؟“

یہ چائے..... سر عمران کے لیے۔“

”سرا جھگے رہے ہیں۔“

ہر طرف ”سر عمران سر عمران“ ہو گئی۔

اور زین سلیم؟ وہ زبانوں سے اترنے لگا۔

اور زین سلیم جس نے آج تک صرف اپنے ارد گرد طواف دیکھے تھے۔ اپنی پوجا کروائی تھی۔ زبانوں سے ”زین..... زین..... کی پکاریں سنی تھیں، وہ زین سلیم ششدر رہ گیا۔

”ایسے کیسے سر عمران نے اس کی جگہ لے لی؟“

وہ حیرت سے سوچتا، پھر غصہ آنے لگا بے تحاشا غصہ۔

”میں اتنا ذہین اور وہ.....“

پاگل سمجھ نہ سکا کہ استاد اور شاگرد میں کیا مقابلہ؟ اور پھر وہ دل ہی دل میں ان سے بے تحاشا نفرت کرنے لگا۔ کلاس میں، باہر یا کہیں بھی وہ نظر آجاتے تو وہ غصے سے گھورتا نظر انداز کرنے کی اداکاری کرتا، کالج میں ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی تھی۔ وہ ہر طرح زین بن چکے تھے۔

اور پھر اس سال کالج کے بہترین استاد کی ٹرائی بھی انہی کا مقدر بن گئی۔ بہترین طالب علم آج بھی وہی تھا لیکن اسے کوئی خوشی نہ ہوئی اپنی ٹرائی لے کر، اسے غصہ آیا سر عمران کی ٹرائی دیکھ کر۔

انہیں نیچا دکھانے کی وہ سازشیں بکے لگا، انہیں غلط ثابت کرنے کی، انہیں بے عزت کرنے کی۔

”اور اس دن..... وہ ریاضی کی کلاس لے رہے

کیسے؟ آٹکھ کا تار اتو وہ پہلے بھی تھا۔ اب ہتھیلی کے چھالے کی مانند تھا۔ چاچو نایا اپنے بچوں کے لیے بعد میں کچھ لاتے پہلے زین کے لیے آتا۔ نائی اماں پہلے کھانا اسے دیتی، چاچیاں اس کے لیے کاپیاں پہلے سے موجود رکھیں، پکڑے جوتے، غرض کوئی کمی نہ تھی۔

قدرت نے اسے چمچر بھاڑ کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ بھول گیا وہ اور زخم جتنے مرعی گہرے ہوں، منہ دل ہو ہی جاتے ہیں۔ گھاؤ بھری جاتے ہیں۔

میٹرک میں ٹاپ کر لیا زین سلیم نے، پورے ملک میں سب سے اوپر تھا زین سلیم۔ سلیم رضا کا اکلوتا اور ذہین و فطین بیٹا، انعامات ملے، تحائف و تحائف صدر صاحب نے اپنی جانب سے دس لاکھ کا چیک دیا۔ ایک اور ہازی جیت لی کسی اس نے۔

☆.....☆

وہ بے تحاشا ذہین ہے۔

یہ اس کا فخر بن گیا اور پھر غرور۔

”ہاں میں ذہین ہوں۔ فاتح ہوں۔“

وہ خود سے کہتا اور ہر زمین پر نہ سکتے۔ ایسی قابلیت ہر کسی میں تو ہڑی ہوتی ہے۔ کوئی کوئی ہوتا ہے ایسا جیسا وہ تھا۔ زین سلیم۔

ایک بڑے کالج میں داخلہ مل گیا اسے، بادشاہوں کے سے شاہد ہو گئے اس کے، ہاں وہ بادشاہ ہی تو تھا۔ سب کر سکتا تھا اپنی عقل کے بل بوتے پر، دن کو رات بھی ہاں ہاں بڑا ذہین تھا وہ۔

ایک خوبی فخر بن گئی تھی اور اب غرور۔

وہ ایسا پردہ تھا جو آسمان کی پرواز پر لٹکا ہے تو اسے دیکھنے کے لیے سر کو بہت اونچا اٹھانا پڑتا ہے، ایسا ہی پردہ تھا وہ جسے بخوبی احساس تھا کہ ”پتہ“ صرف اسے دیے گئے ہیں اور وہ بہت اونچا ”اڑ“ سکتا ہے سو وہ اڑ رہا تھا بہت اونچا۔

☆.....☆

Board کے سامنے جا ہوا۔

چار سنٹ میں سوال حل تھا۔  
سر عمران کا 14 سالہ تجربہ صرف 4 منٹ میں  
ذہانت نے ختم کر ڈالا تھا۔

”بہت عمدہ زین بہت اعلیٰ۔“ انہوں نے اسے  
چھکی دی اور زین کسی دیوتا کی مانند ہو گیا۔

”میں فاتح ہوں سر؟“

”ہاں تم ہو۔“ وہ مسکرائے۔

”آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔“ عجیب آواز تھی  
اس کی۔

”ہاں بولو۔“

اور اس کی بات سن کر ساری کلاس کو جیسے سانپ  
سوٹھ گیا تھا۔

☆.....☆

دو سال بیت گئے۔

16 سالہ زین سلیم نے F.Sc میں بھی اپنی  
پوزیشن برقرار رکھی۔ پورے ملک میں ٹاپ، وہ  
ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ اپنی ذہانت کے پروں سے  
اڑتا وہ آسمان کی ان بلندیوں پر پہنچ چکا تھا جہاں کسی  
اور پرندے کے آنے کی بہت نہیں تھی۔

چاپی، تابا، خالائیں اپنے بچوں کو اس کی مثالیں  
دیے، بھلا کوئی تھا اس کے جیسا کوئی بھی نہیں تھا۔

کالج میں جس جس طالب علم نے اس کے ٹاپ کا  
شنا تو حیران رہ گیا۔

”کیا اس سب کے بعد بھی جو اس نے سر عمران  
کے ساتھ کیا اسے اتنی زیادہ عزت مل گئی؟“

”ٹاپ کیسے کر لیا اس نے یار؟ دیکھا نہیں سر  
عمران کیسے دور ہے تھے اس دن؟“

”ذہن بھی تو بہت ہے، سر عمران کو کیسا برایا تھا۔“  
”تو کیا اللہ تعالیٰ ذہین لوگوں کو سزا نہیں دیتا؟ جو

اس نے کیا اس کے بعد تو عذاب آتا تھا۔“  
اور ان سب سے بے نیاز زین سلیم غرور سے

تھے۔  
”ایکسر سائز (مفلن) نمبر 5.3 کا سوال نمبر 4،  
یہ حل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی عبارت غلط دی گئی  
ہے، اسے حل نہیں کیا جاسکتا۔ اگلے سوال پر چلتے  
ہیں۔“

سر اگلا سوال پڑھنے لگے اور وہ اپنے دماغ میں  
جمع تفریق کرنے لگا، سوال حل ہو سکتا تھا، اس کا  
دماغ اسے نئی راہ دکھانے لگا۔

”ایکسکیو زی سر!“ وہ اپنی سیٹ پر کھڑا ہوا۔  
”جی۔“ سر عمران بولے۔

”میں آپ کے ساتھ شرط لگانا چاہتا ہوں۔“  
”کیسی شرط؟“ سر کے ساتھ ساتھ ساری کلاس  
اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں یہ سوال حل کر سکتا ہوں جو آپ کے مطابق  
حل نہیں ہو سکتا۔“

سر عمران مسکرائے۔

”میں 14 سالوں سے پڑھا رہا ہوں ڈیز! آپ  
جیسے کئی ذہین اسٹوڈنٹس اور استاد اس سوال کو حل  
کرنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن یہ حل نہیں ہو سکا  
کیونکہ یہ عبارت غلط ہے۔“

وہ بھی ہنسا۔ ”یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ میں اسے  
حل کر سکتا ہوں؟ Let's bat (ایک شرط ہو  
جائے؟)

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں سر عمران بھی  
مسکرائے، وہ اپنی ذہانت پر پُر امید تھا اور وہ اپنے  
14 سالہ تجربے پر۔

”چیتے والا ہارنے والے سے کچھ بھی کر داسکتا  
ہے۔“ سر عمران نے کہا تو وہ راضی ہو گیا۔ یہی وہ  
چاہتا تھا۔

اب استاد کو کیا پتا کہ شاگرد کیا چاہتا ہے۔ وہ تو  
اس کی حوصلہ افزائی کے لیے صحت مند مقابلہ کروانا

چاہ رہے تھے۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور White



گردن اکڑائے صدر صاحب سے چپک اور شیلڈ وصول کر رہا تھا۔ عروج پر تھا وہ اور زیادہ اونچائی پر جانے کی خواہش تھی اسے۔

کوئی ہر انہیں سکنا تھا اسے۔  
دو بیٹے بعد انجینئر بننے کے لیے وہ امریکا جا رہا تھا۔

اور سر عمران کے گھر میں ماتم تھا۔

رات میں ہارٹ الیک ہوا تھا۔ وہ جگ نہ سکے تھے جنازہ تیار تھا۔

☆.....☆

غصہ کمرے میں آئی تو وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

6 سال بعد بھی وہ وہی شاعر تھا۔ گزرتے ماہ و سال نے اس کی وجاہت کو اور بڑھا دیا تھا۔

چھ سال پہلے جب وہ امریکا سے انجینئر بن کر لوٹا تھا تو ایسا ہی شاعر تھا۔ اس کا ہر قدم جیسے دل پر پڑتا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا تھا۔ لوگ گردیں موڑ موڑ کر اسے دیکھتے تھے ایسا قد کاٹھ، ایسا وجہا انسان ہر کوئی تھوڑی ہوتا ہے وہ ایک ہی تھا زین سلیم، زین کی ممانی نے جب غصہ کا رشتہ مانگا تو اس نے فٹ پاں کر دی تھی۔ تصویر میں اسے دیکھتے ہی فدا ہو گئی تھی اور بڑی روشن آنکھیں جیسے اندر تک اتر جاتی تھیں اور سارا حال جان لیتی تھیں۔ مضبوط جسم اور دلکش مسکراہٹ۔

شادی کے پہلے دن سے ہی اسے محبت ہو گئی تھی۔ زین سلیم سے جو سب سے زیادہ ذہین اور دلچسپ تھا۔

اور 6 سالوں میں اس نے ترقی بھی تو بے تحاشا کی تھی۔ ایک انجینئر کی حیثیت سے جاب کرتا کرتا محض چھ سالوں میں وہ ایک فرم کا مالک بن چکا تھا۔ چار کمروں کا فلیٹ 4 کنال کے وسیع بنگلے سے 8 کنال کی کوٹھی میں بدل گئی تھی۔ گاڑیوں کی

تھاریں۔ ہاتھ بائوٹھے کھڑے ملازموں کی تھاریں، عزت..... شہرت اور بے تحاشا پیسہ۔

وہ قابل رشک انسان تھا۔ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں تھی۔ گھر، گاڑی، فیکٹریاں، بیوی دو بچے اور کیا چاہے تھا عزت..... شہرت..... پیسہ..... وہ بہت بلند کی پر تھا، بہت اونچا۔

☆.....☆

”یہ لونڈیاں! دس ہزار روپے ہیں، خیریت سے شادی گزر جائے تمہاری بیٹی کی اور یہ سیٹ ہے یہ رکھ لو۔“

غصہ نے دونوں چیزیں ملازمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ ہنسنے لگی۔

”خدا سلامت رکھے بی بی! آپ کو اور صاحب کو اور زیادہ خوشیاں دے۔“ وہ دعائیں دیتی رہی۔

رات میں ملازمہ نذیراں جب کام سے فارغ ہو کر گھر جا رہی تھی تو اس کی بیٹی اس کے ساتھ تھی۔ کوٹھی سے کافی دور آنے کے بعد نذیراں نے بغل میں دبا ڈبہ کھولا اور اس میں سے ہار بندے نکال کر کھلے کٹر میں بہا دیے۔ اس کی بیٹی چلائی۔

”اماں پاگل ہے کیا؟ کیا کر رہی ہے؟“ لیکن نذیراں اب نوٹوں کی گڈی بھی کٹر میں اچھال چکی تھی۔

”اماں تو پاگل ہو گئی ہے؟“

”کچھ اس نہ کر!“ نذیراں غرائی۔

”حرام کی کمائی کا یہ زہور اور پیسہ، میں کیسے اپنی حلال کی کمائی سے پالی ہوئی بیٹی کو پہنا دوں۔ ساری زندگی کھا کھا حلال رزق جوڑا اور اپنے بچوں کی پرورش کی میں نے، اب کیوں حرام کھاؤں؟“

”لیکن اماں حرام کیسے؟“ اس کی بیٹی حیران ہوئی۔

”مجھے معلوم ہے سب، حرام ہے سب حرام ہے جیسی تو خدا کی ہر مخلوق اسے کھانے سے گریزاں ہے

اور مجھے پتہ ہے یہ اثر ہے۔ بددعا کا اثر ہے۔“  
”کس کی بددعا ماناں؟“

غیر اس نے لمبی سانس بھری۔ دور جھکاتی کوشی دکھائی دے رہی تھی۔

”صاحب کے استاد کی بددعا میں نے سنا ہے صاحب نے اپنے کانچ کے کسی استاد سے شرط لگائی تھی۔ وہ شرط ہار گئے صاحب نے اپنے استاد کے منہ پر پھٹ مارا تھا سزا کے طور پر، چہ کیسے شکر دل جس صاحب، اپنے استاد صاحب کو پھٹ مار دیا۔ ان کے استاد سنا ہے صدمے سے مر گئے۔“ نذیراں دھکی ہو گئی تھی۔

”ہائے ہائے اماں! پھر ہم کیوں ادھر کام کرتی ہیں جو تنخواہ ہمیں ملتی ہے وہ بھی حرام ہوتی ناں۔“  
”قسم ہے مجھے اپنی اولاد کی اپنی محنت کی کمائی لگتی ہوں ان سے، تنخواہ سے اوپر جو بھی پیسہ کھانا پلانا ہے راستے میں ضائع کر دیتی ہوں حرام نہیں کھاتی میں، اللہ ہمیں بچائے رکھے، چل اب چل گھر۔“  
”چہ چہ اماں! ایسی چالوت۔“

وہ دونوں ہاتھیں کرتی ہوئی چلنے لگیں اور دور زین سلیم کے 8 کنال کی کوشی کے لان میں جو کے کوشی بھر دانے دیے کے ویسے پڑے تھے۔ انہیں کھانے کا حکم نہیں تھا۔ رزق حلال کھانے والے ہر ذی روح کو ان کا کھانا حرام ٹھہرا تھا۔ ان مٹی بھر دانوں سے غرور کی بو آتی تھی۔

☆.....☆

26 سال بعد.....!

آج سال کی آخری شام تھی۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہر کوئی نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے پر جوش تھا۔ کاروباری حلقوں کی جانب سے منعقد کردہ اس رات کا مقصد نئے سال کا جشن منانا تھا۔ بارہ بج گئے مبارک بادیں دی جانے لگیں۔ آنش بازی سے آسمان بج گیا اور مہمان

خصوصی نے اس چماڑی سائز کے کیک پر پھری چلا دی۔ ہر طرف قہقہے مچ گئے۔

”نیا سال مبارک ہو زین سلیم صاحب!“

مہمان خصوصی کو گلہ دستہ پیش کیا گیا اور مبارک دی گئی۔ وہ مسکرائے 52 سالہ زین سلیم کی مسکراہٹ پر سارا جہان مسکرا دیا۔ وہ مائیک پر آئے اور بات کرنے لگے۔ سب لوگ عزت سے کھڑے ہوئے اور سر جھکا کر سنتے لگے۔ تھا کوئی انسان اس جیسا کامیاب؟ اس جیسا عزت دار؟ سات زمیوں میں نہیں تھا سات آسمانوں میں نہیں تھا اور کوئی تھا اس جیسا بد نصیب انسان؟ سات زمیوں میں نہیں تھا سات آسمانوں میں نہیں تھا۔ دنیا اور دنیا کی تمام آسائشوں سے لواڑے گئے اس خوش قسمت انسان جیسا کوئی سیاہ بخت بھی نہیں تھا۔ کوئی ایک بھی نہیں۔ بادلوں کی تہوں میں بھی نہیں اور پانی کی گہرائیوں میں بھی نہیں۔ آخرت کے خزانوں سے ٹھکرادیے گئے اس مردود کو اعزازہ تک نہیں تھا کہ وہ کیا ہو چکا ہے۔ بے شمار عزمیں شہر تیں پالیے والے اس انسان کے دل پر نقل ڈال دیے گئے تھے۔ ویسے ہی قفل جیسے اس جیسے مردود معلون انسان کے لیے جنتوں کے دروازوں پر چیں دنیا کو پا کر خوش ہو جانے اس بد قسمت انسان سا تھا کوئی مفلس؟ جس کے لیے توبہ کے دروازے بند کر دیے گئے تھے جس کے رزق کے ہر دانے پر حرام کی مہر تھی اور جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اس جیسا کوئی بے مراد جس نے انبیاء جیسے مقدس چہے والے استاد کا دل دکھایا تھا؟ تھا کوئی بے مراد اس جیسا جس سے اللہ ناراض تھا؟

☆.....☆

# وفا کی یہ کہنا کا عیش

اس کے ہاتھوں میں جو کچھ آ رہا تھا، وہ اسے زمین پر پھینک لی جا رہی تھی۔ درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی مر جائے گی، ابھی اس کا جسم کلڑوں میں بٹ جائے گا۔ ہر طرف کالج بکھرے پڑے تھے۔ وہ بھی تو اندر سے آہستہ آہستہ ایسے ہی بکھر رہی تھی، ایسے ہی ٹوٹ رہی تھی اس کا اپنی



ذات پر مان یقین ایسے ہی تو بکھرا تھا اور اسے اس کی کڑیاں اپنے جسم میں جپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اس کا اندر دلوہان ہو رہا تھا۔

نو کر دیواروں سے جیکے دشت بھری نظروں سے اپنے ملک کی اگلی نئی بنی ہوئی گود دیکھ رہے تھے۔ سچ سچ کر اس کے نگلے میں درد ہو رہا تھا لیکن اندر کا درد ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ بھی سزا ابراہیم حواس باختہ سی لادوئج میں داخل ہوئیں اور اسے ایسے دیکھ کر حزیہ پریشان ہو کر اس کی طرف بویں، حالانکہ راستے میں بکھرے کی کالچ ان کے پاؤں میں چبے تھے۔ آخر ماں تھیں اپنا درد بھلا کر بیٹی کو گلے لگایا۔

”کیا ہوا بیٹا.....! اچھا تو ٹھیک تو ہے؟“

”وہ ماما..... وہ ماما!“ اتنا کہتے ہی وہ ان کے بازوؤں میں ڈھس گئی۔

☆.....☆

”کیسی ہیں آپ حیا؟“ وہ ہاتھوں میں خوبصورت بکے لیے مسکرا کر ہمیشہ کی طرح محبت سے بولا تو حیا نے رخ پھیر لیا۔

وہ مسکراتے ہوئے اتنا خوبصورت لگتا تھا کہ ہمیشہ حیا اسے مسکراتا دیکھ کر رخ موڑ لیتی کہ کہیں اسے نظر ہی نہ لگ جائے۔ اس کے کوئی جواب نہ دینے پر مسز ابراہیم محبت سے بولیں۔

”اب پہلے سے بہتر ہے۔ تم بیٹھو اس سے باتیں کرو میں آتی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولیں اور باہر نکل گئیں تو وہ پریشان سے لہجے میں بولا۔

”دیکھو حیا! کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اگر باہر نہ نکالا جائے تو وہ ماسور بن کر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتے ہیں، اسے انسان سے حیوان بنا دیتے ہیں۔ تم مجھے اپنا شوہر سمجھ کر نہ سہی چلو دوست مان کر اپنا دکھ درد مجھے سے شیئر کر دو میں وعدہ کرتا ہوں میں تمہارا شوہر بن کر نہیں تمہارا دوست بن کر سنوں گا۔“

اس کے انداز میں اس قدر محبت اور اپنائیت تھی کہ حیا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہر درد اسے بتائی چلی گئی۔

☆.....☆

”ہیلو! کیسی ہو تم دونوں؟“ وہ ہمیشہ کی طرح اچانک ہی آکر بولا تھا، اسے دیکھ کر حیا کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ وہ تھا بھی ایسا کہ لڑکیوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکتا بھول جاتے تھے، ان سب دیوانی لڑکیوں میں حیا کا شمار بھی ہوتا تھا۔ اب بھی وہ ایک دم ندوس ہوئی تھی پھر سنبھل کر بولی۔

”ہم تو ٹھیک ہیں، آپ کیسے ہیں؟“

”ارے واہ، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کس قدر پیڑم ہوں مسکرا کر پوچھ رہی ہو کہ میں کیسا ہوں؟ حیرت ہے یا۔“

”منہ دھو رکھو۔“ اس کی بات پر ناتمہ بھڑک کر بولی اور کافی کے کپ کو نہ لگایا تو یوسف مسخوئی حیرت سے بولا۔

”ارے واہ یا! صبح کو ہی میں نے DOV سے منہ دھویا تھا۔ لڑکی کیا بات کر رہی ہو ویسے حیا ہے ہی خوبصورت ہاں نہیں DOV کی ضرورت ہے میری نہیں یا۔“ اس کے خوبصورت کہنے پر حزیہ ندوس ہوئی تھی، جبکہ ناتمہ اور یوسف اب بری طرح لڑ رہے تھے بھی حیا بات بدل کر جلدی سے بولی۔

”اچھا یوسف! یہ بتاؤ پیچہ کا کیا ہوا؟ ٹھل ہونے کا ارادہ تو نہیں ہے تمہارا؟“

”ضمن یار! بٹ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم ہر سال کی طرح اس سال بھی فرسٹ آؤ گی۔“ ناتمہ کی طرح مت سیکھ آنا ادا کے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اور پھر اس نے دن رات محنت کی۔ کھانا پینا بھولی کر پڑھائی میں لگ گئی، رات دن کمرے میں بند رہ کر وہ پڑھائی کرنے لگی تھی۔

ناتمہ اور یوسف دونوں کزن تھے لیکن دونوں کی

وہ لب بھجھ کر اس کی کمر سہلاتے ہوئے محبت سے بولا۔ ”ایسا بھی سوچنا بھی مت جیاد! تم تو میری زندگی ہو، میں بھلا تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور جہاں تک تمہارے کردار کی بات ہے تو وہ دوری ایسا ہوتا ہے، جب انسان ہر چھپکتی چیز کو سونا سمجھ لیتا ہے، آنکھیں کسی کا خواب دیکھنے لگی ہیں تم جیسی معبود کردار لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی اور جیاد کل کو ہم اگر یاد کر کے رونے بیٹھ جائیں تو ہمارا آج بھی تو دکھ بھرا ہوگا اور اگر آج ہم خوش خوشی زندگی گزاریں تو کل جب ہم اپنا ماضی یاد کریں گے تو کچھ عجیب ایسے بھی تو ہوں جنہیں ہم یاد کر کے مسکرائیں، کل کے لیے ہم اپنا آج کیوں خراب کریں یہ کہاں کی عقل مندی ہے یہ پوچھو؟“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں شرنیل! آئی ایم سوری میں نے آپ کو بہت تنگ کیا پر اب نہیں۔“ جیاد نے پرسکون انداز میں کہا، ”جیسی فضا میں نیاویز کی آواز کوئی تو شرنیل اس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا کر بولا۔“

”چلو وعدہ کرو مجھ سے اس سال کو ہم دل سے گزاریں گے تاکہ کل ہم اسے یاد کریں تو ہمارے لبوں پر مسکراہٹ ہونا کہ آنکھوں میں آنسو۔“

”وعدہ۔“ وہ پورے دل سے بولی۔

”سچی نیاویز میری جان! اپنا سال مبارک ہو۔“

”آپ کو بھی۔“ وہ دل سے مسکرا دی اور سوچنے لگی کہ شادی سے پہلے وفا کیسی کہاں کا شوق شادی کے بعد شوہر سے ہی وفا اور اسی سے شوق۔

یہ سال اس کے لیے ہزاروں خوشیاں لے کر آیا تھا نجانے کتنے عرصے بعد وہ دل سے خوش ہوئی تھی اور نئے سال کا جیاد ان دونوں کی محبت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، کیونکہ اس سال وفا بھی کچی تھی اور شوق بھی پاک تھا۔

☆.....

ہوتی ہو، کوئی تمہارا ذرا سا خیال کیا رکھ لے تم سے ہنس کر بات کیا کر لے، تم بھجھتی ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ پاگل بے وقوف لڑکی! ہر چھپکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ہر کسی کو اس نظر سے دیکھنا چھوڑ دو کہ اگلا تمہاری محبت میں پور پور ڈوبا ہوا ہے۔ کیا میں نے کبھی تم سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، یا پھر شادی کرنا چاہتا ہوں؟“ وہ سادگی سے بیٹھی اسے سن رہی تھی، وہ اٹھا اور جاتے جاتے رک کر نفرت سے بولا۔

”وہیے جیاد! ایک بات کہوں میں اگر تم سے محبت کرتا ہوتا تو تم سے بھی شادی نہ کرتا۔ کیونکہ کمزور کردار کی لڑکی سے کوئی بھی محبت کرنا نہیں چاہے گا۔“

گھر آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مزا برا ایم اس کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی تھیں اور پھر اس کی شادی شرنیل سے ہوگئی لیکن جیاد نے کبھی اسے وہ مقام نہیں دیا جو کس کا حق تھا ہمیشہ اگور کیا تھا اس نے۔ اس کے چپ ہونے پر شرنیل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مزا برا ایم اندر داخل ہوئیں۔

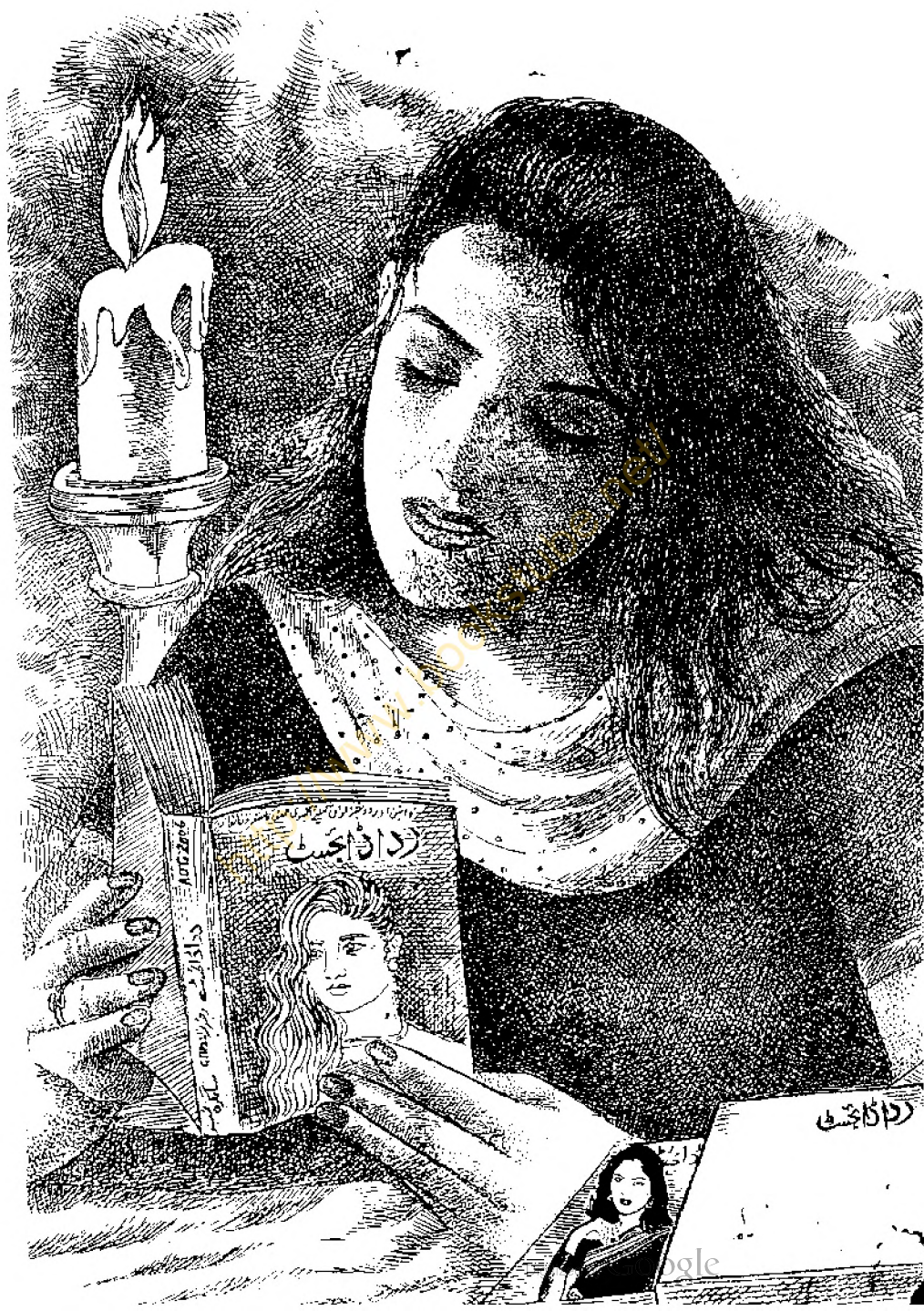
”شرنیل بیٹا! ڈاکٹر نے جیاد کو ڈسچارج کر دیا ہے، آپ گاڑی نکالو ہم آتے ہیں۔“

”جی آئی!“ وہ ادب سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد جیاد اس سے حریف کترانے لگی تھی جہاں اسے دیکھ لیتے اٹھ کر چلی جاتی۔ رات کو در سے کمرے میں آئی جب وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو چکا ہوتا۔ اس وقت بھی وہ سویا ہوا تھا، جب وہ کمرے میں داخل ہوئی اور بالکونی میں چلی آئی۔ وہ جو سونے کی ایک تنگ کمرہ تھا اس کے پیچھے آ کر بولا۔

”یہ سب کیا ہے جیاد! آخر ہم کب تک سمندر کے دو کناروں کی طرح رہیں گے۔“

”آپ مجھے طلاق دے دیں شرنیل میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔“ وہ اچانک اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔





”اگر تمہیں میری اتنی ہی یاد آتی ہے تو کراچی آ جایا کرو، بہل۔“

”میرے کہاں اسلام آباد سے کراچی کا سفر مجھ سے تو نہیں ہوتا۔“ اس کے جواب پر وہ مسکرا کر یہ کہیں پھر کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ پتلی نکلی تو صابرہ جلدی سے اسی کا فون چمپا کر دیا وہ دم میں گھس گئی۔ پہلی ہی پتلی پر کال ریسیو کر لی احمد محبت سے بولا۔

”کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں اگر تم نے آج آنا تھا تو مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔“

”اگر پہلے بتا دیتا تو تمہارے چہرے پر اچانک آجانے کی خوشی کیسے دیکھتا۔“

”اچھا تم خبریت سے گھر تو پہنچ گئے؟“

”ہاں بابا اچھا بعد میں بات کرتے ہیں اپنا خیال دیکھنا اور آئی لو۔“ احمد کے کہنے پر صابرہ اپنے آپ سے شرمائی۔

انور اور نسیم کے ٹین بیڑے اور تین ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑی جمیلہ جس کی شادی اپنے چاچو کے گھر ہو گئی تھی اس سے چھوٹی صابرہ جو کہ کالج میں پڑھتی تھی اور بڑی مای کے بھانجے احمد سے محبت کرتی تھی جو مای کو ان کے گھر چھوڑنے آتا تھا۔ احمد بھی اس سے بے حد دو

بے حساب محبت کرتا تھا، سب سے چھوٹی فریدہ بھی جو کہ میٹرک کر رہی تھی۔ احمد اور صابرہ سب سے چوری روز فون پر باتیں کرتے تھے۔ وہ ایک جان اور دو

قالب تھے۔ احمد کے ابو بے حد سخت تھے۔ مخالف وقت۔ نے کروٹ لے ان کی محبت کو دو سال ہو گئے،

گھر میں صابرہ کی شادی کی باتیں چلنے لگیں اور آج اسے دیکھنے لڑکے والے آنے والے تھے۔ اس نے

لاکھ بھانے بنائے لیکن نسیم بیگم نے اس کی ایک نہیں سنی تو اس نے روتے ہوئے جلدی سے احمد کو فون کیا۔

”احمد، احمد میں تمہارے علاوہ کسی کی دہن نہیں بنوں گی۔ پلیز اپنے گھر والوں کو بھیج دو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو صابرہ! تم اچھی طرح جانتی

ہو کہ ابو کس قدر سخت ہیں اگر میں نے اپنے گھر میں یہ بات بھی کی تو وہ میرے کھڑے کھڑے کر دیں گے۔“

”جب تم جانتے تھے کہ تمہارے ابو نہیں باتیں گے تو تم نے کیوں مجھے بے بے خواب دکھائے کیوں

مجھ سے محبت کی بولو جواب دو۔“ وہ مقررہ جابج کر بولی تو احمد زنی سے بولا۔

”ایک بات مانو گی تم یہ شادی کر لو اور وہ بے بھی اگر آپ کسی کو پانے کا خواب دیکھتے ہیں تو اسے کھونے کا

حوصلہ بھی رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ ہر خواب پورا نہیں ہوتا صابرہ، مجھے بھول جاؤ اور ہاں میری مٹکائی ہو چکی ہے

کچھ مہینوں میں میری شادی بھی ہو جائے گی مگر میں تم سے محبت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا۔“ اس نے مزید کچھ

سنے بغیر فون کو دو بار پر دے مارا اور پاٹھوں کی طرح چیخ کر رونے لگی۔

اس کے بعد اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور اس وقت وہ دلہن بنی بیٹی تھی اس کی نہیں

جس کے اس نے خواب دیکھے تھے بلکہ اس کی جو اس کا مقدر تھا کیا اتفاق تھا جس سے اس کی شادی ہو رہی

تھی اس کا نام بھی احمد ہی تھا اس سارے معاملے میں زندگی نے اسے ایک سبق ضرور دیا تھا۔

بھی بھی کسی انسان سے توقع یا امید مت رکھنا، ورنہ خالی ہاتھ رہ جاؤ گے ہمیشہ اپنے رب سے مانگنا

بھی خالی ہاتھ نہیں رہو گے کیوں کہ وہ بڑا حیا دار ہے اسے حیا آتی ہے کہ اس کے در سے کوئی خالی ہاتھ

لوٹے۔ ہماری قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہمیں ضرور ملتا ہے نہ زیادہ نہ ہی کم تو تو نے سے بہتر ہے

کہ جو ہمیں ملا ہے اسے خوشی سے قبول کر لیں۔ یہی تو زندگی ہے اسی کا نام ہی خوشی ہے اور یہ آج اسے پتا چلا

تھا۔ اس نئے سال اس نے اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا یہ سوچ کر کہ جو غلطیاں اس نے پچھلے سال کی ہیں وہ غلطیاں وہ اس سال بالکل نہیں کرے گی۔

## ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں



السلام علیکم!

صوبہ پنجاب کے ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں۔ ادارہ ماہنامہ ”رداؤ انجسٹ“ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نیوز ایجنٹ حاجی محمد یاسین طاہر کو صوبہ پنجاب بالخصوص فیصل آباد و گردونواح کے شہروں میں ماہنامہ ”رداؤ انجسٹ“ کی ترسیل (پلائی کے لیے) سول ڈسٹری بیوٹر نامزد کیا ہے۔

ان شہروں کے ایجنٹ حضرات محمد یاسین طاہر سے اس موبائل نمبر 0321-7531597 پر رابطہ کریں۔  
چیف ایڈیٹر صالحہ محمود

## نیلے اور نارنگی

پرفیکٹ ہونی چاہیے، میں پارٹی میں کوئی کمی رہنے دیتا نہیں چاہتی، پارٹی ایسی ہونی چاہیے جسے لوگ مٹوں یاد رکھیں۔“ شہلانے پر جوش انداز میں کہا۔

”ہاں، ہاں ایسا ہی ہوگا ڈونٹ وری اب ذرا چائے تو پیلا دو پلیز۔“ احسن نے بیوی کو تسلی دی اور پھر اپنی ٹائی ڈھیلی کر کے صوفے پر ہی دراز ہو گیا۔

”ساجد! جلدی سے چائے لے کر آؤ، اتنی دیر سے لگی ہو تم ابھی تک چائے نہیں بنی۔“ شہلانے وہیں بیٹھے بیٹھے کلاس لی۔ کچھ دیر بعد ساجد ڈرتی ڈرتی شرابی کھینچتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی شرابی جھڑمو سے، بریڈرول، فرائینڈش اور پائسا سے کٹی تھی۔ احسن چیلنس میں شام میں چائے کا روزہ ای طرح اہتمام ہوتا تھا، نہ صرف شام کی چائے بلکہ رات کا کھانا، ناشتہ سب ہی نہایت اہتمام سے شامانہ انداز میں۔

”تھوڑی دیر ہو گئی۔“ ساجد نے سر دکر تے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھنا۔“ شہلانے فحش کھاتے ہوئے کہا سب چیزیں بہت مزے کی تھیں، اسی لیے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا، اب وہ سب چیزوں کے ساتھ بھرپور انصاف کر رہی تھی۔

”احسن! مجھے نواہیر پر کیا گفت دے رہے ہو؟“ سو سو کھاتے ہوئے اسے اچانک یاد آیا تھا۔

”تم بتاؤ تمہیں کیا گفت چاہیے؟“ احسن نے چائے کے سب لیتے ہوئے کہا۔

”نام! دیکھیں مازنی مجھے کارٹون دیکھنے نہیں دے رہی۔“ شاز نے رونے کے سانداز میں ماں سے کہا۔

”اوہ شاز! تنگ مت کرو مجھے کام کرنے دو۔“ شہلانے غصے سے کہا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”ہیلو ڈیر!“ دائیں ہاتھ میں بیک پکڑے ہوئے بائیں بازو پر کوٹ ڈالے آٹس سے گھر واپسی پر احسن نے خوشگوار موز میں بیوی کو مخاطب کیا اور پھر بیک پکڑے ہوئے سائیڈ میں رکھ کر اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ہائے گڈ ایوننگ سی!“ شہلانے بھی اسے مسکرا کر دیکھ کر کہا۔

”گڈ ایوننگ ڈیڈی!“ دونوں بچوں نے باری باری باب کو گڈ ایوننگ کہا۔

احسن پیلس میں گڈ ایوننگ سائنٹ، ہیلو سے ہی گفتگو شروع ہوتی تھی، یہاں سلام دعا کا کوئی رواج نہیں تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ احسن بچوں کی لڑائی نشا کر مڑا تو شہلا کو کاپی چین ہاتھ میں لیے کچھ لکھتے پا کر اس نے پوچھا۔

”پارٹی کی لسٹ بنا رہی ہوں؟“ شہلانے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

”اوہ.....! اچھا نظر نہیں کرو سب ہو جائے گا ابھی پارٹی میں ایک ہفتہ باقی ہے۔“ اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی۔

”ون دیک باقی ہے صرف اور ابھی تک کچھ بھی تیاری نہیں ہوئی، میں نے کہہ دیا ہے ہماری پارٹی







”مجھے ڈائمنڈ رنگ چاہیے اور وہ تم مجھے پارٹی میں سب کٹیس کے سامنے پہناؤ گے“ اس نے حکم دیا۔  
 ”اوکے اب بیووش“ اسن نے کندھے اچکا کر لاہوائی سے کہا مگر نڈر دیکھنے لگ گیا۔

☆.....☆

”عاصم باہ صوفی اس طرف رکھو ہاں زیادہ اچھا لگے گا اور صوفی سیٹ کر کے کرٹو بھی ڈال دینا، آج ہی کرنے ہیں سارے کام۔“ شہلا نے ڈرائنگ روم کا تحیدی جائزہ لیتے ہوئے نوکر کو دیکر کاموں کی یاد دہانی کرائی۔  
 ”جی بی بی جی! ہو جائے گا سب کچھ، آپ فگر نہ کریں۔“ عاصم نے اسے اطمینان دلایا اور پھر اس کے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔

شہلا عاصم کے سر پر کھڑی ہو کر ڈرائنگ روم کی سیٹنگ کروا رہی تھی۔ نیا فرنیچر، کاریٹ اور کرٹو احسن بیس میں سال نو کی تیاریاں جاری تھیں۔ شہلا بہت دل جمعی سے کمر کی تزئین و آرائش میں مصروف تھی۔ شہلا چاہتی تھی پورے کمر میں نیا بینٹ ہو مگر وقت کی کمی کی باعث صرف ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں وال پیپر لگوانے پر ہی اسے اکتفا کرنا پڑا تھا۔

☆.....☆

”کیا کہا ڈاکٹر نے؟“ شہلا نے کمرے میں داخل ہوتے احسن سے پوچھا۔

”اماں کی شوگر اور بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا، ڈاکٹر کا کہنا ہے نیا ٹریٹمنٹ شروع کرنا ہوگا، اس سے پہلے کچھ ٹیسٹ کروانے ہیں۔“ احسن نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے اسے تفصیل بتائی۔

”اف نیا ٹریٹمنٹ اور ٹیسٹ! اب ان چکروں میں پڑو۔“ شہلا نے ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے غصے سے کہا۔

”مجھ جاؤں گا میں یب پتہ کرتا ہوں ٹیسٹوں کا۔“ احسن نے ہر سوچ انداز میں کہا اور مگر بلیکٹ لوڈ کے لیٹ گیا۔ شہلا ہاتھوں بیروں پر ابھی طرح لوشن لگا کر

بیڈ پر آئی تو اس کا سوزری طرح آف ہو چکا تھا۔ اکثر انسان اپنی زندگی کو خود ہی مشکل بنا دیتا ہے اپنے لیے خود ہی گڑھے کو دھاتا ہے، بے سکونی کا سامان کر کے سکون کی طلب کرتا ہے۔

☆.....☆

”ابھی! گڈ آفٹر نوون۔“ شہلا نے خوشگوار انداز میں احسن سے کہا۔

”اس وقت ہم کیسے یاد آگئے آپ کو؟“ احسن نے شرارت سے پوچھا۔

”ابھی! ایسے ہی تم سے بات کرنے کے لیے رنگ کیا ہے میں نے۔“ شہلا نے ہلکی سی ناراضی سے کہا۔  
 ”اوکے اور پارٹی کی تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟“ اس نے یاد آنے پر پوچھا۔

”پارٹی کی ایریجمنٹ چل رہی ہے تم یہ بتاؤ لیب کئے؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔  
 ”ہاں کیا تھا۔“ احسن نے مختصر جواب دیا۔

”کیا ہوا پھر؟“ شہلا کے لہجے میں فکر مندی چھیں بلکہ کچھ اور تھا۔

”پانچ ہزار کے ہوں گے ٹیسٹ۔“ ایک ہاتھ سے سو پائل کان پر لگائے اور ایک ہاتھ لیپ ٹاپ کی کیبز پر چلاتے وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا۔  
 ”پانچ ہزار!.....!“ شہلا کی چیخ نکلی تھی۔

”احسن سنو! ابھی ہم پارٹی کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں، ویسے ہی ابھی بہت کچھ رہتا ہے، ذرا سی بھی کمی رہ گئی تو ہماری ناک کٹ جائے گی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔ اماں کونسا کہیں جا رہی ہیں، ان کی دو دنیاں اور ٹیسٹ ہم بعد میں بھی کروا سکتے ہیں۔ ابھی ہمیں اپنی ساری فوج پارٹی پر لگانا ہے۔ ٹیسٹ کے چکروں میں پیسے کم بڑ گئے تو ہماری ساری محنت پر پانی بھر جائے گا بلکہ میں تو کہتی ہوں کچھ دنوں کے لیے اماں کو گاؤں چھوڑ آؤ، کمر میں کل پارٹی ہے کھائیں کھائیں کر ڈسٹریس کریں گی، تم آج انہیں چھوڑ آؤ

کچھ دلوں بعد واپس لے آیا۔ ”وہ سفاکی سے کہہ کر اب احسن کے جواب کی بھڑکھی۔

”ابھی میں ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں، تم سامان پیک کر دو ان کا میں آج شام چھوڑ آؤں گا اوکے ہائے۔“ احسن کے آخری جیلے نے شہلا کو جی جان سے خوش کر دیا تھا۔

☆.....☆

احسن سلیم صاحب اور شاہین بیگم کی اکلوتی اولاد تھا۔ سلیم صاحب گاؤں کے رہنے والے تھے، جب احسن تھوڑا بڑا ہوا تو انہوں نے گاؤں سے شہر کا رخ کیا۔ سلیم صاحب نے دن رات ایک کر کے احسن کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی اور اس کے بہتر مستقبل کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، جہاں سلیم صاحب نے احسن کے لیے دن رات ایک کر دیا، وہیں شاہین نے بھی بیٹے کو بہتر زندگی دینے کے لیے بہت محنت کی۔ احسن جب خود بخیر ہوا تو جوانی کے دھم میں پسند کی شادی کر لی۔ ماں باپ کو دکھ تو ہوا مگر بیٹے کی خوشی کی خاطر برداشت کر لیا۔ احسن کی شادی کے بعد سلیم صاحب خالق حقیقی سے جا ملے، شاہین بیگم شوہر کی وفات کے صدمے سے نہیں اٹھ سکی تھیں کہ بچے اور بہو کے بدلے دے دے انہیں حریہ توڑ دیا۔ خدا کی زمین ان پر تنگ کر دی تھی اور انہیں گھر کے سب سے کونے والے گھرے میں کسی بے کار پرزے کی مانند ڈال دیا گیا۔

☆.....☆

گلابی اور سفید رنگ کے خباہے کا ریٹ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بڑی غلاست سے رکھے تھے۔ اندر صرے میں رنگ برنگی ڈسکولائش اور پیک گراؤٹر میں چلتا ہلکا میوزک ماحول کو خوبصورت بنا رہا تھا۔ سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

شہلا بلیک ساڑھی اور اس پر سلور جیوہری، سب ہی خواتین میں منفرد رنگ رہی تھی۔ وہ مہمانوں کو دیکھ کر اپنے کے ساتھ پارٹی بھی انجوائے کر رہی تھی اس

کی خوشی دیدنی تھی، سب ہی اس کی ارتجاعت کو سراہ رہے تھے۔ احسن نے اسے سب مہمانوں کے سامنے ڈانسز رنگ پہنائی تھی۔ 12 بجے ایک کاٹا جانا تھا، سب کچھ اب تک ریگٹ چل رہا تھا کہ اچانک ساجدہ گھبرائی ہوئی آئی۔

”کیا ہوا ساجدہ؟“ احسن نے پوچھا۔

”وہ صاحب جی گاؤں سے فون آیا ہے، اماں کی طبیعت بگڑ گئی ہے آپ کو بلایا ہے۔“ ساجدہ نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

”اوہ.....!“ احسن نے ساجدہ کی بات سن کر شہلا کی طرف دیکھا، جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبے احسن کو ہی دیکھ رہی تھی۔

”احسن صاحب! آپ فوراً جائیں۔“ یہ کہنے والے فیضان صاحب تھے۔

”ہاں احسن! آپ کو فوراً اپنی اسی کو ہسپتال لے کر جانا چاہیے۔“ شام نے آگے بڑھ کر کہا۔

”دہ پارٹی.....!“

”پارٹی کا کیا ہے جانا ضروری ہے۔“ شرمین، شہلا کو کاٹ کر بولی۔

سب کے اصرار پر احسن اور شہلا کو آخر کار پارٹی ختم کر کے جانا ہی پڑا۔ احسن خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب کے شہلا پارٹی کے خراب ہو جانے اور پیسوں کے ضائع ہو جانے پر تڑپ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا زمین و آسمان غصے سے ایک کر دے۔ غصہ کرتے اور باتیں بناتے ہوئے ہی اچانک کچھ ہوا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنا وجود تاریکی میں جانا محسوس ہوا۔

☆.....☆

پوڑھے کمرہ سے ہاتھوں کا لکڑی محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں سامنے شاہین بیگم ایک ہاتھ میں صبح پڑھتی دوسرا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھی شفقت

سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ اس وقت کس منظر میں ہے، اس نے خود کو آئینجین ماسک اور ڈرہلی میں جکڑا کر ادھر ادھر دیکھا تو کچھ دور احسن بنجیدی سے کھرا نظر آیا۔

”م..... میں کہاں؟“ وہ ہلکا سا مشکل کی بولی بولی۔  
 ”شہلا! ایسی طبیعت ہے اب؟“ احسن نے اس کے قریب آ کر آہستہ سے پوچھا۔

”احسن! بچ..... مجھے..... کیا ہوا؟“ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”شہلا! اس رات ہائی وے پر ہمارا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، ہمارا بچ جانا کسی منجرے سے کم نہیں ہے، مجھے ایکسیڈنٹ کی اگلی صبح ہوش آ گیا تھا مگر تمہیں آج 5 دن بعد ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹرز تو ناامید ہو گئے تھے مگر ماں کی دعائیں رنگ لے آئیں اور تمہیں اللہ نے نئی زندگی بخش دی۔ اماں ایکسیڈنٹ والی رات سے تمہارے پاس ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہیں۔“ احسن نے تم آنکھوں سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

جس رات ان دونوں کا ایکسیڈنٹ ہوا، اسی رات شاہین گاؤں سے واپس آ گئی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ بھلا کر اپنی بیماری کو نظر انداز کر کے دن رات شہلا کے سر اپنے پیٹھے گڑا رہے تھے۔ شاہین بیگم نے شہلا کی زندگی کے لیے اللہ سے گڑ گڑا کر دعائیں مانگی تھیں۔ انہوں نے اس کے علاج کے لیے اپنے کلنل چچ دیے تھے، جو ان کے پاس سلیم صاحب کی آخری نشانی تھے۔ ان کلنلوں کو انہوں نے چمپا کر بہت احتیاط سے رکھا تھا۔ شادی کے بعد سے وہ اسے سنہا پٹی آرہی تھیں مگر جب بات اولاد کی آئے تو ماں اپنی ساری متاع اس کی خاطر قربان کر سکتی ہے۔

”بیٹا! تم یہاں شہلا کے پاس بیٹھو، میں شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گئیں۔  
 ”آئی! مجھے معاف کروں۔“ شاہین بیگم کے قدم رکے تھے انہوں نے پیچھے ہٹ کر دیکھا شہلا کی آنکھوں

سے عمامت کے آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔ وہ آج ان سے معافی کی طلب کر چکی تھیں ان کے آگے سوالی تھی اور جب اولاد ماں باپ سے محبت سے کہہ سکتی ہے تو وہ لکھ لگائے بغیر سب کچھ بھلا کر اولاد کو نور اس کی طلب گار چیز دینے کے لیے تڑپ اٹھتے ہیں۔ ماں باپ تو اولاد پر اپنی جان تک دے دیتے ہیں، یہ تو پھر معافی تھی۔

شاہین آگے بڑھیں اور پیار سے شہلا کی پیشانی کو چومد۔  
 ”بیٹا! اب بس سب کچھ بھول جاؤ اور جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، تمہارا گھر تمہارے بچے احسن سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اور اماں آپ؟“ شہلا نے تڑپ کر پوچھا۔  
 جب انسان صبح راہ پر واپس لوٹتا ہے تو سوچ کے جذبات کے نئے ادوار اس پر کھلتے ہیں وہ ایک نئی سی کیفیت سے گزرتا ہے۔ شہلا کا بھی یہی حال تھا۔

”ہاں مجھے بھی تمہارا انتظار ہے بیٹا! اب تم آرام کرو میں نوافل پڑھ کر آتی ہوں۔“ اماں نے مسکرا کر کہا اور وضو کے لیے ہاتھ روم میں چلی گئیں۔

احسن کرسی پر ڈھیلے سے اعجاز میں بیٹھ گیا اور شہلا نے پرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں، جب دلوں پر سے گرد ہٹ جائے تو انسان خود کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کرتا ہے۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی میں ہی اپنی غلطی سدھارنے کا موقع ملتا ہے۔

ماں باپ اللہ کی بڑی نعمت ہیں مگر افسوس آج کل لوگ خود اللہ کی نعمت سے منہ موڑے ہوئے ہیں، دینی احکامات اور تمام روایات کو بھولے مغربی طرز عمل پر چل پڑے ہیں۔ لوگوں کے لیے ماں بوجھ بن گئی ہے۔ آج کے مادی دور میں انسان نے سب سے پہلے کچھ کھویا ہے تو وہ احساس ہے ماں باپ جیسی عظیم ہستیوں کو دکھ دے کر انسان خوشیوں اور سکون کی تلاش میں ہے، بے شک انسان اپنے اوپر خود ظلم کر رہا ہے، اس نے اپنی زندگی خود تک بنا رکھی ہے۔

قروش فہک

سلسلہ وار ناول

قسط نمبر 15

# قیرت بیدار کی آواز

”اب اجازت دیجیے۔“ حسین آفریدی نے جھک کر جہاں آرام کو دیکھا تھا۔  
”ہاں بیٹا! خیر سے جاؤ مگر تم سے ایک رکھوٹ اور بھی کرنی تھی۔“



”جی کہیے۔“  
 ”میری لاروش سے اگر نادانگی میں کوئی غلطی ہو جائے تو نادانی سمجھ کے معاف کر دینا، اس نے  
 بیس سال تکلیفوں میں گزائے ہیں۔ دنیا کی سمجھ نہیں ہے صرف گھر کی چار دیواری میں اس نے اپنی زندگی  
 گزاری ہے تم بہت خیال رکھنا میری لاروش کا۔“  
 ”جی بھتر۔ اللہ حافظ۔“

حسین آنریدی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جیڑی سے آگے بڑھائی تھی لاروش نے پیچھے مڑ کے دیکھا تھا  
 جہاں آرام مولوی صاحب کو پیسے دے کر چوکیدار کے ساتھ رخصت کر رہی تھیں اور اب ان کی جاتی ہوئی  
 گاڑی کو دیکھنے لگی تھیں۔ وہ لاروش اغولان کی نگاہوں سے ادجمل ہو گئی تھیں۔ لاروش اغولان نے چادر  
 منہ پر رکھے بنا آواز کے ایک بار بھر سسک سسک کر رونا شروع کر دیا تھا۔





”آسیہ بھابی!“ نجمہ نے ہولے سے لکارا تھا۔

”نجمہ!“ آسیہ بھلتی نجمہ کے گلے سے لگی تھیں۔

”نجمہ! میرا بچہ میرا زمیل اندر آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ سارے ڈاکٹرز ناامید ہو چکے ہیں۔ نجمہ اگر زمیل کو کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گی زندہ نہیں رہوں گی۔“ ان کا پورا وجود ہچکچاہٹ کی زد میں تھا۔ ان کا رونا روناں تر پ رہا تھا۔ ملک رہا تھا۔

”اللہ نہ کرے آسیہ بھابی!“ نجمہ بھی ترپ کے رہ گئی تھیں۔

”انشاء اللہ ہمارے زمیل کو کچھ نہیں ہوگا۔ بہت سارے ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں زمیل کی زندگی مانگنے کے لیے اٹھے ہیں۔“ نجمہ تو خود بے انتہار دیر سی تھیں کہ ٹھیک سے تسلی بھی نہیں دی جا رہی تھی۔

اور زمیل کو اس حال پر پہنچانے والا ارشد پوار سے ٹیک لگائے سر کو شرمندگی سے جھکائے زمین میں ہی گڑا جا رہا تھا۔ زمیل کی اس حالت کا ذمہ دار وہی تو تھا مگر اب تک کسی نے بھی اسے تصور وار نہیں ٹھہرایا تھا۔ ہجوم کے کٹھنوں میں نہیں کھڑا کیا تھا جو اس کے لیے مزید شرمندگی کا باعث تھا۔ اتنی بھی بہت نہیں تھی کہ اپنی نظریں اٹھا کے اس پر تڑپتی بھلتی روی فریاد کرتی ماں کو دیکھ لیتا۔ ان سے اپنے کیے کی معافی ہی مانگ لیتا۔

”بس کریں آسیہ بھابی ورنہ آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

راجہ تو خود بے بسی کے مارے رو دی تھیں مگر آسیہ کی حالت خود ان سے بھی نہیں دیکھی جا رہی تھی تو انہوں نے آسیہ کو خود سے لگا لیا تھا۔

”نہیں راجہ مجھ سے مبر نہیں ہو رہا میرا بچہ اندر تکلیف میں ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔“ ان کا رونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کسی پہلی سکون نہیں آ رہا تھا۔ دل عجیب دوسوں کا شکار تھا۔ ڈر و خوف اندر کھڈی مار رہے تھے کچھ انہوں نے نہ ہو جائے زمیل کو کچھ ہونہ جائے۔

”ممی پائیڈ! سنبھالیں خود کو، زمیل بھابی کو کچھ نہیں ہوگا وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ حزانے ڈری ڈری تسلی دی تھی۔ ورنہ اندر سے وہ بھی تو بہت خوفزدہ تھی۔ دل رور رہا تھا۔ اپنے بھائی کی زندگی کی دعا مانگ رہا تھا۔

بارہ گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد آپریشن تھیمز سے ڈاکٹرز نکلے تھے۔ سلیم امر، فہیم امر اور عارفین تنزی سے آگے بڑھے تھے۔

”کیسی طبیعت ہے ڈاکٹر زمیل کی۔“ کس قدر بے مبری تھی ان کے لب و لہجہ میں۔

”شکر ہے اس رب العزت کا جس نے آپ کے بیٹے کو نبی زدگی دی ہے۔“ ڈاکٹر زاپے کا سہا ب آپریشن سے بہت خوش تھے۔

”شکر ہے پروردگار کا۔“ تنزیوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں سجدہ ادا کیا تھا۔ سلیم امر اور فہیم امر تو فوراً ہی مسجد چلے آئے تھے۔ نفل شکرانے کی نماز ادا کرنے صدقات و خیرات ادا کرنے، وہ اپنے رب کا بھنا شکر ادا کرتے کم تھا۔ غریبوں و مسکینوں کو خیرات تقسیم کی تھی۔ ایہ می میں تسلی ہی دیکھیں پہنچائی تھیں گو کہ اپنی تجویروں کے دل کھول کر منہ کھول دیئے تھے۔

سب نے اپنے اپنے طریقے سے اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا تھا۔ آسیہ تو سجدے میں گر کے ہچکچاہٹ

سے رو دی تھیں۔ ان کا بیٹا زمر کی جگہ جیت چکا تھا۔ رابو اور نمر نے بھی جائے نماز پجائے شکرانے کے فعل ادا کیے تھے۔

اس سب کے دوران کسی کو بھی ڈالے لا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ جب معاملہ کچھ بہتر ہوا تو حوائے غور کیا تو اگلے ہی سال موجود ہو گئی تھیں۔ اس کا تو اس وقت یہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ چراچ کہ کالج کسی کسی اس لیے تھیں اور تھیں اور تھیں۔ شہر کی ہنگامہ سے لے کر تھیں۔

”کیا! ڈالے کہاں ہے وہ اسپتال آئی نہیں ہے کیا؟“ حرا کو ڈالنے کی غیر موجودگی پر بہت افسوس ہوا تھا۔ دکھ تو شمرن پر بھی ہوا تھا۔ کیوں کہ ذر رکش بنمرن کو بہت چاہتا تھا۔ حرا اور شمرن میں کوئی فرق نہیں رکھتا تھا پھر ان دونوں کی غیر موجودگی!۔۔۔۔۔!

اس کے دماغ میں کسی گڑبڑ کے ہونے کی گھنٹیاں ہی بجنے لگی تھیں۔

”ہاں نجمہ بھابھی! ڈالے کو کیوں لے کر نہیں آئیں۔ حالات چاہے جو بھی رہے ہوں زریں ڈالے کا شوہر ہے۔ اس حقیقت کو ہم نہیں جھٹلا سکتے۔ ڈالے کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔“ رابعہ کو بھی ڈالے کی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

نجمہ نے شرمندگی سے آسپہ کو دیکھا تھا پھر رابعہ کو۔

”خوائے کو جب زرخیل کے بارے میں پتہ چلا تو وہ اسی وقت بے ہوش ہو گئی تھی۔ ارشد نے فوراً ڈاکٹر سعید کو بلوایا تو خوائے کو شک کی کیفیت میں بتایا اس کے دل و دماغ کو زبردست دھچکا لگا ہے اور دوسری بات کہ.....“ وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”دوسری بات کیا نجمہ بھابھی؟“ راجہ نے بغور ان کا چہرہ دیکھا تھا۔

”دوسری بات یہ کہ کڑا لے پھر سے امید ہے۔“

”کیا.....! مگر تجھے.....!“ آسیہ اور البو پرتو پیسے حیرانگی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پاری تھیں کہ یہ سب کیسے ہوا اور ان کی سوچ کو تجھ نے پڑ بھی لیا تھا۔

”اسلام آباد میں ڈالے اور ڈرہیل ایک ساتھ ایک ہوٹل اور ایک ہی کمرے میں دو دن ساتھ رہے تھے۔“  
پھر فجر سے آگے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ آسید نے فجر کو دیکھا ضرور تھا مگر سوچوں کے تانے بانے صرف اور صرف ایک ہی نقطے سے اٹھے ہوئے تھے کہ اگر ایسی بات سچی کہ بات یہاں تک پہنچی تو پھر ڈالے نے ڈرہیل کو چھوڑ کے ارشد کا ساتھ کیوں دیا؟

”پھر تو نجر بھا بھی آپ اس وقت گھر جائیں ڈالے کے پاس یہاں میں ہوں آسہ بھا بھی ہیں اور پھر اللہ کا بہت بہت کرم ہے کہ زور مسل بھی خطرے سے باہر ہیں۔“ رابعہ نے سنجیدگی سے نجر کو دیکھا تھا۔

”ہاں ڈالے کے پاس مقوم ہے وہ خیال رکھے گی اب فجر کی اذان بھی اونے والی ہے میں فجر کی نماز ادا کر کے پھر زمر میں کوئی کھڑی جاؤ گی۔“

”جلسے فحش ہے۔“ راجہ اور نغمہ دونوں ایک ساتھ وضو کرنے اندر بیٹھیں۔

☆...☆

وہ صبح فجر کی نماز کے بعد راجی کی حدود میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت خٹن آفریدی کی اتنی ہی

حالت تھی کہ اسے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی اس حال سے بھی گزرا ہو گا وہ۔

ایک توخند اوپر سے شدید بھوک نے اسے بالکل جیسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ خود ایسے بھی بھوک کا بہت کچا تھا اور جو حد بدہ گوشت اور بے زاری کا شکار تھا اس کی سب سے بڑی وجہ فرٹ سیٹ پر بیٹھی بڑی سی چادر میں لپیٹی ہوئی تھی جسے وہ اب تک صرف روٹے ہوئے تھی دیکھ اور سن رہا تھا، جسے چپ کرانے کی اس نے ذمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

”پلیز خدا کے لیے آپ خاموش ہوں گی۔“ آخر کار وہ لاروش افولان کے رونے سے پری طرح تھک چکا تھا۔ ہزار ہو چکا تھا۔ مگر لاروش افولان نے تو جیسے نہ چپ ہونے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ حین آفریدی کی بھی برداشت اب ختم ہو گئی تھی اس کے ممبر کا پکا نہ لیبر ہو گیا تھا۔

”قار کا ڈسک! چپ ہو جائیے ورنہ یقین چاہیے میں آپ کو ابھی اور اسی وقت اس گاڑی سے نیچے اتار دوں گا۔“ بے حسی اور سختی کی ساری حدیں توڑ دیں تھیں اس وقت حین آفریدی نے، لاروش افولان اس کے یوں دھاڑنے پر بری طرح سہم کر اس کی بلوریں آنکھوں میں جھٹکے لگی جہاں زمانے بھر کی بے زاری تھی۔

”آئی سوئیر اگر اب آپ کی مجھے اتنی سی بھی آواز آتی تو میں کوئی لحاظ نہ کروں گا اور نہ ہی کوئی رعایت۔“ حین آفریدی نے غصے سے کہتے ہوئے لاروش افولان کی سبکی سبکی خوف زدہ ہرئی آنکھوں میں بخور دیکھا تھا اور پھر دکھوں کا رخ پھیر کر نظریں وڈا سکریں پر جمادی تھیں۔

اس کا ذہن بری طرح تھک چکا تھا بلکہ اس کا ایک ایک اعضاء دکھ رہا تھا اور پیٹ میں الگ بھوک سے آنتیں قل حوالہ پڑ رہی تھیں۔ اس سے اتنی بڑی قسطنطنی ہو گئی تھی کہ اپنے کھانے پینے سے ہر ایک گھری بھول گیا تھا۔ جوانی جلد بازی کے نکاح کے پتھر میں جہاں آرام کے بیڈروم سے اٹھنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ سوچ بھی رہا تھا کہ کسی ہوٹل میں رک کے اچھا سا طوطہ پوری کا ناشہ کرنے مگر دل شدت سے یہی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے گھر آ جائے اور وہ اپنے آرام وہ بڑے سے روم میں سکون سے بھر پور نند کے حے لے۔

لاروش افولان، حین آفریدی کے سختی سے ڈانٹنے پر چپ تو ہو گئی تھی مگر دل اندر سے بھر بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دل و دماغ صرف وہیں جہاں آرام کی طرف الٹا ہوا تھا۔ گھر میں سب کو جب پتہ چلے گا وہ جانے ماموں سمانی کا رہنا تو کیا ہو گا لالا لال کو ان کو چھوڑے گی نہیں۔“ انہی دردناک سوچوں میں گھری رہی تھی وہ کہ پتہ بھی نہیں چلا گھر بھی آ گیا تھا۔ حین آفریدی کی گاڑی گھر کے دروازے پر آ رہی تھی۔ آٹو جیک دروازہ کھلا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہو گئی تھی۔

لاروش افولان نے نظر اٹھا کے دیکھا تھا۔ اس کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئی تھیں وہ گھر نہیں کوئی شاعر اس کا سائل تھا۔ اتنا بڑا ہر اہر اس سالان جہاں ہر قسم کے پھولوں کے چھوٹے بڑے سیکلے ترپنے سے رکے گئے تھے۔ پتہ نہیں کتنے قسم کے تو درخت بھی کھڑے تھے جس میں بہت سے قسم کے پھل بھی لگے ہوئے تھے۔ سج سادق کے وقت کا یہ ہر اہر اساطیر آنکھوں کو توڑاٹھ رہا تھا۔ ایک سکون سا اندر تک اتر رہا تھا۔ رنگ بر رنگ ہر قسم کے پھولوں اور پھلوں کا یہ بڑا سا باغ اس قدر حسین اور دلکش لگ رہا تھا کہ وہ اس سرسبز و ہریالی میں کھوی گئی تھی اور اس قدر بڑے سے سرسبز لان کے بچاؤ کا بچاؤ مانیوں اور مارٹل سے

”کون ہوتا، یہاں کیا کر رہی ہو کسی کی اجازت سے اندر آئیں۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“ بہت سے ایسے سوالات اس کے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے۔  
 ”کون ہو جی تم؟“ اس قدر نرم و ملائم لب و لہجہ اتنا شیریں انداز کہ اسے اپنی فضول سوچوں پر ترمیم کی محسوس ہوئی تھی۔

”جی..... جی.....“ زبان لڑکھرائے رہ گئی تھی۔

”بی جان کی زیرک نگاہوں سے اس کی گھبراہٹ چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اس کی فیر ہوتی حالت سے ایسا لگا جیسے وہ ابھی سسکیں بے ہوش ہو جائے گی۔ بی جان ہولے سے مسکرا دیں۔

”ایسا کرو پہلے آرام سے سکون سے بیٹھ جاؤ۔“ شاباش۔“ بی جان صوفے پر بیٹھی تھیں تو لاروش اغولان بھی وہاں اپنی جگہ پر کب گئی تھی نگاہیں بدستور جمی ہوئی تھیں۔  
 ”اب یہ بتاؤ کون ہوتا اور کیا نام ہے تمہارا؟“

”لاروش..... لاروش اغولان۔“ لاروش اغولان نے چٹکیا تے ہوئے بی جان کو دیکھا تھا۔

”لاروش اغولان.....؟“ بی جان نے اس کا نام دہرایا تھا اور پھر بغور اس کا خوف زدہ چہرہ اس کی ذری ذری ہرٹی آنکھیں دیکھیں۔

”تم جہاں آرام کی لو اس ہو؟“ بی جان فوراً ہی پہچان گئی تھیں۔

”جی۔“ لاروش اغولان نے دھیرے سے گردن اثبات میں ہلا دی تھی۔

”جہاں آرام کیسی ہے وہ نہیں آئی تمہارے ساتھ اور تم کیسے آئی ہو؟“ ایک ساتھ اچھے سارے سوالات و سوچ منوں میں گھبرا کے رہ گئی تھی۔

”جی وہ.....“ لاروش اغولان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ آیا زمین آفریدی کا نام لینا بھی مایہ پائیں مگر اس کی یہ مشکل بھی بی جان نے آسان کر دی تھی۔

”زمین آفریدی تمہیں یہاں لایا ہے؟“

”جی۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے اسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔

”اور جہاں آرام وہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں آئی؟“

”جی نہیں۔“

”کیوں جہاں آرام کیوں نہیں آئی؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ بی جان کے لہجے میں واضح

فکرمندی محسوس کی جا سکتی تھی۔

”نہیں نا تو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ان کے ذکر پر لاروش اغولان کی ہرٹی آنکھوں سے آنسو

چھلکنے لگے تھے۔

”پریشان مت ہو، اللہ بہتر کرے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اس سے فون پر بات کر لوں گی۔ تم

بہت لمبے ستر سے آئی ہو۔ کچھ دیر آرام کر لو پھر لی کرنا شہ کریں گے اور یہ کہ اب سے تم ہی اپنا گھر

سمجھنا۔ بہت آرام اور سکون سے رہنا تمہیں یہاں نہ تو کوئی تکلیف ہوگی اور نہ ہی تمہیں یہاں کوئی پریشان

کرنے والا ہے۔ جہاں آرام تمہارے لیے بہت پریشان بھی فکرمندی اندر رہی اندر رکھتی رہتی تھی۔ میں ابھی

یہاں تک کہ ہر ماؤں کی گاڑیاں وہاں لائن سے کھڑی تھیں۔ جہاں آرام نہ تھا تھا کہ یہ لوگ بڑی ہشتی رہیں ہیں۔ یوں سمجھو دولت، شہرت، عزت یہ لوگ اوپر سے ہی لکھو کے لائے ہیں مگر اتنے امیر ہوں گے وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خود اس کو اپنی ذات پر ابر میں بیٹھے تھیں آفریدی کے سامنے بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔ کوئی دو منٹ تو گئے ہی ہوں گے انہیں مین گیٹ سے پوری جگہ آنے میں۔

”یہ سب بعد میں تلی اور سکون سے دیکھ لیجئے گا۔ کیوں کہ آپ کو اب یہیں زندگی بھر رہنا ہے۔ یہ سب آپ کا بھی ہے مگر فی الحال پلیز ابھی اندر نہیں کیوں کہ میرا اسٹینڈ بائلنگ ختم ہو گیا ہے۔“ حسین آفریدی کی آواز پر اور اس کے لفظوں پر وہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی تھی اور خود اپنے آپ کو ہی دل ہی دل میں برا بھلا بولنے لگی تھی۔

حسین آفریدی کی گاڑی سے نیچے اتر کر لا روش اخوان بھی اپنی بڑی سی چادر سنبھالتی نیچے اتری تھی۔ کار پور پارک سے ہوئے وہ اس محل میں داخل ہوئے تھے۔ حسین آفریدی نے تو ایک سکون سے میرا سانس لیا تھا کہ جانے کتنی لمحوں سے بھری مسافت طے کر کے آیا ہو۔ کچھ یاد آنے پر اس نے ایک نظر پلٹ کر اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی کالی چادر میں لپٹے وجود پر ڈالی تھی۔

”ایک بات اور کہنی ہے ہمارا نکاح ہوا ہے فی الحال اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کریں گی آپ جب وقت آئے گا تو میں خود بات کر لوں گا۔“

اور پھر وہ رکنا نہیں تھا۔ تیزی سے چلا ہوا اوپر کی سمت بڑھا تھا۔ لا روش اخوان تو صرف دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی تھی۔ اتنے بڑے سے خوب صورت ترین لاؤنج کے سینئر میں وہ اسے اکیلا چھوڑ کے اوپر جانے کون سے کمرے میں غائب ہو گیا تھا۔ حسین آفریدی کی اس قدر بے بسی و بے مروتی پر اس کا دل بڑی طرح پھوٹ پھوٹ کے روئے نہ کر رہا تھا۔ اب وہ کہاں جائے یہاں اس گھر میں کون اس کو پھانسنے گا اور نہ ہی خود کسی کو جانتی تھی۔ عجیب شش و پنج کا شکار وہ بے وقوف کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ تو یہاں اندر آنے والا راستہ بھی نہیں جانتی تھی۔ جب کھڑے کھڑے ہی شش ہو گئے جسم کا ہر عضو تو پہلے ہی دکھ رہا تھا جب برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ وہیں ایک صوفے پر ٹپک گئی تھی۔

”نانو! آپ نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ کہیں میری زندگی میں ایک نئی آزمائش تو نہیں آ رہی ہے۔ اب میرے خدا میں کیا کروں تو ہی میری مدد فرما۔ مجھے یہاں لانے والا میری زندگی کا ساتھی شریک حیات میرا بھائی خدا تو ہے خیر اپنی نیند کے حوالے نہ رہا ہوگا۔ جسے یہ بھی احساس نہیں کہ میں یہاں نہ کسی کو جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں نہ ہی کوئی مجھے جانتا پہچانتا ہے۔ اگر مجھے کسی نے اس گھر سے نکال دیا تو؟“ اس سے آگے کی سوچ ہی نہایت تکلیف دہ اذیت، ناگہمی۔ وہ تو جس اب روئے ہی والی تھی کہ کسی کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کے دیکھا تھا۔

آنے والی خاتون اس کی نانو کی عمر کی ہی خاتون تھیں۔ جو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے نزدیک آٹھویں تھیں۔ لا روش اخوان ان کو دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں کھینکھانے لگی تھیں اب وہ اس سے سخت لپٹے میں پوچھیں گی۔



اسے فون کر کے کہہ دیتی ہوں کہ اب اسے تمہاری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب سے تم میری ذمہ داری ہو تمہیں یہاں سب کچھ ملے گا۔ پیار، مان، محبت، چاہت، عزت سب کچھ اور تم بھی خود کو اکیلا اور حماقت سمجھنا چھو جہاں آرام ہے ویسے ہی تمہارے لیے میں ہوں اب سے تم مجھے بی جان ہی پکارنا۔“ انہوں نے لاروش اغولان کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔ لاروش اغولان کا دل بھر آیا تھا اس کے دل کو جیسے سکون سا ملا تھا۔ جیسے پتلی کڑتی ہوئی دھوپ سے وہ ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں آٹھنچی ہو۔ ہرنی آنکھیں اس جانثار ہوتی محبت پر بھرنے لگی تھیں۔ توی جان نے اس کو بوڑھ کر خود سے لگا لیا تھا۔

”بس اب رونا مت۔ اب تمہارے رونے کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ آج سے میں تمہاری ان پیاری پیاری سی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں، ہمیشہ خوشی دیکھوں ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھوں ٹھیک ہے؟“

لاروش اغولان نے ہولے سے سر ہلا دیا تھا۔ بی جان نے اس کی چھٹی پیشانی پر بوسہ لیا تھا اور اپنے ساتھ کھڑا کیا تھا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے ایک کمرے میں لے گئیں۔ جو بہت بڑا کشادہ اور خوبصورت تھا۔

”اب سے یہ کمرہ تمہارا ہے تم یہاں سکون سے رہنا۔ کسی بھی شے کی ضرورت ہو بلا جھجک کہہ دینا۔ بالکل بھی نہ شرمانا نہ ہی گھبرانا۔“

”جی بی جان!“

”اب تم کچھ دیر سو جاؤ آرام کرو۔ باتیں پھر کریں گے۔ ابھی تم زوہار سے ملو گی تو لاؤ خوش ہو جاؤ گی۔ اب جاؤ آرام کرو میں جب تک ناشتہ بخواتی ہوں پھر سب مل کر کریں گے۔“ انہوں نے ایک بار پھر بزرگانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلی گئیں۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اسے غنڈ کی ہر سکون دہائی میں کھوئے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سلی ریشم جیسے نرم و لطیف بالوں میں کوئی دھیرے دھیرے اٹھایاں پھیر رہا ہے اور ہولے ہولے سے شرابی آواز میں اسے پکار رہا ہے۔

”لاروش..... جان اٹھ جاؤ دیکھو وہاں کے دو بج گئے ہیں اٹھو شاہزادہ کھالو۔ بھوکا بھرا لگی ہو گی تمہیں لاروش بیٹا۔“

مست سے بھری پور آواز میں جیسے وہ کھوی گئی تھی۔ اس نے بھی اپنی مٹی ماں کو دیکھا تو نہیں تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جنت میں ہے اور اس کی ماں بالکل اس کے قریب چلی اسے پیار سے سہلا رہی ہے۔ اسے پکار رہی ہے وہی خوشبو وہی سکون وہی راحت جو بھی دنیا میں اسے میسر نہیں تھی۔ وہ اس پلے خود کو بہت پر سکون محسوس کر رہی تھی۔ زمانے کی نگلیوں، اڑتوں سے آزاد کھڑی تھی اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری خوشنما سی مسکراہٹ تھی اگر یہ خواب ہے تو یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے وہ تمام عمر اس خوشبو بھرے حصار میں رہنا چاہتی تھی۔ اس ایک لمحے نے اس کے سارے دکھوں، ساری نگلیوں کا کھانا کر دیا تھا۔ اس کی روح پر جسم پر گئے دکھوں سے سنے لہو کو بھلا دیا تھا۔ زوہار یہ آہستگی سے مسکرا دیں وہ سمجھتی تھیں مست سے مروج یہ پیاری سی مصمم بھولی بھالی لڑکی خوابوں و خیالوں کی وادیوں میں اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کے مکھلے لاروشی ہے۔ خوش ہو رہی ہے وہ جانتی نہیں تھیں کہ لاروش اغولان کا خواب توڑیں مگر وہ صبح سات

بچے سے بھوک پیاسی سو رہی تھی۔ انہیں لاروش اغولان کی بھوک کی بھی غرلائی تھی۔ انہیں بے ساختہ اس کی مصمصیت پر پیارا آیا تھا۔

زوہاریہ بچہیں اور دھیرے سے اس کی روشنی پریشانی پر پیار بھرا شفقت سے بھرا بوسہ لیا تھا۔ ان کے پیادھیرے کس پر لاروش اغولان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ اس کا خواب ٹوٹا تھا خود پر بھگے اس چہرے سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھی تھی۔ ان ہرئی آنکھوں میں خوف و ہراس واضح طور پر زوہاریہ دیکھ رہی تھیں۔ ابھی بھی لاروش اغولان کا ہاتھ زوہاریہ کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ لاروش اغولان نے اپنا ہاتھ ان ہاتھوں میں مقید دیکھا تو ہرئی آنکھوں کا خوف مزید دو چند ہو چکا تھا۔

”ذرو نکلیں بیٹا؟“ زوہاریہ نے نرم سکر اہٹ سے اس کو دیکھا تھا۔

”آ..... آپ..... کون؟“ لاروش اغولان کی گھبراہٹ کسی طور بھی کم نہیں ہو رہی تھی۔

”میں حسن کی ماما ہوں اور اب سے تم بھی مجھے ماما صرف اپنا ماما سمجھ سکتی ہو بلکہ کہہ بھی سکتی ہو۔ میرے صرف دو بیٹے ہیں ایک پیاری سی چاندی بیٹی کی کئی کئی وہ تم نے آکر پوری کر دی ہے میرے رب نے میرے آئین میں بھی چاندی بکھیر دی ہے۔“ زوہاریہ نے اس کے پھولے پھولے سرخ و سفید گالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ لاروش اغولان ان کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بولو گی نہیں، کیا میں بہت بری ہوں؟“ زوہاریہ نے اس کی ہرئی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”نہیں..... تو..... وہ زوہاریہ کے اس قدر پیار پر شرمندگی سے سر جھکا گئی تھی۔ زوہاریہ نے بنور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”بی جان کہہ رہی تھیں کہ تم بہت مصمصی بھولی بھالی ہو مگر میں کہتی ہوں تم بہت زیادہ پیاری اور خوب صورت ہو۔“ لاروش اغولان اپنی اس تعریف پر بری طرح جھینپ کر رہ گئی تھی۔ زوہاریہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

”اچھا یہ بتاؤ تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے؟“

”جی۔“ اس نے حیران ہو کر زوہاریہ کو دیکھا تھا۔

”جانتی ہو کیا نا تم ہو رہا ہے، دوپہر کے ڈھائی بج رہے ہیں۔“

”ڈھائی بج گئے۔ میں اتنی دیر تک سوئی رہی۔“ وہ شرمندگی سے آہستہ آواز میں خود سے بولی تھی مگر اس کی آہستہ آواز زوہاریہ نے سن لی تھی۔

”تم بہت عرصے بعد شاید سکون کی گھڑی نیند سوئی ہو۔ میں کوئی تین بار چھیں دیکھنے آئیگی ہوں مگر تم اتنی بے خبر اور پرسکون مٹھی نیند سو رہی تھیں کہ دل ہی نہیں چاہا چھیں اٹھا دوں۔ مگر مجھے تمہاری بھوک کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ اس لیے چھیں اٹھا دیا بی جان کو بھی تمہاری بہت فکر ہو رہی ہے۔“ زوہاریہ نے نرمی سے دیکھتے ہوئے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا۔

انہوں نے تو تیار ہو چاہتے تھے اس کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ماں تو اس نے کبھی دیکھی نہیں تھی مگر شاید اگر آج اس کی اپنی مٹی ماں زندہ ہوتی تو یقیناً وہ بھی ایسے ہی اس کی فکر کر رہی ہوتی۔

”کیا سوچنے لگی ہو بیٹی؟“

”جی.....!“ وہ چونک کر زوہاریہ کو دیکھنے لگی تھی۔

”چلو خیر سب باتوں کو چھوڑ دو ہم ہاتھیں باندھیں ڈھیر ساری کریں گے۔ پہلے تم اشو جلدی سے فریٹس ہو جاؤ۔ پھر مل کر ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں ابھی تک میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ کیوں کر آج کا روپہ کا کھانا میں اپنی پیاری سی بیٹی کے ساتھ کھاؤں گی۔“ لاروش اغولان کو حریفہ شرمندگیوں نے اپنے حصار میں لے لیا کہ وہ اس کی وجہ سے بھوک پیٹتی ہیں۔

”اشو شاہاش!“ زوہاریہ نے لاروش اغولان کا ہاتھ پکڑ کے بیڈ سے نیچے اتارا تھا۔ لاروش اغولان آدھے کھٹے بھجورے زوہاریہ کے ساتھ ڈاسٹیک بیکل پر بیٹھی تھی۔ بیکل پر تین چار ڈسٹرز رکھی ہوئی تھیں۔ بریانی، شامی کباب، سالن میں اچار گوشت اور حلیم بھی تھا۔ پیٹھے میں کبیر اور سویاں تھیں۔ اس کے علاوہ ہاٹ پاٹ میں تندور کی اور گمر کی نئی روٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اب پتا نہیں یہ اس کے لیے اتنا اجتماع تھا یا روز کا معمول تھا۔

”چلو بیٹا! لاروش، بسم اللہ کرو۔“ لاروش اغولان تو جیسے شرم و جھجک سے زمین میں ہی گڑی جارہی تھی۔ وہ تو پہلے بھی اتنی کھانے کی شوقین نہیں تھی مگر زوہاریہ کی زیرک نگاہوں نے اس کی شرم و حیا پڑھ لی تھی اس لیے انہوں نے خود اس کی پلیٹ میں شمن بریانی اور کباب رکھ دیا تھا۔

”آئی! اب بہت زیادہ ہے۔“ زوہاریہ نے تقریباً اس کی پلیٹ بریانی سے بھر دی تھی۔

”پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے آئی نہیں کوئی اور دوسرا کہ تم صبح کی بھوک ہوا اور میں جانتی ہوں تم شرماری ہو۔ اس لیے تم یوں مجھ کو آج سے کہ بیٹی اپنی ماں کے پاس آگئی ہے اور اس کے ساتھ کھانا کھا رہی ہے۔ اس لیے ہر شرم و حیا ایک طرف رکھو اور بلا جھجک کھانا پیٹ بھر کے کھاؤ۔“ زوہاریہ کی اتنی محبت بھری مٹاپر وہ جیسے نہال ہو گئی ہو اس کا دل بھر آیا تھا۔ ہر نی آنکھوں میں نمی سی آنکھیں بھی جس میں سے چند منی ٹوٹ کر رخسار پر ٹپکتے چلے گئے تھے۔

”بری بات ہے روہے نہیں ہیں۔ کسی بھی ماں کو اپنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے ہیں۔“ زوہاریہ نے اس کے آنسو صاف کیے تو لاروش اغولان کا دل بھر آیا ہے ساختہ ہی اس نے زوہاریہ کا ہاتھ تھام لیا اور عقیدت سے ہونٹوں سے چوم لیا تھا۔

”میں اتنی محبت کے قابل نہیں ہوں۔“

”یہ تو تم میرے دل سے پوچھو کہ تم کس قابل ہو اور تمہاری میرے دل میں کتنی قدر ہے۔ میں تو اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ بیٹی کے لیے ترسی ہوئی ماں کو ایک لمبی پلائی بیٹی مل گئی ہے۔“ زوہاریہ نے اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ مٹا کے پیار کی خوشبو کو ترسی لاروش اغولان کو ایک ماں اس کی مٹا بھری خوشبو مل گئی تھی۔

”اب شاہاش رو نہ بند کرو۔ یوں رو کہ تم میرا بہت دلی دیکھا رہی ہو۔“

”سوری۔“ لاروش اغولان روہے روہے مسکرا دی تھی۔

زوہاریہ نے اسے بیکل پر رکھی ہر ڈش کھلائی تھی۔ لاروش اغولان نے اب تک کی اپنی زندگی میں یوں پہلی بار کھل کر بلا خوف بلا جھجک پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہو گا۔ ورنہ وہاں مسائی تو اس کے سر پر کسی تلوار

کی طرح لٹکی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نانو اور مہمانی کی کبھی بھی نہیں بنتی تھی اور جیت ہمیشہ نانو ہی ہوں تھی۔ مگر مہمانی کے عتاب کا نشانہ لا روش اغولان ہی بنتی تھی۔ اتنا کچھ نانو سے سننے کے بعد بھی وہ لا روش اغولان کو ستانے سے باز نہیں آتی تھی۔ وہ غلام حمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں کٹواتی تھیں اور لا روش اغولان وہ بے چاری تو ہیں ان کی کڑوی تسلی انہیں خاموشی سے ہی ملتی تھی۔ ان کی زیر پرہیزی تھیں حتیٰ کہ کبھی کبھی ان کی مادر بھی برداشت کرتی تھی۔ مگر نانو کبھی کچھ نہیں بتاتی تھی کہ پڑائی جھگڑا حیدر پڑے گا۔ اس لیے چپ چاپ رات کو جہاں آرام کے برابر میں آکر لیٹ جاتی تھیں۔

جہاں یہ زیرک نظریں رکھنے والی خانوں تھیں۔ فوراً پہچان جاتی تھیں۔ لا روش اغولان کو یہاں آئے تین دن ہو گئے تھے اور تین دن میں جنسی محبت اسے زوردار اور بی جان سے ملی تھی اس کا اس نے تصور بھی نہیں تھا مگر ہاں اسے یہاں لانے والا حسین آفریدی جس کی شکل بھی اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی اور ان کے مابین جو رشتہ زبردستی مجبوری کے تحت جوڑا گیا تھا وہ رشتہ بھی شاید حسین آفریدی کی بھول چکا تھا۔ اس لیے بی جان یا زوردار نے اب تک اس سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ وہ انکی سب سوچوں میں ٹھہری صوفے پر اکیلے بیٹھی تھی۔ سانسے نفل سانسے کانی دی ضرور چل رہا تھا مگر اس کی نگاہیں اسکرین پر نہیں تھیں۔ اس کے دھیان کے سارے اچھے دھماکے حسین آفریدی میں ہی اچھے ہوئے تھے جانے آگے کا منتظر اس کا کیسا تھا کیا نصیب میں لکھا تھا اس کی اس مجبوری کے رشتے کی زندگی تھی۔

”ماں..... ماما..... موم.....“ ایسے بہت سے ناموں سے پکارتا ہوا حسین آفریدی اوپر ریٹک سے پھسلتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ آواز اتنی اونچی اور بلند تھی کہ خود لا روش اغولان بھی اپنی سوچوں کو سوچتی بری طرح چوکی تھی اور اس سمت دیکھنے لگی۔

”بہنی“ چپچپ سے زوردار نے دہل کر سینے کا ہاتھ رکھا تھا۔  
”یہ کیا حرکت ہے بیٹی! اگر تمہیں چوٹ لگ جائے تو پیچتا بالکل نہیں جائے گا تمہارا۔“ حسین آفریدی کی زوردار پکار سے ہی زوردار یہ کہن سے باہر نکل کر آئی تھیں۔

”موم! مانی سویت اینڈ کیٹ ہے بیٹی آپ کا بیٹا بہت اسٹریٹنگ اور ڈھیٹ ہے۔“ وہ فوراً ہی مسکراتا ہوا زوردار کے گلے کا ہار بیٹا تھا۔ ایسا ہی تھا وہ سب سے بونکی اپنے لاؤ انڈھوا تھا۔  
”فضول کی باتیں بھالو تم سے صرف۔“ انہوں نے حسین آفریدی کو خود سے الگ کیا تھا۔

”یہ بتاؤ کیوں اتنی زور زور سے چیخ رہے تھے؟“  
”چیلے آپ یہ بتائیے میرے روم میں کب آئی تھیں؟“

”خیر اخیال ہے تین دن پہلے، کیوں؟“  
”جسمی یہ حال ہے میرے روم کا۔“ زوردار یہ اس کا اشارہ انہی طرح سے سمجھتی تھیں۔  
”اس گھر میں اتنے ملازم رکھے ہیں مگر کسی کو زحمت نہیں کہ میرے روم کی صفائی۔“ قرانی کر دے خوب سر پر چڑھایا ہوا ہے آپ نے ان لوگوں کو۔“ حسین آفریدی باقاعدہ ناراض ہو رہا تھا۔  
”ملازموں کو چھوڑو سب سے زیادہ تو میں نے تمہیں سر پر چڑھایا ہوا ہے۔ تمہارے کمرے کی صفائی

کرنے کی ہمت نہ تو مجھ میں ہے اور نہ ہی گھر کے ملازموں میں بقول ان کے جتنی محنت اور جتنا کام وہ اس گھر کی صفائی ستھرائی میں لگا دیتے ہیں اس سے زیادہ ذہل وقت حسین صاحب کے کمرے کی صفائی میں لگتا ہے اب میں اتنی ظالم اور بے رحم نہیں ہوں کہ ان بے چاروں کو جان کر سٹاؤں۔ اس لیے میں نے خود ہی ان لوگوں کو منع کر دیا ہے کہ آج سے وہ صرف یہاں کی صفائی ستھرائی کریں گے کوئی بھی حسین کے کمرے میں نہیں جائے گا۔“

”موم! ازناٹ فیر۔“

”تو مائی سوٹ چائلڈ اٹ از فیر۔ اب سزا یہ ہے تمہاری کہ خود ہی اپنا پھیلا نکھرا کر وہ میٹھا سے صاف کرو۔ جب خود کرو گے صفائی تو پتہ چلے گا کہ کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔“ زوہاریہ نے پچکار تے ہوئے اس کے بچے سنورے ہال بکا زدے تھے۔

”موم!“ وہ زچہ ہوتے ہوئے چیخا تھا۔

اور پوچھی اس کی نظر سامنے انھی تھی۔ جہاں لاروش اغولان بیٹھی انہی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اور دیکھ رہی تھی۔

حسین آفریدی نے چہرے لمبے بنوڑے دیکھا تھا اور پھر جیسے جمو کے سے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا۔

”آل رات موم! آپ نے تو مجھے ہری جھنڈی دکھا دی مگر میں بھی بہت چالاک ہوں۔“ اس نے زوہاریہ کے گال پر ہانگی بجائی تھی۔

”کیا مطلب؟“ زوہاریہ نے نا کھنجی کی کیفیت میں حسین آفریدی کو لکھا تھا جو ایک مرد سانس سمجھتا ہوا چلا ہوا لاروش اغولان سے چند قدم کے فاصلے پر آٹھرا تھا۔ لاروش اغولان جو حسین آفریدی کو بنورنگ رہتی تھی، بری طرح جھنجپ کے رہ گئی اور اپنی ہرٹی آنکھیں نیچے مار بل کے بے فرش پر ٹکا دیں۔

”موم! ہمارے گھر میں چونکہ ملازموں کی کمی تو نہیں ہے۔ اس لیے یقیناً لاروش گھر کا کوئی کام نہیں کرتی ہوگی اور نہ ہی آپ اس سے کوئی کام کروائی ہوں گی۔“ حسین آفریدی پر سوچ انداز میں اس کی جھکی نگاہوں کو ہنسنے لگا تھا۔

”بالکل درست کہا تم نے اور میں لاروش سے اس گھر کا کوئی کام کراؤں گی بھی نہیں۔“ زوہاریہ، حسین آفریدی کی سوچ پر ہنسنے لگی تھیں وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان دونوں کے پاس آ کر دی تھیں۔

”تو ٹھیک ہے آج سے لاروش ہی میرے بیڈروم کی ساری صفائی کرے گی۔“ بلا جھجک بنا شرم کے حسین آفریدی نے اس سے پوچھا نہیں تھا بلکہ اپنا حق سمجھ کر غم سادہ کیا تھا۔

”نہیں سنی! یہ بہت غلط بات ہے لاروش اس گھر کا کوئی کام نہیں کرے گی۔ لاروش میری بیٹی ہے اور میں اپنی بیٹی سے کوئی کام نہیں کراؤں گی۔“ زوہاریہ نے سختی سے حسین آفریدی کو کہا تھا۔

”اور جو تمہارے کمرے کی حالت ہوتی ہے اس سے تو مجھے وحشت ہوتی ہے۔ لاروش ٹھہری دھان پان کی چھوٹی سی ٹھنی جان تمہارے کمرے کی صفائی کرے گا۔ مجھے اپنی بیٹی کو یہ نہیں کرنا ہے۔“ زوہاریہ کو حسین آفریدی کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بھرپور اس وقت لاروش اغولان کی ہی وکالت کر رہی تھیں۔



”موسم! آپ کی یہ چوٹی ہی ٹھنہی سی جان نے وہاں کوئیر میں اپنے بہت بڑے سر سے۔۔۔  
چکایا ہوا تھا۔ وہ بھی کچن سمیت مگر یہاں لاروش صرف میرے کمرے کی صفائی کرنے کی آج سے یہ اس  
کی ذمہ داری ہے۔“

”نہیں اتنی! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ٹھیک ہے میں ایک ملازمہ صرف تمہارے کمرے کے لیے  
رکھوا دوں گی۔“

”نوسم! میں کسی پر بھی غبرو نہیں کروں گا۔ میرے کمرے کی صفائی اگر کرے گی تو صرف اور صرف  
لاروش ہی کرے گی۔ بس اب یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اگر مسئلہ لاروش کی سیلری کا ہی ہے تو میں اسے اپنی  
پاکٹ نشی سے دوں گا۔“

”جی!۔۔۔“ زوہاریہ کو حین آفریدی کا یوں کہنا سخت ناگوار گزرا تھا۔

اور یہاں لاروش اغولان جو حین آفریدی کے یہاں آنے پر اس سے بات کرنے پر خوش فہمیوں کے  
سندھ میں غوطہ زن تھی۔ آسمانوں پر اڑنے لگی تھی کہ حین آفریدی نے اسے یاد رکھا ہوا ہے اس کا نام یاد  
ہے مگر حین آفریدی کی آخری بات نے اسے عرش سے فرش پر لا پٹا تھا اس کے منہ پر زور دار طمانچہ مارا ہوا۔  
”آپ مجھے سیلری مت دیجیے گا۔ میں آپ کے کمرے کی صفائی کر دیا کروں گی۔“ لاروش اغولان  
نے نہایت افسردگی سے کہا تھا۔ زوہاریہ نے لاروش اغولان کی افسردگی کو گہرائی سے نوٹ کیا تھا۔

”بس! ان تو بھرا بھی جائیے اور میرے کمرے کی صفائی کر دیں جو بہت زیادہ پھیلا اور بھرا ہوا ہے۔“  
”حین۔۔۔!“ زوہاریہ نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”موسم! بلیر لاروش کو کوئی اعتراض نہیں ہے آپ بھی کچھ نہیں کہیں گی اور اب مجھے دیر ہو رہی ہے سمجھ  
زیدی میرا ویٹ کر رہی ہوگی۔ ہم آج ساتھ بیچ کرنے والے ہیں۔“

اس کا کام ہو گیا تھا اب اس کا یہاں ٹھہرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے یہ جاوہ جا مگر بیچے سے  
زوہاریہ آواز ہی دیتی رہ گئی تھیں۔

”موسم! بعد میں بات کریں گے۔“ حین آفریدی تیزی سے باہر نکلا تھا۔

”لاروش! حین نے جو کچھ کہا ہے اس کی ایک نہیں سننا اور نہ ماننا تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے حین  
کے کمرے کی صفائی کرنے کی۔“ زوہاریہ نے لاروش اغولان کو تسلیہ کی تھی۔

”ماما! کوئی بات نہیں اور پھر میں سارا وقت فارغ ہی تو بیٹھی رہتی ہوں۔ اچھا ہے کچھ ٹائم ہی کٹ  
جائے گا۔“ لاروش اغولان نے نرمی سے زوہاریہ کے ہاتھ تھامے تھے۔

”میری جان! اگر تم اس کا کمرہ دیکھو گی تو پریشان ہو جاؤ گی۔ حین بہت کاٹھنا ہے اپنا کمرہ۔ وحشت  
ہوتی ہے دیکھنے سے ہی۔“ زوہاریہ ہر طرح سے اسے منع کرنا چاہ رہی تھیں۔

”ماما! مجھے حادثہ ہے کام کرنے کی میں کر لوں گی آپ فکر مت کریں۔“ زوہاریہ کی مسکراہٹ اپنے  
لبوں پر سجائی تھی اور حین آفریدی کی باتوں پر بہت دکھتا تھا۔

”زوہاریہ!۔۔۔!“ اسی اثنا میں وہاں اپنے کمرے سے بی جان نکل کر آئی تھیں۔

”جی بی جان! اکیس۔“ زوہاریہ نے پلٹ کر دیکھا بی جان وہیں آ رہی تھیں۔

”بیٹا وہ بچہ ہے ناکیا نام ہے اس کا۔ جس کا ایکسٹرنٹ ہوا ہے جو اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔“

”بی جان! میرا خیال ہے آپ زرنسل کی بات کر رہی ہیں۔“

”ہاں وہی بچہ صحتار ہے جسے اس بچے کو بہت چومیں آئی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی تم اسپتال چلی جاؤ ابھی ڈرائیور کے ساتھ۔ پھر جب وہ گھر آجائے گا تو میں گھر چلی جاؤں گی اس بچے کو دیکھنے۔“

”جی بہتر لی جان جیسے آپ کا حکم۔“

”ہاں بیٹا! ہمارے نئی کا فرمان ہے کہ مریض کی عیادت کرنے ضرور جانا چاہیے۔“

”جی درست کہا آپ نے بی جان! میں یوں کرتی ہوں ابھی کچھ عرصہ میں نکلتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر ساتھ فردوس اور جوس وغیرہ ضرور لیتی جانا۔ یوں خالی ہاتھ جانا کچھ مناسب نہیں لگے

گا۔“

”بی جان! آپ نہ بھی کہیں تو میں یہ سب لازمی لے کر جاتی۔“

”مجھے تم پر یقین ہے زوہاریہ۔“ بی جان ہولے سے مسکرا دیں۔

”اچھا ایک ضروری کام اور بھی کرتی جانا راستے میں ایڈمی پڑھتا ہے۔ وہاں دینے کے لیے میں نے کچھ پکڑے وغیرہ لٹائے ہیں اور ایک دس ہزار کا چیک بھی ہے۔ یہ سب وہاں دیتی ہوئی چلی جانا یہ ہمارا فرض ہے اللہ رب العزت نے ہمیں اتنا نوازا ہے تو ہمیں خرچوں، بے سہارا، تنگیوں کا خیال رکھنا چاہیے اللہ بھی خوش اس کا نبی بھی خوش۔“

”ٹھیک ہے بی جان! آپ دسے دیکھیں میں یہ کام کرتی ہوئی چلی جاؤں گی۔“ زوہاریہ نے عقیدت سے بی جان کو دیکھا تھا۔

جب سے وہ شادی ہو کر آئی تھیں انہیں نہیں یاد پڑتا تھا تاکہ بی جان ہر ماہ ایک فطیر رقم اور بہت سے کپڑے وغیرہ دیتا بھولی ہوں گی۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان سے جو ہو سکتا وہ کرتی تھیں۔ کسی غریب، یتیم لڑکی کی شادی کا سن لیتی تھیں تو پوری شادی کا انتظام یہاں تک کہ اس کا جہیز بھی خود ہی دیا کرتی تھیں اور یہی عادت خود زوہاریہ نے بھی اپنائی تھی۔ وہ بھی چنگے سے ایسے بہت سے نیک کام کرتی رہتی تھیں۔ جس سے انہیں خوشی ملتی۔ راحت و سکون ملتا تھا اور یہی نہیں اللہ رب العزت نے ان پر ان کے گھر پر ان کی اولاد پر بھی بہت کرم کیا تھا۔ بہت کچھ کھانا تھا انہیں اللہ نے جس کا وہ جتنا شکر ادا کرتیں کم تھا۔

زوہاریہ بی جان کے کہنے پر ڈرائیور کے ہمراہ زرنسل کو دیکھنے اسپتال کے لیے نکل گئی تھیں۔

ادھر لاروش افولان انہی تھی۔ جین آفریدی کے حکم پر آج سے اس کے بیڑہ دم کی صفائی تھرائی اس کی ذمہ داری تھی۔ جیسے وہ ہا خوشی قبول کر چکی تھی۔ لاروش افولان، جین آفریدی کے کمرے میں داخل ہوئی وہاں کے منظر نے ایک لمحے کے لیے اسے پکرا کے رکھ دیا تھا۔

اف ہیرے خدا اس قدر گند اکرو اس کا، اس قدر پھیلے ہوئے کمرے میں بیٹھا اس کا دم ٹھٹھا ہو گا جب ہی تو اس نے جلدی سے لاروش افولان کو اپنے کمرے کی صفائی کا حکم دیا اور یہ جاہد چا۔

(جاری ہے)

سرش فاطمہ

انسانہ

# میری کہانی



”تم دونوں کو اور کوئی کام نہیں جب دیکھتا ہوں ڈانگھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہتی ہو۔“ اماں کو فطری پسند نہ تھا لیکن اب انہیں سہرے کتے اور جب جب ماہ نور تماشہ کہیں وہ لے آتے۔

”نہ گھر کا ہوش رہتا ہے نہ دودھ کا بس مسمی رہتا تم دونوں ان کتاہوں میں، ارے میں کتنی ہوں چم لے میں ڈالوان ڈانگھٹنوں کو کیا رکھا ہے ان میں سر داری سیکھو۔“

”اماں! اس سے بھی کافی ابھی باتیں کیجئے ہیں، ہم۔“ تماشہ نے کہا۔

”ارے چپ کر دو کن کی ابھی باتیں اماں کے آگے زبانی چلائی ہے بس، یہ بولو چائے جا کر با کدو سے آؤ، اور آج رات تک تم دونوں کو میں نے اس ڈانگھٹ میں گھسا بیٹھا دیکھا تو میں نے تمہارے اماں سے فاصلہ بات کر لی ہے اور بند کر دیتا ہے، تم ماہ نور جاؤ جا کر ہاشمی چڑھاؤ۔“

ماہ نور کچن میں بھلی گئی اور تماشہ بابا کے پاس۔

”آؤ آؤ بیچے اور سناؤ اس دفعہ کیا پڑھا؟“ اماں نے اس سے چائے کی پیالی لی اور پوچھا تماشہ سے۔

”ارے اماں! اس دفعہ تو اسے حرے حرے کے افسانے اور ناول آئے مڑا آگیا پڑھ کر جیسے کوئی ”ہنسی خیر“ ہو اور وہ جو دوسرا ڈانگھٹ تھا اس میں صرف آنسو رونا دھونا۔“

لہا جتے ہوئے ”اچھا اچھا، تمہاری اماں بڑی شکایتیں لگاتی ہیں تم دونوں کی۔“

”لو ہوا! کیا آپ اماں حضور کو جانتے نہیں کام کر کے بھی کیڑے لگاتے ہیں، گویا ہماری سانس ہوں اور ہم ان کی بہو ہیں۔“

دونوں باپ بیٹی فکری مذاق میں لگے رہے اور ماہ نور کچن میں تجربوں میں لگی رہی اور اماں کے طعنے سنتی گئی۔

”ارے تماشہ! دیکھ اس لہو کو، اس کی ناب طو لے کی چوٹی جیسی اور بالوں سے چھو لگ رہا ہے۔ ہائے ہمارے وہ لمبے بھائی ہونے والے۔“ وہ ڈکا اتنا بھی نرانا تھا جیسا اس کے بارے میں ماہ نور نے بیان کیا۔

”ہاں، ہاں سب کیڑے میرے لئے نکالنا، پنہ اپنے ہونے والے کے لئے بھی بچا کے رکھو۔“ تماشہ نے بھی جواب دیا۔

”میرے لئے تو خاص بندہ آئے گا۔“ ماہ نور نے اتر کر جواب دیا۔

”ہاں واقعی خاص ہو گا کالا سا مٹا سا پہلوان نما اور چشمے بھی سوئے سوئے۔“ تماشہ نے بھی بدلے لیا۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ میرے ہونے والے کا اتنا خوف ناک ترشہ کھینچ ڈالا، دفع ہو جاؤ اور یہ لوازمات لے جاؤ، وہاں سوالات کی چٹاری کھلنے والی ہے۔“ تماشہ بھی ڈھیر ساری شرم چہرے پر لے آئی آنکھوں کو پٹپٹا اور ہاتھوں کو لڑکھڑاتے ہوئے شرابی باہر لے آئی۔

”لڑکا دیکھ میں اتنا برا تو نہیں یہ مایہ بھی نہ آؤ۔“

”خیر خیر یہ سے تماشہ کا ترشہ ہو گیا، اب ماہ نور کا کیا کرنا چاہیے۔“ ماہ نور کی اماں جان بولیں۔

”ہاں بیٹم! اس کا بھی ہو جائے گا فکر نہ کرو۔“ اماں بابا ماہ نور کا سوچنے لگے۔

”کیسے نہ فکر کروں، گھر کے کاموں کو تو ہاتھ بھی نہیں لگاتیں پتا نہیں کیا بھرا رہتا ہے ان کے دماغ میں۔“

”اوہو بیگم صلیب! کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ، ہو جائے گا ان شاء اللہ اس کا بھی۔“ بابا نے تسلی دی۔

کچھ دن بعد ماہ نور کا بھی رشہ آگیا، وہ تو شکرانے کے نکل پڑنے لگی مگر جو ترشہ تماشہ نے

— x —

کھینچا تھا ایسا نہ ہوا اور وہ تو چڑا بھی رہی تھی اسے کہ صرا  
خو بصورت قہار اچھو۔"

— x — x —

دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ہوئیں۔ اچھے دن  
گزرے تھے لیکن ڈائجسٹ کے بناء امورے ،  
سر سال بھی ایسا ملا جیسا کہ باؤ میں بچہ جنھیں سخت  
کیزے لگائے والی ، نشہ کی ساس ایسی تھیں پر  
ماہ نور کی اچھی تھیں سخت وہ بھی تھیں پر مٹنے وغیرہ  
تھیں۔ ماہ نور کی کوئی ٹنڈ تھی ، جبکہ ایک چھوٹا دیور تھا ،  
نشہ بھرے سر سال والی تھی ، احسن اور ماہ نور اپنی اپنی  
پسند تقریباً روز ایک دوسرے کو تاتے تھے جس میں  
سے ماہ نور کا ڈائجسٹ کاٹنا اور احسن کا چڑنا۔

"کیا ہر وقت ڈائجسٹ ٹاولوں کی باتیں کرتی  
رہتی ہو؟ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے میڈم؟"  
اور ماہ نور چپ ہو جاتی۔ نشہ یاد آتی کھرا داتا ،  
کہاں تو ہر وقت وہ ڈائجسٹ میں گھری رہتی تھی اور  
اچھو تو احسن کو یہ موضوع پسند ہی نہ تھا۔

دوسری جانب نشہ اور اس کا شوہر حسنین کی  
ساتھ میں خوب مزے سے گزر رہی تھی۔ ہم حراج جو  
تھے ، خاص کر ٹاولوں کے شیدائی دونوں ہر وقت کہانی  
پر بات کرتے تھے۔

— x — x —

"السلام وعلیک ماہی ؛ کیسی ہو؟ تم نے تو بھلا دیا  
ہے یا سر سال میں ختم ہوتے ہیں؟" نشہ نے فون کیا  
تھا ماہ نور کو۔

"مت بوجھ یار ا حال عجیب ہے میرا تم اپنا ساؤ  
حسین بھائی جیسے ہیں؟" ماہ نور نے بے زاری سے  
جواب دیا۔

"میں تو بے مزے میں ہوں حسنین اچھے  
ہیں ، ارے پتا ہے وہ ہماری پسندیدہ راٹر ہیں ناں  
تورین حسنین تو بس ان کے بڑے مداح تھے ، ان  
سے تو بس کسی بھی وقت ڈائجسٹ ٹاولوں کی بات کرلو

وہ تیار ہیں۔"

"کیا بات ہے بھئی اور اچھو تو مسوف کو یہ سب  
پسند ہی نہیں۔" ماہ نور نے احسن کا تپا۔

"کوئی نہیں کچھ نا تم دو کیا پتا ، بعد میں سب ٹھیک  
ہو جائے۔"

"ہاں یار ! چلو میں فون رکھتی ہوں ورنہ ساس  
نے آکر ستا دی ہیں۔"

"چلو میرا اللہ حافظ۔" دونوں نے فون بند کر دیا۔

— x — x —

"کیا لکھ رہے ہیں آپ؟" ماہ نور نے احسن  
سے پوچھا۔ احسن نے ایک دم رجسٹر بند کیا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں کچھ آفس کا کام تھا۔"

"اچھا میں باہر جا رہا ہوں کام سے۔" یہ کہہ کر  
احسن نے رجسٹر بریف کیس میں رکھا اور کمرے سے  
کل گیا۔

احسن اکثر یوں لکھتے ہوئے پایا جاتا ، جب ماہ  
نور پوچھتی وہ کام کا بیان نہ کرتا۔

اس دن اس نے رجسٹر سے صفحے نکالے لٹافے  
میں ڈالنے کے لئے اور دراز میں لٹافہ رکھ دیا ، ماہ نور  
کمرے کی صفائی کر رہی تھی اور احسن کی سرگرمیاں بھی  
دیکھ رہی تھی ، احسن حسب معمول باہر کل گیا ، ماہ نور بھی  
اس کے ڈریک پر آئی اور صفائی کرنے لگی نہانے اس  
کے دباغ میں کیا آیا اس نے دراز کھولا اور لٹافہ اٹھا کر  
صفحے نکالے ، مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل  
گئیں ، اسے تو یقین ہی نہیں آیا اس نے لٹافے کے  
اندرواہیں پیچہ زور کھینچنے کے بعد اور دراز میں  
رکھ دیئے۔

احسن رات دیر سے آئے جب آئے ماہ نور کو جاگا  
دیکھا۔

"ارے تم سوئی نہیں؟"

"آپ کا انتظار کر رہی تھی"

"اچھا جی خیر ہے ناں ! آج کام نہیں کیا تھا



کیا؟ اور نہ تو جلدی سو جاتی ہو۔“

”ہاں کام تھا آپ سے“ ماہ نور نے دوپٹے سے کھینچے ہوئے کہا۔

”کام تھا خیر اور ایسا کیا تھا؟“ احسن نے بھی حیران ہوتے پوچھا۔

”خیریت ہی ہے بس اجازت لینی تھی۔“ ماہ نور نے کہہ دیا۔

”اجازت۔۔۔ کل بھی لے سکتی تھیں اچھا یوں کیا چاہیے؟“ احسن نے ٹالی کا ٹاٹ ڈھیلی کی۔

”مجھے نہ آپ ڈائجسٹ لگوادیں، یا لے لی آئیں دیکھیں میری پسندیدہ رائٹر کی کہانی آنے والی ہے اور مجھے پڑھنا ہے اُسے۔“ ماہ نور نے کہا تو احسن نے منہ لگا دیا۔

”جسمیں منع کیا ہے ہاں تم لاکھوں کو ان کے علاوہ کام نہیں۔“ احسن اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور آپ کو کوئی کام نہیں تھا جو ڈائجسٹ میں لڑی بن کر لکھنے لگ سکے۔“

”ماہ نور.....“ احسن نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”مجھے تو یقین نہیں آرہا جس رائٹر کی میں اتنی بڑی فنن تھی وہ کوئی اور نہیں آپ تھے۔“

”کہاں تو آپ روز اوّل سے سنا دیتے تھے، بلکہ ابھی بھی یہی کیا اور خود؟“ احسن خاموش رہا۔

”اگر لکھنے کا شوق تھا تو کم از کم اپنے نام سے لکھتے اور کہیں اور یہ کیا لاکھوں والے ڈائجسٹ میں آگے موصوف وہ بھی لڑکی بن کے۔“

”اب کچھ بولیں گے یا نہیں؟“ احسن بیٹھ گیا بستر پر اور گردن جھکالی۔ ”ماہی!

ہاں میں ہی لکھتا ہوں جھوٹ نہیں بولوں گا، لیکن اس کے پیچھے وجہ ہے، میں نے منع کیا تھا کہ گھر والے پسند نہیں کرتے اس کی اصل وجہ مہرین ہے۔“

”مہرین وہ آپ کی کزن؟ پر وہ تو..... اس کا

تو..... ماہ نور ہلکی سی۔

”ہاں وہ لکھتی تھی، گھر والوں کو یہ بات پسند نہ تھی تو اس نے چھوڑ دیا۔“

”پھر؟“ ماہ نور نے پوچھا۔

”پھر کیا؟ میں اس کا دوست تھا چھوٹے بھائیوں جیسا اچھے سے جانتا تھا اس کی ہر کہانی کا پلاٹ میرے پاس موجود ہے۔“

”وہ کیسے؟“ ماہ نور نے جس سے پوچھا

”اس کا سلسلہ دار ناول چل رہا تھا وہ مجھے ہر بات بتاتی تھی لکھنے سے پہلے پھر بعد میں پڑھتا۔ مجھے بھی شوق ہوتا تھا۔ گھر والوں کے منع کرنے کے بعد اس نے کبھی نام سے لکھنا شروع کیا یعنی ”نورین“ کے نام سے۔ آخری قسط آنے سے پہلے اس کا حادثہ میں۔“

”اسی لئے میں نے اس کا کام اسی کے نام سے جاری رکھا تم بتاؤ میں نے غلط کیا؟ اس کی ہر کہانی کا ایڈ میں جانتا تھا۔“

”نہیں آپ نے صحیح کیا پھر بے خیال سے اب آپ کو روک دینا چاہئے آپ نے غلط طریقہ پایا۔ وہ مرتبگی ہے ادارے والوں کو نہیں پتا پر آپ تو جانتے ہیں اور میں بھی۔“ ماہ نور نے ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

”ٹھیک ہے یہ آخری ناول ہوگا اس کا یعنی میرا اب خوش؟“ احسن نے کہا۔

”ہاں اور اب مجھے بھی لادیں گے ناں!“ ماہ نور نے بچوں کی طرح کہا۔

”چلو ٹھیک ہے! پر یہ سچ صرف میرے اور تمہارے سچ رہنا چاہئے۔“

دونوں نے اس ناول پر گفتگو کی اور ماہ نور کو یقین نہ آیا کہ اس کا شوہر ڈائجسٹ میں لکھتا ہے۔

”جسمیں کیا پتا ماہی میں نے کیوں لکھنا شروع کیا صرف اور صرف ماہرین کے لئے۔“

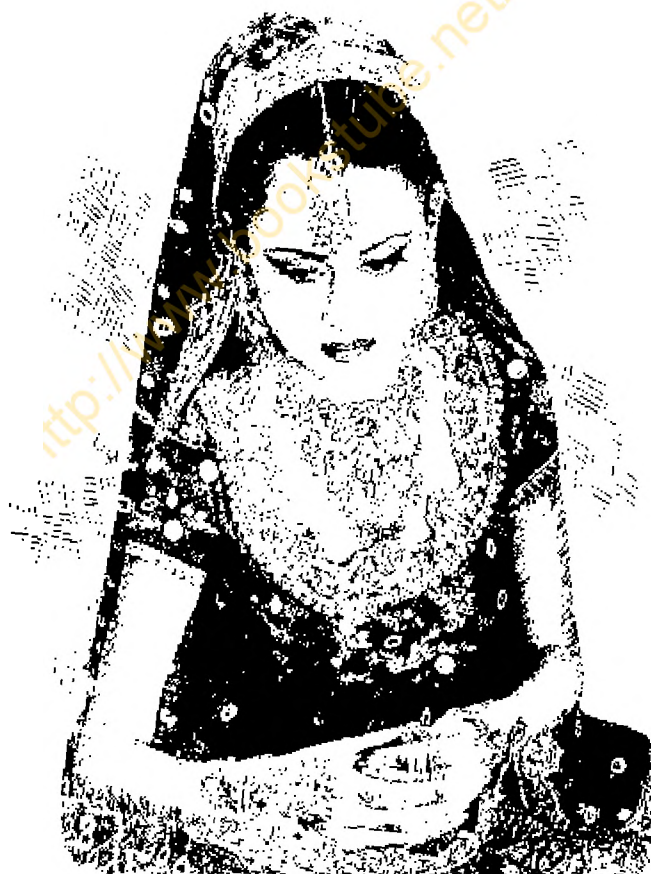
احسن نے دل میں سوچا اور ماہ نور سے مسکرا کر باتیں کر رہا۔ ☆☆☆

# معیت الہی کی صورت

”اسلام و عظیم بانو ایند دادا جان“۔ لاؤ گجھی  
آکر اس نے سلام کیا تھا۔  
”ای کہاں ہیں؟“  
”عظیم اسلام بیٹے رہو مگر یہاں مت بیٹھو میں“



جانتا ہوں، تم اپنے دادا کا ساتھ دو، گے چیچک میں۔  
 بچے پر جس میں جو ہو۔ "مزرک حسین" اُسے صوفے  
 سے اٹھائے۔ عظیم صاحب (نانا) نے کہا تھا۔  
 "جس از ثبات لنگر؟" میں آپ کا بھی ساتھ دیتا  
 ہوں اور یہ صرف میرے دادا ہیں آپ کے بڑے  
 بھائی بھی ہیں۔ شاید مسووی نکلی سے انہیں دیکھا  
 تھا۔  
 "یار! اصل میں یہ مجھ سے پارنے سے زیادہ  
 تمہاری چیچک سے ڈرتا ہے۔" عظیم حسین (دادا  
 جان) نے اُسے تھکی دی تھی۔ تینوں جس پرے  
 تھے۔  
 "جاتیہ اور چاتم کہاں ہیں؟" اس نے اپنے پیچھے  
 اور نیچی کوڑھوٹا تھا۔  
 "جیتا تمہاری امی کے پاس سو رہے ہیں، مگر میں  
 بنا ہوا بیڑا کھانا تھا، جو لازمہ کوئٹہ آتا ضد میں اپنے  
 حق سو گئے۔ تم نے بہت ضدی کر دیا ہے انہیں۔"  
 عظیم حسین نے افسردگی سے کہا تھا اور وہ تڑپ کر  
 رہ گیا تھا۔



☆ ☆ ☆  
 ”انزک ایک خبر ہے محترمہ! شہنشاہ خان ولدہ  
 بہن اور خان جاب کی تلاش میں اس وقت میرے آفس  
 میں کیا کرنا ہے؟“ حادثہ نے اسے غصہ پر مطلع کیا  
 تھا۔

”کرنا کیا ہے پندرہ منٹ دیر کر دیا شیر دل  
 گاڑی لے کر آتا ہے پھر باہر نکلے دیا آسانی سے  
 میرے پاس ہوگی۔“

اس کی بات پر حادثہ پریشان ہوا تھا ”انزک  
 دیکھتے تو اس کے باپ کا بے ٹو اے کیوں.....“  
 ”تصور تو ہم میں سے کسی کا بھی نہیں تھا نہ ان کا جو

مر گئے نہ ان کا جو مر جانے والوں کی یاد میں زعمہ  
 ہیں پھر اس کے باپ نے کیوں کیا سب“ دکھ غرائی  
 آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد شیر دل ایک لڑکی کو گن پوائنٹ پر  
 کمرے میں لایا تھا اسے باہر جانے کا اشارہ دے کر  
 اس لڑکی کو دیکھا تھا۔

”کون ہیں آپ اس طرح کیوں لایا گیا ہے مجھے  
 ؟“ خوف کے باوجود اس نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔  
 ”انزک حسین نام ہے میرا محترمہ! آج سے آپ

میری بھلائی ہیں مگر کام آفس میں نہیں کمر میں کرنا  
 ہے، آپ کا ورک ٹائم ابھی سے شروع ہوتا ہے، خواہ  
 مل جائے گی آپ کی باپ کی اوقات سے بڑھ کر۔“

اس طرح بتا رہا تھا کہ جیسے اس نے جاب کے لئے  
 اپلائی کیا ہو۔  
 ”آپ..... آپ ہیں کون کسی جاب میں جاتی

نہیں ہوں آپ کو کور آپ.....“ سمجھتا ہٹ گیا وہ  
 کچھ کہنے سے کامر ہوئی۔  
 ”محترمہ! بہن اور خان جانتے ہیں مجھے میں بھی

انہیں جانتا ہوں، جو اس وقت اپنے کمرے میں بیٹک  
 سوٹ پہنے سو جو ہیں آپ بھی جان جائیں گی، لی  
 احوال اتنی کافی ہے۔“

”میری کمزوری ہیں وہ جانتے ہیں آپ، بھائی  
 بھابھی نہیں ہیں، میں تو ہوں۔“ سنجیدگی سے کہتا ان  
 کے کمرے میں گیا تھا۔ پیچھے ان دونوں نے اس کا  
 ڈکھنوں کیا تھا کہ یہ مشترکہ رکھ تھا۔

”جائیں، جائیں، انھوں نے چارہ ناراض ہو جائیں  
 گے۔“ اس کی دھمکی پر دونوں اٹھ کئے تھے۔  
 ”یار، pizza میں کل خود بنا دوں گا، پر اس،

ابھی ایک گلاس ملک دوئی لے لو میں بھی بھوکا ہوں  
 پلیز۔“  
 ”مگر آپ بھی نہیں گئے“ جائید نے ایک گلاس

اسے بھی دیا تھا۔  
 انزک حسین جو چھین سے دودھ سے الگ تھا کیا  
 کہ شہد جیسا عیضا دودھ آج حے سے لی رہا تھا،

انہیں سلا کر وہ روم میں آیا تو شدید مٹی ہو رہی تھی،  
 بے شکل خندے پانی سے کنٹرول کیا کہ اس کے  
 دوست حادثہ کی کال آگئی۔

☆ ☆ ☆  
 ”بابا! میں جاری ہوں آپ زیادہ دیر بیٹھے نہیں  
 رہے گا، ریٹ کیجئے گا یہ نہیں ہوگی ساتھ ڈز کریں  
 میں بنا چکی ہوں۔“ امیر شہنشاہ نے ان کے سامنے

چائے رکھتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”امیر شہنشاہ کوئی مف جاب مت کرنا ابھی اتنا ہے  
 کہ تمہارا گزرا ہوا جائے۔“ بہن اور خان نے وہیل چیئر

اس کے ساتھ چلائی تھی۔  
 ”مگر کب تک ایک دن تو کرنی ہے ٹاپا!“  
 ”مگر بیٹا تمہاری شادی“۔

”پلیز بابا! وہ نہیں ہوگی آپ جانتے ہیں پہلے تو  
 شاید وہ بھی جانی مگر اب جو حالات ہیں، مگر ایک  
 رشہ ٹوٹ جانا سب سے بڑھ کر میرا اتنی پلیز مجھے دیر

ہو رہی ہے۔“ سختی سے انہیں نوکری دے باہر نکل گئی تھی۔  
 بہن اور خان سوچنے پر مجبور تھے کہ ماں باپ کے  
 مکافات مکمل میں اولاد بھی آجاتی ہے۔

ابو عیسیٰ اس کی "مطلوبات" پر ششدر تھی۔  
 "میں آفرینیں دے رہا تھا مگر نہیں دیکھیں دیکھ نہ جو  
 ممکن ہیں جنہیں یہاں لاسکتا ہے، وہ بہنو او خان تک  
 بھی جاسکتا ہے۔"

اُس کے حریف قریب ہونے پر وہ پیچھے ہٹی تھی۔  
 "اگر آپ کی کوئی دشمنی بابا سے ہے تو مجھ پر اتنا  
 بھروسہ کر کے اپنا گھر اور دو بچوں کو میرے حوالے  
 کیوں کر رہے ہیں۔" اپنے تئیں اُس نے اس کو ڈرایا  
 تھا اور وہ ہنس پڑا تھا۔

"اپنے باپ کی طرح عیار نہیں ہوں تم کسی اور پر  
 بھروسہ کرنے سے بہتر تم ہو کہ تم سر کر بھی گم نہ غلط نہیں  
 کر سکتیں۔ اپنے بابا کے لئے۔ بہت ہوئی تفصیل تم  
 چل رہی ہو میرے ساتھ۔" اسے حکم دیا تھا مگر وہ جگہ  
 سے ہٹ بھی نہیں تھی۔

"میں ڈرتی نہیں ہوں آپ سے پولیس کو انکار  
 کروں گی۔" وہ شدت سے چیخ پڑی تھی۔

"شیور میرا تیل پوڑ کر لو سب کے شہر میں بڑے  
 باپ کی بیٹی ہو، جانتی ہو یہاں کے قانون کو جو صرف  
 اچھے کا ہے، ہو گیا اراہہ اب چلو، اُسے کچھ کہنے کا  
 موقع دینے بغیر ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک لایا تھا، اس  
 قدر تیزی سے آنے پر ابو عیسیٰ کی سانس دھکن کی  
 طرح چل رہی تھی۔ مگر انزک نے دھیان نہیں دیا تھا  
 گھر تک پہنچنے میں ایک بار بھی اُس کی ہتھی آنگھوں کو  
 خاطر میں نہیں لایا تھا۔ گھر میں اسے سلامتی کم گورنس  
 کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ حاضر اور جائیداد  
 نذا ہو گئے تھے اپنی نازک سی آنتی پر بمشکل دن گزار  
 کر رات کو گھر جانے کو تھی کہ لان میں انزک مل گئی۔  
 "مختصر مدد کل صبح 6 بجے گاڑی آپ کو پک کرے گی،  
 دھوکہ دینے کی کوشش شوق سے کرنا مگر پھر اُس کے  
 بعد کسی دھوکے کے لئے کچھ بچے کا نہیں، تہیاز سے  
 پاس آکر لیٹنا۔" اسے وارن کرنا اندر بڑھ گیا تھا۔  
 اور وہ صرف اپنے ناکہ دھمکانا اور بھی نہ بنائے

جانے والے دشمن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔  
 بابا کو اپنی جاب کی طوالت پر بمشکل راضی کیا تھا  
 ان دنوں زندگی بہت کڑی تھی۔ بابا کی بیماری گھر کا  
 کام سر پر مسلطہ شخص، بچوں کے کام اپنے ہاتھ سے  
 کرنے ہوتے تھے، اس سب میں وہ اپنی محنت بھول  
 چکی تھی۔ صد شکر کہ ایجوکیشن کے ساتھ شوق کو تنگ  
 کورس کر لے تھے جو آج کام آ رہے تھے۔ وہ بچوں  
 کے ساتھ بچن میں مصروف تھی۔ انزک اور حادث کو  
 اندر آنا دیکھ کر باہر نکل گئی تھی، وہ ایسے بھی اپنے کام  
 اُس سے نہیں کروا تھا۔

"انکل پلیز!" جائیداد نے معصومیت سے عکس  
 حادث کو آخر کے تھے اس کی ادھر حادث ہنس دیا  
 تھا۔

"انزک بچوں کے لئے تو بہت کینٹرنگ ہے یہ۔"  
 اُس کی بات پر انزک ہنس پڑا تھا۔

"وہ جانتی ہے مگر اُس کی جان اپنے بابا میں ہے،  
 تو میری ان دونوں میں، اس لیے تم مجھ کہتے ہو۔"  
 اُس کی ادھر بھی بات کا مفہوم حادث سمجھ چکا تھا۔

"بیٹا ابو عیسیٰ! طبیعت خراب سے کچھ دنوں کی  
 چھٹی لے لو، بہنو او خان نے اس کے نیلے پڑتے  
 ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ او اُن سر دی کے دان اُسے  
 ہمیشہ بھاری پڑتے تھے۔

"نہیں کر سکتی بابا! کام کالو بہت ہے، ایک بات  
 پوچھوں؟" وہ جاتے جاتے رگ تھی۔

"آخر 2 سال میں اچانک یہ اتنا بڑا بزنس کیسے  
 کر دیا کر گیا، سب ایسے اچانک۔"  
 "کچھ ٹیمبل تعجب بھی کہہ سکتی ہو مکافات مل  
 بھی۔" وہ افسردگی سے بولے تھے۔

"مکافات ملنا مگر ہم نے کسی کے ساتھ برا نہیں  
 کیا پھر۔۔۔"

"تمہیں دیر ہو رہی ہے جاؤ خدا حافظ۔"  
 اسے سختی سے ٹوکتے دیکھ کر بغیر اندر لے گئے تھے



را کر بھٹاتے تو ان کی بیٹی ان سے نفرت کرتی، جو برداشت نہیں کر پاتے۔

آئیں سے ابھی پر لان کا سٹرو کچ کر انزک مسکرا اٹھا تھا، تالو اور دادا جان جیسے کھیل رہے تھے اسی چائیم کا سوئٹرن رہی تھیں، جبکہ دونوں بچے طے کا فیرا پکڑے اور چشیم سے ضد کر رہے تھے کہ اُسے بچہ پر لٹکا دو۔

”انزک! چائے پی لو اور ان کو منع کرو، پتی رگر کرنا نہ جائے۔“ امی نے اس کو چائے دیتے ہوئے کہا تھا۔

”اسنے پیار سے نہ بلایا کریں ہر ماہ بے کرتا ہوں یہ ان کا کام ہے۔“ اُسے نظروں کے حصار میں لے بول رہا تھا۔

”بے کرتے ہو تو خرید تو نہیں لیا ناں انسان ہے وہ بھی، جس انداز میں سوچ رہے ہو آج کل۔“ دادا نے اچھی خاصی جھار پلا دی تھی اور وہ سب اتنی دور نہیں تھے کہ وہ سن نہ رہی ہو، پہلے ہی اسٹولی پر چڑھنے سے ڈر رہی تھی۔ اب تو قفل اس کی معمولی نظروں کے حصار میں بھی ہونے پہ سہاگہ چائم نے شدت جذبات میں آکر اسٹول ہلا دیا تھا، زبردست چچ کے ساتھ نیچے آ رہی تھی، مگر انزک اُسے تمام چکا تھا، اور چشیم کی جان سوکے پتے کی طرح لرز گئی تھی، باقاعدہ اپنا ہاتھ دل پر رکھا تھا، انزک نے اسے کپڑا کر کے ہاتھ چھوڑ دیا تھا، امی کی تو جان نکل گئی تھی اُسے کچھ ہو جانا تو انہوں نے بچوں کو ڈانٹ دیا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے ایک جگہ رکھا تو ہاتھ پہ لٹا مگر سکون نہیں ہے تم دونوں کو۔“

”امی! پکڑا! انزک نے روکا تھا۔

”سوری آئی۔“ دونوں نے کہا تھا۔

”اُنس او کے چٹا اٹھیں ابھی لٹکا دیتی ہوں۔“ وہ پھر سے تیار تھی۔

”رہنے دیجئے محترمہ امی خود کر لوں گا۔“ اس کی

سانسوں کی ہے تپتی اسے رحم دلائی تھی۔

”آف تو یہ! کیا ہو گیا ہے لوگوں کو کس وہوں میں اٹھ رہے ہو گئے ہیں اتنا قریب کسی کا مجھ سے۔“ انہیں ہے۔“ مانو نے ابرو چشیم سے اظہار خیال کیا تھا۔ باہر بارش کے باعث سب لاؤنج میں موجود تھے۔

”جی! ٹھیک کہا آپ نے اُسے اتنا مختصر سا جواب۔“ انزک نے اس کے جی کہنے پر طنز یہ کہا تھا۔

”حالانکہ آپ کو تو مفصل جواب دینا چاہیے، دھوکہ دینے والوں پر آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے، اور پھر جس کا باپ خود دھوکا اور قریب۔۔۔۔۔“

”خبردار۔۔۔۔۔“ اور چشیم کی برداشت جواب دے مچ گئی تھی۔

”خبردار اگر میرے بابا کو کچھ کہا، میں نے بہت سن لیا اب نہیں دھوکے۔۔۔۔۔ باز میرے بابا نہیں آپ ہیں۔“

او گئی آواز میں بولنے کے باعث اس کی سانس اکڑ چکی تھی۔

”جسٹ شٹ اپ تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔“ انزک جارحانہ انداز میں آگے بڑھا تھا۔

مگر دادا جان نے اسے سچ میں روک لیا تھا۔

”کیا بد فیئر ہے انزک! کسی عورت سے اس طرح بات کی جاتی ہے شرم آتی جا چکے تمہیں، اور وہ بیٹی جو دن رات ہماری خدمت کر رہی ہے، یہ تربیت تو نہیں کی میں نے۔“

دادا جان اور امی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور وہ اُسے سننے سے پہلے ہی باہر لان میں نکل چکی تھی۔

”مجھے یاد ہے سب کچھ، وہ بھی جو آپ نے سکھایا وہ بھی جو اُس کے باپ نے کیا ہے۔“ لیمو پکائی نظروں سے اُس نے دروازے کو کھولا تھا، جیسے وہ ابھی بھی وہاں موجود ہو۔

”کیا کیا ہے اُس کے باپ نے، کیا کھ رہے ہو تم؟“ مانو نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”کیا بیماری ہے اسے؟“ انزک نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”یہ آپ کے گھر میں ہیں اور آپ کو نہیں پتا، یہ ہارٹ وائلٹ ہیں، ان کے دل کا دلو بند ہے۔“ ان کی بات پر انزک کے قدموں سے زمین ٹھل گئی تھی۔

”آپ یہ جانتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“

”میں بہادر خان کا میڈیکل ڈاکٹر بھی ہوں، کافی عرصے سے ان کا کنسلٹنٹ ہوں، وہ تو ایریٹھیم کو زیادہ چلنے بھی نہیں دیتے، بہر حال آپ لوگ احتیاط کریں، میں میڈیسن لکھ دیتا ہوں شام تک مجھے انفارم کر دیتے گا۔“

ای باقاعدہ رو رہی تھیں۔

”انزک! کیوں کیا تم نے ایک معصوم کے ساتھ آخر یہ سب کیا ہے بھڑا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔“ اُسی اثناء میں ایریٹھیم نے سسکاری بھری تھی۔

”ایریٹھیم جیٹا! آپ کہیں کھلو، اب کسی ہو تم؟“ اُسی نے اس کا ہاتھ مارتا تھا۔

ایریٹھیم کی نظر انزک پر پڑی تھی، فوراً ہی اٹھ کر چادر ہٹا کر دوپٹہ درست کیا اور باہر جانے کو کھڑی ہو گئی تھی۔

”جیٹا! بھدو دیر آرام کر لو، میں خود جیسے چھوڑ آؤں گا۔“ دادا جان نے اُسے روکنا تھا۔

”نہیں بابا! میرا ڈیٹ کر رہے ہوں گے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں جا سکتی ہوں۔“ اُس کے رو رہے چھٹا ہوا سوال کیا تھا، جو اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا، جس کی سانس ابھی تک ناہموار تھیں، تو بصورت ہونٹ سخت نیچے تھے، ان پر موجود کل بھی آج افسردہ تھا۔

”پلو، تم سب ساتھ چلتے ہیں، تاکہ تمہارے بابا کی تکلیف اور ہمارے دکھ تمہاری ابھمن ختم ہو سکے۔“ مانو نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا جلدی میں اُسی نے

”یہ بہادر خان کی بیٹی ہے جانتے ہیں نا آپ کیسے بھول سکتے ہیں ہم سب اسے۔“

”تم جانتے ہو پھر بھی اُس لڑکی کو چاہم اور چاہیے کی ذمہ داری دی، کیا سوچ کے؟“ دادا جان نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی بہت کچھ دھندلا ہے، اس کے سامنے، منہ میں نے کچھ بتایا ہے اور اس کا باپ تو مر کر بھی نہیں جتا سکتا۔“ اُس کے جواب پر اُسی بڑبڑا گئی تھیں۔

”انزک! پھر ایریٹھیم کا کیا قصور ہے، وہ معصوم سزا کیوں بھگت رہی ہے؟“

”ای قصور تو کسی کا بھی نہیں ہے، مگر پھر بھی گھر سے تمنا جتناڑے میں نے اٹھائے ہیں، پلیز یہ سب میرا ہیڈک ہے۔“ ان سب کو خاموش کر داتا وہ باہر نکل گیا، ارادہ باہر جانے کا تھا، مگر لان میں آکر ٹھٹھک گیا تھا۔ شدید بارش میں ایریٹھیم کی گھاس پر بے سدھ پڑی تھی، وہ نا چاہتے ہوئے بھی اُس تک آیا تھا، قریب آکر اُس کے ٹھنڈے وجود اور نیچے ہونٹوں نے اسے ڈرایا تھا۔ فوراً اٹھا کر اندر لایا تھا اور اپنے ٹیلی ڈاکٹر کو کال کیا تھا۔

”اسے کچھ ہوا تو تم ذمہ دار ہوں گے۔“ اُسی نے وارن کیا تھا۔

”اوہ پلیز کچھ نہیں ہو گا یہ دتوٹ لڑکی سردی کی بارش میں بیگ رہی تھی۔“ اُس کی حالت دیکھ کر پریشانی میں اچھا خاصا لہجہ اُٹھ گیا تھا۔ اُسے اٹھا کر لائے میں اس کے اپنے کپڑے بھی بیگ چکے تھے۔

”مسٹر انزک! اپنی لاپرواہی انہیں شدید ایکسپوز کر دیا، ان کی ہارٹ بیٹ بند ہو سکتی تھی، ان کے لیے تو مگر می کی بارش نقصان دہ ہے کجا یہ سردی تو ان کی جان لے سکتی تھی۔“ ڈاکٹر کی بات پر وہ سب

کے بزنس کو منجھلا اور میرے بابا کو برباد کر دیا۔  
میرے باپ کے دیوالیہ ہونے کی خبر میری شادی  
سے تین دن پہلے آپ نے میرے سر پر پھینکی۔  
میری شادی ختم میں مایوس کے زور دھوٹ میں بابا کے  
ساتھ ہاسٹل میں گئی، بابا میرا لاٹروڈ ہو گئے اور پھر  
میرے ساتھ جو کچھ کیا آپ نے پھر بھی آپ۔۔۔“  
”وہ صوفے پر ڈھکی گئی تھی۔“

”انزک! انتقام میں اندھا نہیں ہونا چاہیے۔“  
”ٹانوں نے اسے تمام کر کہا تھا۔“  
”انزک میں تم سے اور آپ سب سے ہاتھ جوڑ  
کر صافیاں مانگتا ہوں۔“

”ہم کون ہوتے ہیں مزارینے والے یہ اللہ کا کام  
ہے ہم نے معاف کیا اللہ بھی کرے گا۔“ دادا جان  
نے ان کے ہاتھ تمام لیے تھے کچھ ہی دیر میں بہنو  
خان اور دادا جان کا اعلان ان دونوں کو ہلا گیا تھا۔  
”پلیز یہ نہ کریں میرے ساتھ دادا جان  
پلیز۔“ انزک سے پہلے ایئر چینم بول اٹھی تھی۔  
”اے! کیا تماری اتنی بھی عزت نہیں ہے کہ جو  
فیصلہ تم نے پوچھے بغیر لیا اس کا مان نہ رکھ لو۔“

بہنو خان کی جگہ دادا جان نے اسے سنایا تھا کہ  
خدا تھا باپ بیٹی کے تسویرداشت نہیں کر پائے گا۔  
ٹانوں نے انزک کو کندھوں سے قہقہا تھا۔

”ٹانو پلیز! اس کا لہجہ بہت بے بس تھا۔“  
”انزک کیا عادت کرنا چاہتے ہو خود دیکھو، ہمارا  
کوئی حق نہیں تم پر تو ٹھیک ہے ہم دست بردار ہوتے  
ہیں۔“

دادا جان اور امی کی بلیک سیلنگ میں آ گیا تھا۔  
☆.....☆.....☆

ایک ہفتے بعد وہ انزک کے بیڈروم میں موجود تھی،  
نروس کہہ رہا تھا عجیب بے بسی کی حالت تھی اس کا  
انتظار کے بغیر چھٹ کر چکی تھی، امی نے لان میں اپنے

اُسے انزک کی مثال ہی دے رکھی تھی، جسے... پہچان  
کھا تھا مگر بولا کیے نہیں کہ ابھی کچھ عید نہ تھی، سخت  
سر دی میں اتار دے۔  
ایئر چینم کو عجیب لگا تھا جانے کیوں مسکرا رہے ہیں  
سب کچھ کر کے بھی؟ دادا جان ڈانٹ کر انزک کو اندر  
لے آئے تھے۔ مجبوراً وہ آیا تھا بہنو خان ڈر گئے تھے،  
ایئر چینم کی حالت دیکھ کر۔

”عظیم صاحب آپ یہاں کیسے؟“  
حیرت کا قہقہہ تو تھا دادا جان اور ٹانوں نے ہنسنے لگے  
ایئر چینم کی جانب اور انزک کے رونے کا پتا دیا تھا۔  
”بابا! آپ بتائیے اپنا وہ گناہ جس کی لپیٹ  
میں میں بھی آگئی۔“

”بیٹا! انزک کے بڑے بھائی اتران میرے  
بزنس پارٹنر تھے، میں نے انہیں دھوکا دیا اور وہ اپنے  
تھلے اور سادہ تھے کہ مجھے سخت نہ کرنی پڑی، ان کا  
بزنس تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اسی ڈپریشن میں ایک  
ایکسپرنٹ میں وہ انتقال کر گئے، بخدا میں ایسا نہیں  
چاہتا تھا مجھے بعد میں افسوس ہوا مگر۔۔۔“

”مگر آپ کے افسوس سے ہمارا نقصان پورا نہیں  
ہوتا بہنو خان! کیونکہ اس گاڑی میں میری بھابی  
بھی موجود تھیں، اس صدمے سے بابا ہمیں چھوڑ گئے  
، ہم تو پھر بھی جی نہیں کے مگر ان دو معصوم بچوں کا کیا  
کریں، جو بے تمنا تھیں ان کے باوجود دن یارات  
کے کسی بھی پہر اپنے ماں باپ کو ڈھونڈتے ہیں، اس  
سب کے ذمہ دار آپ ہیں، میں آپ کو قطعاً معاف  
نہیں کروں گا۔“

سرخ چہرے کے ساتھ بہنو خان کے ساتھ وہ  
ایئر چینم کو امی وارن کر رہا تھا۔

”جواب میں تم بھی بہت کچھ کر چکے ہو انزک!“  
”میں نے کیا کیا ہے امی؟“ خصوصیت کی انتہا  
کی۔

”ہاں آپ نے ابھی کیا کیا ہے، بس اپنے بھائی

ہندس ڈشنگ بیٹے کو دیکھا تھا، جو خفا خفا بہت پیارا لگ رہا تھا۔

”میری جان! ازان کے بعد میرا ٹیبل سر باہر تم ہو، جو کچھ ہوا بھول جاؤ، اب بہت مصوم بے قصور ہے۔“ اس کا چہرہ انہوں میں بھرا تھا۔  
”وہ بہتر ادھان کی بیٹی ہے۔“

”تم میرے بیٹے ہو میں یہ جانتی ہوں، تم دیے بھی اس کا بہت نقصان کر چکے ہو، وہ خطرناک بیماری میں ”سُور“ کر رہی ہے۔ اس کا خیال کرنا، میرا بیٹا نفرت نہیں محبتوں سے بنا ہے اسے محبت دو، وہ غصے میں ہے حق پر بھی ہے، نادان مگر پیچھے رہے کبھی دیکھا ہے بھولی سی صورت ہے۔“

”اچھا امی! بس کچھ نہیں کر رہا آپ کی بھولی مصوم بچی کو آپ آرام کریں، اب میں جیکس ہو رہا ہوں۔“ وہ ہلکے سے ہنس دیا تھا۔

”ابڑہ عظیم“ وہ جو موبائل سرچ کر رہی تھی، پہلے ہی اس کے سامنے پھٹنے سے نروس تھی اب محترمہ یا طر کے بغیر نام من کے عجیب سی ہو گئی تھی۔

”ہم سب کچھ بھلا کر ایک نیا سفر شروع کر سکتے ہیں کیا خیال ہے؟“ نرمی سے اسے اختیار دیا تھا۔

”کچھ شروع نہیں ہوا اب کیا وجہ سے سب کیا ہے میں نے، پہلے آپ سے اپنا بزنس واہیل لوں گی، جس کے لیے بینک سے لون بھی آپ اپروڈ کروائیں گے، میں آپ کا قرضہ واہیل کر دوں گی تب ہی کچھ ہو سکتا ہے۔“

وہ حیرت سے اُسے سن رہا تھا، دنیا کا آسٹرواں عجوبہ شادی کی پہلی رات بزنس ڈیل کر رہی تھی۔

”اگر میں ایسا کچھ نہ کروں تو۔“ انزک کی توری چڑھ گئی تھی۔

”تو ایک کمرے میں رہے ہوئے بھی آپ کبھی مجھے حاصل نہیں کر سکیں گے۔“ اسے جتنی اسٹڈی روم میں چلی گئی تھی، کچھ دیک نہ کوہلا رہا مگر مگر

ہنس پڑا۔  
”امی ٹھیک کہتی ہیں مصوم تو ہو اور عقل سے پیدل بھی۔“

کچھ ماہ گزرے کراچی نے ٹوک دیا ”انزک آج اب کو باہر لے جاؤ کہیں نہیں جاتے تم لوگ۔“  
”میں تو کہتا ہوں آپ کی بہو نہیں جاتی۔“ حرے سے اُسے تپایا تھا۔

”اب فوراً اٹھو تیار ہو جا کر“ امی اچھی طرح سب سمجھ رہی تھیں۔

”جائیں اور جائیداد کو بھی تیار کر لوں؟“ اس نے مصومیت سے کہا تھا۔

”زیادہ چالاک مت بنو اب“ امی نے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔

سب کے سامنے اس کی سرزنش انزک کا ڈیروں خون بڑھا گئی تھی۔ سلیپے سے سر پر دوپٹہ اوڑھے ڈریسنگ سے اُٹھی تھی کہ انزک پیچھے آکھڑا ہوا تھا، اس کا اس قدر قریب ہونا ابڑہ عظیم کو ڈرا گیا تھا، ایک ہاتھ سے اس کا راست بند کر کے دوسرے سے پر فحوم اٹھایا تھا، وہ مکمل اس کے حصار میں

بکھل اپنا آپ سنبھال رہی تھی، اس کی حالت کو انجوائے کرتا اپنے ساتھ اُس پر بھی اُسپر کیا تھا اور اُسے بغور دیکھا تھا، جس کی پلکس لرز رہی تھیں، ہلکے سے ہنس کر ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ ابڑہ عظیم میں جیسے جان آگئی تھی

سر پیٹ باہر نکلی تھی۔ مگر انزک کی حرکت اسے ہماری بڑی تھی اور وہ طبیعت کی خرابی کا پیمانہ کر کے باہر نہ گئی تھی اور وہ صرف لان میں بیٹھ کر ہنستا رہا تھا۔

جانی سردی اپنا اثر دکھائی گئی اُس کے لیے سب پریشان تھے۔

”جینی! آئی پراس میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا، جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ اُن دونوں کی تو جان

نمی اپنی چچی میں۔

”نہیں ہوں میں دھوکہ باز نفرت ہے مجھے اس لفظ سے، آپ خود کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں، لگتا ہے محبت صرف آپ کر سکتے ہیں میں نہیں آخر کیوں میں نے بھی کی ہے محبت انزک“ بے اختیار آنسوؤں کے ساتھ چہرہ ہاتھوں میں چپائے اس کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

انزک کے لیے اس کا اظہار ہی آپ حیات تھا، کجا کراس کے آنسو چھلکے سے اُسے سانسے کیا تھا۔  
 ”کس سے کی ہے مجھے بھی بتاؤ“ انتہائی سنجیدگی سے پوچھا تھا، نگاہوں کی شوخی ابرو پر عظیم کو پزل کر چکی تھی۔  
 ”تجربہ مت کریں مجھے۔“

”کیوں نہ کروں حق رکھتا ہوں اور ابھی کچھ کیا ہی نہیں ہے۔“ آنکھوں میں جھانکتا بہت ٹھٹھاٹھ نام دے رہا تھا۔  
 ”میں جلی عی جاتی ہوں بابا کے پاس۔“ وہ گھبرا گئی تھی۔

”خبردار، خبردار تم میری ذمہ داری ہو، ذرا ٹھیک ہو جاؤ، بہت سے بدلے لینے ہیں۔“  
 ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد کامیاب آپریشن کروا کے گھر آگئی تھی وہ۔

”محترمہ! بہت آرام کر لیا اب اٹھ جائیں۔“  
 انزک نے اس کے بیداریسٹ پر چوٹ کی تھی۔  
 ”امی! ادیکھیں۔“

”کیا دیکھیں میری امی ہیں محترمہ۔“  
 ”مت تنگ کرو انزک! میں سوپ بھیج رہی ہوں اس کے لیے ابھی۔“ اُسے ڈانٹتے ہوئے ہر گھل گئی تھیں۔  
 ”میں تو پہلے کچھ کرتا بھی نہیں تھا صرف کہتا تھا، تو تم بھاگ جاتی تھیں اب کیا ہوگا تمہارا میرے قبضے میں ہو۔“ اس کے قریب بیٹھ کر اس کو ڈرایا تھا، اُس کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں کبل سر سے پاؤں تک تان لیا تھا، اُس کی حرکت پر انزک قبضہ نہ روک سکا تھا۔

”ٹھیک ہوں میری جان! آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے تسلی دی تھی۔

”ڈاکٹر شاہ سے میری تفسیل بات ہو چکی ہے جلد از جلد آپریشن ہونا ہے۔“ انزک نے امی کو بتایا تھا۔  
 ”نہیں میں نے پہلے بھی کہا تھا میں خود.....“  
 (شٹ اپ) انزک نے خاموش کروا دیا تھا، جسے ضد تھی کہ انزک کا احسان نہیں لینا۔

”اپنا علاج خود کروانا ہے بہت سہولت ہے تمہاری بکواس، امی! آپ اسے سمجھا دیں کل تک، ورنہ آپ مجھے جانتی ہیں۔“ غصے سے دروازہ بند کر کے نکل گیا تھا۔  
 رات گئے گئے کمرے میں آیا تھا اور اُس کی فرمائش بے یقینی سے سن رہا تھا۔  
 ”کیا کہا تم نے؟“

”میں نے کہا آپ مجھے چھوڑ دیں، میں نے بابا کا بزنس کافی حد تک سنبھال کر لیا ہے، اب کوئی وجہ نہیں ہے آپ کے ساتھ رہنے کی ایک انتقام آپ نے لیا، یہ میرا انتقام ہے میں بابا کے پاس جا رہی ہوں۔“  
 چند قدم اٹھے بڑھی گئی کہ انزک نے پیچ کر بیڈ پر بٹھایا تھا، بیڈ کراؤن پر ہاتھ رکھ کر اسے مجبور کر دیا تھا۔  
 بہت مشکل تھا اُس کی لہو چھلکانی آنکھوں میں دیکھنا۔  
 ”کیا ہو تم تین مہینے میں بزنس مل گیا تو تمہارا کمال ہے، میں خود اپنے کنٹرول دے دیے ہیں تمہیں ورنہ پوچھتا اپنے باپ سے کتنا مشکل ہے، ابھی میں نے کچھ کیا ہی کہا تھا وہ تو شروعات تھی جہاں میں رک گیا اور تم کس خوش فہمی میں ہو، بڑا زخم ہے اپنی ذہانت پر چاہتا تو کیا نہیں کر سکتا تھا تمہارے ساتھ، ایک جھٹکے میں کل سپیدی کر سکتا ہوں میری دسترس میں ہو، میری ملکیت ہو، اگر جانا ہے تو جاؤ ارے تمہاری سرشت میں دھوکا ہے، کہ محبت کرنا جانتی ہی نہیں ہو ڈیم اٹ۔“

اپنا غصہ سائیڈ ٹیبل پر اتارا تھا وہ جو پہلے ہی حقیقت حیثیت اپنی ناکام کوششیں جان کر سکتے ہیں تھی جہنا کے کی آواز پر دھل گئی تھی۔



مریم ماہ میر

افسانہ

## پوشیدہ صدیقہ

وہ کھری نیند میں تھی کہ موبائل پر بیل سے اس کے  
سوچے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے کروٹ بدلی اور  
سر ہانے کی دوسری جانب پڑے موبائل پر اندازے  
سے بند آنکھوں سے ہاتھ مارا۔ اگلے ہی لمحے موبائل





نے کبھی ایسے ضد نہیں باندمی۔“ فراز کے ساتھ بحث نے اس کی پگلوں سے نیند بھگادی تھی۔

”اچھا ہے تمہارا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔“

”میرا موڈ ابھی بھی اچھا ہے۔“

”اور زیادہ اچھا ہو جائے گا۔“

”اب میں تنگ ہو رہی ہوں۔“ فراز کو بحث کے

موڈ میں دیکھ کر وہ جھنجھلائی۔

”میں خود ہی تنگ کر رہا ہوں۔“ دہندو جواب آیا

تھا اور ساتھ میں فراز کی خوشگوار سی ہنسی اس کے کان کے پردے سے ٹکرائی تھی۔ جواب میں وہ خاموش رہی۔

”اچھا جلدی سے اٹھو، تیار ہو بس میں پہنچ ہی رہا ہوں۔“

”ہوں۔“

”اب اٹھ بھی جاؤ۔“

”اٹھ تو گئی ہوں اور کیسے اٹھوں؟“

”ابھی کہاں ہیں آپ؟“

”دوبارہ کے ساڑھے تین ہو رہے ہیں ظاہر ہے

اس وقت آفس میں ہوں گا۔“

”ابھی ساڑھے تین ہی ہوئے ہیں۔“ یہ کہنے کے

ساتھ ہی اس کی بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر بڑی کلاک پر نظر

گئی۔ ساڑھے بارہ کے قریب وہ بچن سے نکلی تھی۔

کام والی ماسی سے اس نے بچن کے Cabinet کی

صفائی کروائی تھی اس لیے وہ خاصی تھک گئی تھی، ماسی کو

بھیج کر وہ کمرے میں آکر جھکن اتارنے کی غرض سے

بیڈ پر لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی جواب فراز کی فون کال

سے ٹپکی تھی۔

”اچھا میں اب فون رکھتا ہوں۔ آفس کا کام بھی

ختم کرنا ہے، پھر گھر آ کر بات کرتا ہوں؟“

”جی اوکے۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔

وہ بیڈ پر لیٹا کر بیٹھ گئی۔

فراز کے قریبی دوست ثاقب کی شادی تھی۔

اس کے ہاتھ میں تھا۔

بشکل نیند سے بوجھل پلکیں کھولیں۔ اُدھ کھلی

آنکھوں سے اس نے موبائل اسکرین پر نظر ڈالی۔

روشن اسکرین پر فراز Calling لکھا آ رہا تھا۔

Yes کاٹن دباتے ہی اس نے موبائل کان سے

لگایا۔

”ہوں۔“

”سورہی ہو۔“

”نہیں..... سورہی تھی۔“ ابھی ابھی ہی آواز میں دوہولی۔

اس کی بات کے جواب میں اسے ہلکے سے ہنسنے کی

آواز سنائی دی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ نیند سے بوجھل آواز میں اس

نے پوچھا۔

”تھک ہوں۔“

”خیریت ہے..... فون کیا آپ نے؟“

”ہوں، کیا تو خیریت سے ہی تھا۔ بلکہ as a

reminder تمہیں کال کی ہے۔“

”reminder؟“ ابھی اس کے حواس گہری

نیند سے پوری طرح نہیں جاگے تھے اس کے باوجود وہ

چوکی۔

”فائرہ بھول گئی نا؟“

”کیا؟“ اس نے حواسوں پر زور دیا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم بھول جاؤ گی۔“

”او..... ہاں وہ بس بھولی نہیں تھی لیکن آنکھ لگ گئی

تھی۔“ ذہن پر زور دیتے اسے یاد آئی گیا۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ میں ایک گھنٹے میں آ رہا

ہوں۔“

”پلیز فراز! آپ ہی چلے جائیں نا۔“

”یار! میرے دوست کی شادی ہے اور تمہیں اس

نے Specially انوایٹ کیا ہے۔“

”اور دوستوں کی بھی شادیاں ہوتی ہیں لیکن آپ

کندھے پر شرٹ سے پن اپ کیا۔ ابھی وہ مڑنے ہی لگی تھی کہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر فراز کمرے میں داخل ہوا۔ شے میں فراز کا سراپا دیکھ کر وہ مسکرائی تھی اور پلٹ کر بولی۔

”کیسے ہیں؟ میں آپ ہی کا ویت کر رہی تھی۔“  
جواب میں فراز خاموش نظروں سے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھا رہا۔

اس کی نظروں میں اپنے لیے سٹائش پا کردہ پلکیں جھکا گئی اور تیزی سے اپنی جگہ سے مڑی۔

اس کا گریز سمجھ کر فراز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اور وہ شرارتی انداز میں اس پر نگاہ ڈال کر دوش روٹھ میں گھستے ہوئے بولا۔

”ابھی جانے کی جلدی نہ ہوتی تو کچھ تفصیل سے باتیں ہوتیں۔“ انداز میں دالہا نہ پن تھا۔

”اچھی بات ہے۔ میں ہال میں آپ کا ویت کر رہی ہوں جلدی آجائیے گا۔“ دوبارہ شرارتی انداز میں فراز نے جواب دیا۔

”جلدی کیوں بھی میں تو آرام سے آؤں گا۔ ویسے بھی ابھی کہاں ناٹم ہوا ہے۔“

”جلدی جائیں گے تو وہاں بھی جلدی آئیں گے۔“

”خدا کا نام ہے فراز! ابھی گئے بھی نہیں اور تمہیں واپس آنے کی جلدی ہے۔“

”آپ کو پتہ تو ہے میرا۔“

”ہوں جانا ہوں تمہیں، کتنی آدم بیزار ہو۔“  
”آدم بیزار.....؟“ وہ حلفی سے زیر لب مسکرائی تھی اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ دھرے بلکے سے باہر دروازہ کھولا۔

”آجائیے گا جلدی۔“  
”ہوں اچھا۔“

اس کا جواب سننے ہی وہ دروازہ بند کیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہی وہ دونوں

ٹاقب کا گھر آنا جانا تھا۔ اس لحاظ سے اس کی فائزہ سے بھی اچھی خاصی سلام دعا بھی۔ سچی جب ٹاقب کی شادی کا ذکر آیا تو بطور خاص اس نے فائزہ کو بھی اپنی شادی کی تیاریوں میں شامل کیا۔

فراز کو اچھی طرح سے فائزہ کی فطرت کا علم تھا کہ وہ زیادہ gathering میں جانا avoid کرتی ہے اس لیے اس نے بھی اسے فنکشن پر جانے پر اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس مرتبہ فائزہ کے بقول وہ خند پر اتر آیا تھا کہ ٹاقب کی شادی کے تمام فنکشنز اینڈ کرنے ہیں۔

خود فائزہ کی فراز سے شادی ایک اتفاق تھی۔ وہ مقامی کالج میں اردو کی لیکچرار تھی کہ اسے سال بعد ہی اس جاب سے ریزائن کرنا پڑا۔

ان دنوں اسے جاب کی ضرورت تھی تو وقتی طور پر اسے ایک آفس میں اسٹنٹ سیکریٹری کی جاب کی آفر آئی تو اس نے قبول کر لی۔ وہیں پر اس کی ملاقات فراز سے ہوئی جو پہلی کے مالک کا بیٹا اور سیکریٹری کے طور پر کام کر رہا تھا۔ کچھ ہی ماہ بعد آغاز صاحب جو فراز کے والد تھے انہوں نے اس کے سامنے فراز کا پروفائل رکھا۔ فائزہ نے سب کچھ اپنے والدین پر چھوڑ دیا اور مزید چند ماہ بعد وہ فراز کی بیوی کی حیثیت سے آغاز صاحب کے گھر ان کی بہو بن کر چلی آئی۔

☆.....☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی کہ اسے مین گیٹ کھلنے اور گاڑی گیراج میں داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے ہارن کی آواز سنائی گویا فراز اسے اپنے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ فائزہ نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ آئینے میں ایک نظر اپنے سراپے پر ڈالی اور دائیں کندھے پر جھولتے کاندانی دوپٹے کو دونوں ہاتھوں سے ٹھیک سے

”فائزہ!“ اسے کسی کی پکار اپنے کان میں سنائی دی۔

اپنی دائیں جانب مڑ کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے دائیں جانب کھڑے وجود پر اس کی نگاہیں انکس گئیں۔

”فائزہ..... ایکسی ہو؟“

جواب میں وہ ساکت تھی۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر کرتی سوچیں اور تصور لیے وہ اس وجود پر نگاہیں ٹکائے ہوئے تھی۔ زندگی میں وہ پانچ سال پہلے اپنے سامنے کھڑے وجود سے ملی تھی۔ پانچ سال کا سفر دونوں نے ہی طے کیا تھا لیکن اس کے سامنے کھڑے وجود کے چہرے پر اداسی اور غم کی پرچھائیاں تھیں تو اس کے چہرے پر خوش حالی کا ڈیرا۔ جھریوں نے ”دونوں کے چہروں پر اثرات چھوڑے تھے لیکن سامنے کھڑے وجود کے چہرے پر اداسی کی جھریاں تھیں تو اس کے چہرے پر ہنسنے ہوئے لکیروں نے ڈیرا جلیا تھا۔

”میں حنا ہوں..... پچھتاؤ؟“

شاید اس کی اسی کھٹکھٹ کا اندازہ لگاتے ہوئے سامنے کھڑے وجود نے کہا تھا۔

”حنا انوار تمہارے ساتھ سینئر لیکچرار۔“

”ہوں..... یاد ہے سب کچھ بھی تو نہیں بھولی۔“

ذرا لب کہتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیسی گزر رہی ہے؟“ کرسی اٹھا کر اس نے اس کی کرسی کے سامنے کچھ فاصلے پر دھری۔

”شکر ہے بالک کا۔“

”پوچھو گی نہیں میرے بارے میں؟“ کرسی پر بیٹھے ہوئے قدرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بجائے حنا انوار بولی۔

”کیا پوچھوں؟“

”کچھ بھی۔“

حنا انوار نے اپنے طور پر اسے کھلی اجازت دی۔

ثاقب کے گھر موجود تھے۔ گھر کے مین پلاٹ میں سینکڑی اربنچ منٹ کیا گیا تھا جہاں سب مہمانوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار تھا کہ بارات چل پڑتی۔ فراز، ثاقب کے ساتھ موجود تھا۔ وہ آہستہ قدم اٹھاتی پلاٹ میں دھری کرسیوں کی جانب چلی آئی جہاں مہمان خواتین کے بیٹھنے کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں ہی بارات چلنے کو تیار تھی۔ وہ بھی فراز کی جانب چلی آئی۔ فراز نے اسے اپنی جانب آتے دیکھا اور پھر اس کے قریب آنے پر بولا۔

”جلیں ہم بھی۔“

”جی۔“ اس نے کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دونوں ساتھ قدم اٹھاتے پارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی کی جانب چلے آئے۔

”سب ٹھیک رہا؟“

ہوں..... جی۔“ فرنت اسکرین سے باہر کے منظر پر نگاہ جماتے فائزہ نے جواب دیا۔

”اور مہمانوں سے ملیں؟“ فراز نے گاڑی

دوسرے کیمز میں ڈالی۔

”کوئی خاص نہیں۔“ فائزہ کا لہجہ سرسری سا تھا۔

جواب میں وہ بھی خاموش ہو گیا۔

ثاقب کا رشتہ اپنی ماسوں زاد کے ساتھ ہو رہا تھا۔

لڑکی والوں کا گھر گاڑی سے تقریباً پندرہ منٹ کی

ڈرائیو پر تھا۔

رسم و رواج کے مطابق لڑکی والوں نے بارات کا

بہت ہی خوش اسلوبی سے استقبال کیا۔ نکاح کے بعد

کھانے کا انتظام بھی گھر کے لان میں ہی کیا گیا تھا۔

اس کا زیادہ کھانے کو کس نہیں تھا۔ دوپہر میں بھی خاصا

پینٹ بھر کے کھایا تھا ابھی تک وہی ٹھیک طرح سے ہضم

نہیں ہو پایا۔ ہلکا سا سلا دلینے کے بعد وہ کولڈ ڈرنک

لیے واپس اپنی جگہ پر آگئی اور کولڈ ڈرنک کے ٹکے

سپ لینے کے ساتھ ساتھ وہ ارد گرد آئے مہمانوں کو

دیکھنے لگی۔



”تم خودی بتا دو۔“ سرسری سے انداز میں فائزہ بولی۔

”میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا۔ موبائل نمبر تو تم نے شاید بدل دیا تھا۔ کالج سے ریڑائن کرنے کے بعد۔“

”ریڑائن میں نے نہیں کیا۔ مجھ سے لیا گیا تھا۔“ اس مرتبہ فائزہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہم نے غلط کیا تھا۔“

”اب کیا فائدہ؟“

”میں نے تمہارے گھر بھی کال کی تھی لیکن پی ٹی وی ایل تو بند چارہا تھا۔“

”ہوں آج کل سب کے پاس موبائل ہوتے ہیں۔“

”مجھے تم سے معافی مانگنا تھی۔“

”کس لیے؟“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے پھسلا، لہجہ میں ہلکے سے طنز کی آمیزش تھی۔ جسے اس کے سامنے بیٹھے وجود نے محسوس کیا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم دل سے بے وفاء ہو۔“

”میں نے کب کہا ایسا۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں تم نے کس اذیت سے وہ وقت کاٹا، آسان نہیں ہوتا یہ سب تم نہیں سمجھ سکتیں وہ اذیت وہ کرب۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں فائزہ تم سے ریڑائن لینے کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر میری جاب بھی Terminate کر دی گئی۔“

جواب میں بے ساختہ ہی اس نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے پر ڈالی۔

”میں نے تم سے تمہاری جاب چھینی تھی، خدا نے مجھے میرے غرور پر جاب ختم کر ددی۔ کافی عرصے بعد میں نے سنا تھا کہ تم نے کسی انٹرنیشنل کمپنی کو کمپیوٹر مگرافکس کے طور پر سنبھال لیا ہے اور پھر کچھ ہی

عرصے بعد تمہاری شادی کی خبر سنی تھی۔“

”تمہاری جاب؟“ وہ کچھ حیرانگی سے بولی۔

”ہاں میں نے غرور کیا تھا تو سزا تو ملنی تھی۔“

”اچھا ہوا کہ تم پہلے چلی گئیں۔ میرے ساتھ رہیں تو جاب ٹریٹ ہوئی بہت عرصے تک مجھے پھر جاب نہیں ملی، اسی ٹریٹیشن لیٹر کی وجہ سے پھر ایک پرائیویٹ کالج نے جاب دیا۔ جو تیرے ٹیچر۔“

فائزہ نے اس سے نہیں پوچھا تھا لیکن وہ خود ہی بول رہی تھی۔

”میں تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ تمہاری اہلیت سے جمل گئی تھی۔ کبھی تمہی کہ تم میرے ساتھ کام

کردگی تو کہیں میری برابری پر جاب نہ چھین لو۔“

”تمہیں راستے سے ہٹانا چاہا لیکن خدا نے تمہارے لیے کامیابی کا راستہ الگ رکھا تھا۔ اس نے تمہیں میرے ویسے سے راستے پر ڈال دیا اور میں وہیں ٹھکرت کھا گئی۔“ فائزہ نے بے ساختہ ہی نظر اٹھا کر اس کے پڑمردہ چہرے پر ڈالی۔

”ہوں میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اسٹوڈنٹس میں زیادہ پاپولر ہو، اسٹوڈنٹس تم سے پڑھنے پر خوش رہتے تھے جو مجھے برداشت نہیں تھا۔“

فائزہ ہنوز اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظرسے بجائے تھی جہاں بچھتاوا تھا۔ زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آیا تھا کہ وہ سوچتی تھی کہ اگر کبھی حنا انوار اس کی نظروں کے سامنے آئی تو وہ اسے کھری کھری سناٹے کی۔ نفرت سے اس کے منہ پر تھوکر کی لیکن زندگی میں قسمت نے جب اس کے جیسے میں یہ پل ڈالے تو وہ کچھ بھی اسے ملامت نہ کر سکی۔ اپنے ساتھ کی زبردانی اسے یاد نہ دلا سکی جیت کے نشے میں دھت خود قسمت کے ہاتھوں ٹھکست حنا انوار کے جیسے میں آئی تھی تو وہ اسے کس ہار کا احساس دلاتی کہ اسے خود ہی اپنی ہار کا اعتراف تھا۔ جو لحاظ

تمہاری باتیں سن کر وہ شکوہ بھی ختم ہو گیا۔  
”اور کچھ نہیں کہو گی۔“

”میں تمہارے حق میں دعا کروں گی۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فراز کی جانب چلی آئی۔ جو مین گیٹ کے قریب مہمانوں میں گھرے تاقب سے الوداعی سلام لے رہا تھا۔

بارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی تک دونوں خاموشی سے ہمدرد آئے تھے۔ گاڑی کے فرنٹ ڈور کا لاک کھولتے ہوئے فراز نے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے نا؟“ وہ چونکی تھی اور پھر اس کی جانب دیکھے بنا فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔  
”سب ٹھیک رہا فراز۔ وہ سب کچھ بھی جو آپ پوچھنا چاہ رہے ہیں۔“

فراز نے گاڑی کا میگزین چینی کرتے ہوئے اس کی آواز سنیں تھی اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی تھی۔

فراز کو معلوم تھا کہ وہ اب کچھ پوچھنا چاہتا ہے لیکن خاموش رہے گا اس لیے اس نے فراز کو زیادہ انتظار نہیں کروایا تھا اور خود ہی بول پڑی تھی۔

”مجھے یقین آ گیا فراز کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن کبھی کبھی زندگی میں خدا کے کچھ فیصلوں کے ٹھیک ہونے کا اعتبار وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی فطرت میں ناشر اور بے مبرا پن ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی کہ فراز کی آواز گاڑی میں گونجی۔ ”اور کچھ جو کہنا ہو۔“

”ہوں، آئندہ کوشش کروں گی خدا کی رضا میں راضی رہنے کی۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کی سیٹ کی پشت سے طمانیت سے سر نکال دیا۔

☆.....

ملاست وہ اس سے کہنا چاہتی تھی وہ اپنی زبان سے خود ہی بول رہی تھی۔

وہ خاموش تھی کہ اس کے موبائل پر Miss Call آئی۔ اس نے اسکرین کا رخ اپنی جانب موڑا۔ فراز نے من بیل کی تھی وہ یقیناً اسے وہاں ہی کے لیے بلا رہا تھا۔ موبائل اسکرین پر اس کا نام جگمگاتا دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جاری ہو؟“ اتنا وار اس سے پوچھ رہی تھی۔  
”ہاں، میرے husband مجھے بلا رہے ہیں۔“

”میں نے سنا ہے تم اپنے شوہر کے ساتھ ان کا بزنس بھی پنڈل کرتی ہو۔“ بے ساختہ ہی فاز نے اس کی جانب دیکھا۔

”میں تمہیں بہت عرصے سے تلاش کر رہی تھی۔ میں تاقب کی خالہ کی بیٹی ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں علم ہوا تو میں تمہارے husband کے پاس گئی تھی۔ تم سے ملنا چاہتی تھی ڈر تھا کہ تم مجھے پہچاننے سے انکار نہ کرو لیکن تمہارے شوہر کا کہنا تھا کہ تم بہت بڑے عرف والی ہو۔ ایسا بھی نہیں کر دئی۔“

فاز نے ذہن میں آتا سوال پڑھ کر اتنا وار بولی تھی۔  
”میں نے ہی تاقب سے بولا تھا کہ تمہیں ضرور بلا لیں۔ مجھے تم سے ملنا تھا۔“

”خدا حافظ۔“  
”تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ تلاولی۔  
”میں تم سے خفا نہیں تھی تو پھر معافی کیسی؟“ وہ پلٹ کر اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرائی  
انداز میں تسلی تھی۔ دلا رہا تھا۔

”کچ کہہ رہی ہو؟“  
”ہوں بس تھوڑا سا شکوہ تھا تم سے نہیں خدا سے کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ جب میں نے کوئی خطا نہیں کی تہ ہی کسی کا حق مارا تھا لیکن آج

تہسم فیاض

افسانہ

## افسانہ

”احسن بیٹا! سارہ کی ماں آئیں تھیں، وہ سارہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ واپس لے گئی ہیں۔“ فاخرہ بیگم نے احسن کے آفس سے آتے ہی دھماکا کیا۔  
”لیکن کیوں امی! کیا بات ہوئی تھی؟“ احسن نے پریشان سا چہرہ لیے دہلی آواز میں سوال کیا۔  
”ارے مت پوچھو، میں نے صرف اتنا کہا کہ شوز اتارتے ہوئے احسن کے ہاتھ رک گئے۔“



احسن جس راستے سے انفس جاتا اسی راستے سے  
سارہ اپنے کالج جاتی تھی، یوں احسن کو سارہ کی سادگی  
نے اثر کیا کیا اور اس نے ایک دن انفس سے جلدی گھر  
آکر سارہ کا چچا کیا اور اس کے گھر کا پتہ لگالیا۔  
دوسرے دن فاخرہ بیگم کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ وہ سارہ کے  
گھر جا کر رشتہ مانگیں، لیکن فاخرہ بیگم کا ذہن شروع سے  
نمرہ کے لیے تھا، اس لئے وہ راضی نہیں ہوئیں۔

احسن نے بہت جتن کئے لیکن وہ نہ مانیں آخر کار  
احسن نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی، جس سے  
فاخرہ بیگم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ان کی اکلوتی  
کائنات انہیں چھوڑ دے یہ سوچ سوچ کر ان کی جان  
نکل رہی تھی۔

آخر کار احسن کی ضد کی وجہ سے انہوں نے سارہ  
کے ہاں جانے کی حامی بھر لی اور دوسرے دن اپنی  
دونوں بیٹیوں کو لے کر سارہ کے ہاں پہنچ گئیں سارہ کو  
دیکھ کر حنا اور صبا (احسن کی بہنیں) کی خوشی کا کوئی  
ٹھکانہ نہ تھا، وہ نمرہ سے کئی گنا پیاری تھی، فاخرہ بیگم  
بھی اُسے دیکھ کر سمجھ گئیں کہ ان کا بیٹا کیوں اتنا فدا ہوا  
کہ گھر چھوڑنے کی دھمکی دے ڈالی، خیر وہ بھی اس کی  
خوبصورتی کی دل میں تعریف کیے بناء نہ رہ سکیں،  
لیکن وہ اپنی بھانجی کی محبت میں سارہ کی خوبصورتی کو  
بھی خاطر میں نہ لائیں اور منی سوچ کے زیر اثر اس  
سے بیرکھ لیا، ان کی سوچ یہ تھی کہ اس لڑکی کی وجہ  
سے احسن نے ماں اور گھر سے بغاوت کی لہذا وہ ان  
کی سوچ اور معیار کے مطابق ان کا دل نہیں جیت سکی

خیر جھوٹے منہ اور دکھاوے کی محبت دکھا کر  
انہوں نے رشتہ دے ڈالا، احسن پڑھا لکھا تھا خوش  
شکل تھا اور سب سے بڑھ کر PIA میں اچھی جاب  
کرتا تھا، اس لئے سارہ کے گھروالوں کو کوئی اعتراض  
نہ ہوا، انہوں نے حامی دے دی اور تاریخ طے ہو گئی،  
سارہ رخصت ہو کے احسن کے گھر آ گئی،

تمہیں کڑا ہی ڈھنگ سے بنانی نہیں آتی، صرف  
پیسہ بہاؤ کرنی ہو کوئی اور چیز بنا لو، اپنی ماں کے لیے تو  
بس یہ بات ان کی ماں نے سن لی اور کھڑی ہو گئیں  
کہ بس سارہ بہت ہو گئی، اب میں مزید تمہاری یہ  
ذلت برداشت نہیں کروں گی، اب بیگم ریڈی کرو  
اور میرے ساتھ چلو، بس بھی بس بی بی کا یہ سننا تھا اور  
وہ بیگم ریڈی کرنے پہنچ گئیں اور یہ جا اور وہ جا۔  
”تمہیں بھی بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی  
اور چل پڑی اپنا گھر جاہ کرنے۔“

یہ سب سن کر احسن کو بھی غصہ آیا کہ اگر کوئی  
بات امی کی بُری لگتی تھی، تو کم از کم مجھے ایک کال  
کر کے جانے کا تو بتا دیتی۔

احسن غصہ کی کیفیت میں وہیں صوفے سے  
ٹپک لگا کر بیٹھ گیا، فاخرہ بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر  
چوٹ کی۔

”ارے غضب کی لڑکیاں ہیں آج کل کی، ذرا  
بھی سسرال، ساس اور شوہر کا لحاظ نہیں ایسے ناک پہ  
پیاز کانتے ہیں بھلا ذرا ذرا سی بات پر میکے جا کر بیٹھ  
جاتے ہیں، انہیں یہ خوف نہیں کہ اگر ان کے شوہر  
متانے نہیں آئے تو ساری زندگی میکے میں بیٹھی رہ  
جائیں گی، میں تو کہتی ہوں پہلی دفعہ میں ہی سبق  
دے دو، ورنہ ساری زندگی روٹھنا متا رہے گا۔“

”ہمارے زمانے میں تو ساس کے حکم کے بغیر  
اپنے کمرے میں نہیں جاسکتے تھے، ان کی آواز پر کھانا  
چھوڑ کر ان کا کام کرنے دوڑ جاتے تھے۔“ بس فاخرہ  
بیگم اپنے زمانے میں پہنچ گئیں۔

فاخرہ بیگم ایک روایتی ساس تھیں، لیکن ان کا  
سب سے بڑا مسئلہ سارہ کا وجود ہی تھا، چونکہ احسن  
ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے فاخرہ بیگم اس کی شادی اپنی  
بھانجی نمرہ سے کرنا چاہتی تھیں لیکن احسن کو سارہ پسند  
تھی، احسن کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی نمرہ کو بھانجی  
بنانا چاہتی تھیں۔

جی دن سے سارہ رخصت ہو کر آئی اسی دن سے فاخرہ بیگم نے اس کی ہر بات اور ہر کام میں کیڑے نکالنا شروع کر دیئے۔

شروع میں سارہ ان کے مزاج سے بہت گھبرائی، لیکن احسن کے سمجھانے پر آہستہ آہستہ انہیں سمجھنے لگی۔ لیکن جب سارہ کے گھر والے اور خاص کر اس کی والدہ گھر پر آئیں تو وہ ان کی خامیوں کی لمبی لسٹ لے کر بیٹھ جائیں اور بات بے بات ان کی تربیت کو نشانہ بنائیں۔

انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ سارہ اس محض زوہ ماحول میں کس طرح رہ رہی ہے، کبھی کبھی وہ سارہ کے اس گھر میں رشتہ ہونے پر ہچکچاتیں اور کبھی اُسے سمجھاتیں۔

آج جب انہوں نے سارہ کو ان کے سامنے گڑگڑاتے سمجھاتے دیکھا تو ان سے بلی کی یہ بے چارگی دیکھی نہیں گئی اور وہ طیش میں آ گئیں، وہ سارہ کو اپنے ساتھ صرف اس لئے لائیں تھیں کہ اب وہ اس معاملے میں احسن سے بات کرنا چاہتی تھیں۔

ادھر فاخرہ بیگم نے اصل داستان چمپا کر اور بات کو کول مول پیش کر کے احسن کا دل سارہ کی طرف سے بُرا کر دیا، بلکہ یہاں نہیں اتنا کپکا کر دیا کہ احسن سارہ کو لینے اور نہ ہی اصل حقیقت جاننے گیا۔

وہ اپنی ماں کے آگے اس لئے خاموش تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اُس کی خاطر سارہ کو خوشی خوشی پیادہ کر لے آئیں اور اپنی پسند کی قربانی دی ہے۔

☆ ☆ ☆

دن آہستہ آہستہ گزرتے جا رہے تھے احسن کبھی تنہا ہوتا تو گھبرا کر سارہ کو لانے کا سوچتا، لیکن پھر ماں کے الفاظ اس کے کان میں گونجنے لگتے۔

ادھر سارہ کا رد و کر برا حال ہو گیا، اُسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا کہ میں اس دن اگر امی کا کہنا نہیں مانتی تو آج میں اپنے گھر میں ہوتی۔

سارہ کی والدہ نے کئی بار احسن سے بات کرنے کے لیے رابطہ کیا، لیکن احسن نے غصے سے کال اٹینڈ نہیں کی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، معاملہ اتنا ہی بڑھتا جا رہا تھا اب آہستہ آہستہ سارہ کے گھر والے احسن کے رویہ سے ٹالاں ہو رہے تھے، ان کا خیال قائم از کم احسن کو اصل حقیقت کا پتہ لگانے کے لیے سارہ سے بات کرنے آنا چاہیے تھا، جو کہ احسن نے نہیں کیا۔

فاخرہ بیگم اپنے غرور اور مزاج کے مطابق بیٹے کو ایک بڑی پریشانی دے کر خوش تھیں۔

”صبا! بھابی سے کہو نا کہ بھابی کو لے آئیں، میں تو گھر کا کام کر کر کے تھک گئی ہوں، یہ بھابی کی ہمت بھی کہ جو گھر کے کام کے ساتھ امی کی کڑوی سی باتیں برداشت کرتی تھیں۔“

حسانے صبا سے کہا۔  
صبانے حنا کی بات کی تائید کی، حالانکہ صبا جانتی تھی کہ اس کی امی غلط ہیں، وہ سارہ بھابی کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں، لیکن یہ بات امی کے منہ پر کہے کون؟

”حنا! اب بھابی کا معاملہ سیریس ہوتا جا رہا ہے، اب ہمیں ہی کچھ کرنا چاہیے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے مجھے بھی تو نظر کھار ہی ہے کہ اتوار کو سب میری فرینڈز آر ہی ہیں شام کی چائے پر بھابی نہیں ہوں گی تو کتنا امپریشن خراب پڑے گا۔

میں چاہتی ہوں سب بھابی سے ملیں تو سب کتنا امپریشن ہوں ان سے مل کر۔“

صبانے فکر مند ہی سے حنا سے کہا اور کچھ سوچ کر اٹھی کہ آج میں بھابی سے بات کر کے رہوں گی۔

احسن آفس سے گھر آیا تو صبانے امی سے نظر پچا کر احسن کا دروازہ ٹوک کیا۔

سامنے صبا کو پا کر احسن نے حیرت سے کہا۔



”خیر یہ اتنی رازداری سے کیوں دروازہ ہلایا؟“  
 ”بھائی! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے،  
 بہت ضروری بھائی کے مطلق ہے۔“  
 صبا نے آہستہ سے بتایا۔

”کیا بات ہے؟“ احسن نے پوچھا۔  
 ”بھائی! آپ بھائی کو لے آئیں، ان کے بغیر  
 یہ کمراد حور ہے، وہ سچ ہیں اپنی جگہ امی نے ان کے  
 ساتھ بہت زیادتی کی ہے، وہ تو ان کے گھر والوں کو  
 انہی کے منہ پہ جانے کیا کہہ دیتی تھیں، بھائی نے  
 بہت برداشت کیا، لیکن امی کو جانے اُن سے کیا پیر ہے  
 ، اُن کی اچھائی میں بھی انہیں برائی نظر آتی ہے۔“

اس طرح کی بات سُن کر احسن کو شاک لگا،  
 کیونکہ سارہ نے احسن کو شروع شروع میں فخرہ بیگم  
 کا رُو یہ بتایا تھا تو احسن نے سمجھا کر اگور کر دیا تھا، اس  
 کے بعد سارہ نے کبھی احسن کو فخرہ بیگم کی کوئی بات  
 نہیں بتائی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو، جرنے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا  
 اور اُس دن کیا بات ہوئی تھی مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“

صبا نے ساری بات اپنی امی کی بتائی اور پھر کہا  
 کہ ”بھائی تو امی سے ریکوسٹ کر رہی تھیں کہ میری  
 امی آئی ہوئی ہیں، آپ پلیز مجھے بعد میں سب کہہ  
 دیجئے گا، لیکن انجی کپڑ ہو جائیں میرے گھر والوں کو  
 دکھ ہوتا ہے، جب آپ اس طرح کی باتیں کرتی ہیں،  
 بس امی یہ سن کر اور شیر ہو گئیں اور سارہ بھائی اور ان  
 کی امی کا خیال کیے بغیر جانے کیا کیا کہتی رہیں، آنتی  
 پہلے تو برداشت کرتی رہیں، جب سارہ بھائی روئیں تو  
 پھر آنتی طیش میں آکر انہیں اپنے ساتھ لے گئیں۔“

بھائی جانا نہیں چاہ رہی تھیں اور انہوں نے آپ  
 کو کال کرنے کی کوشش کی بھی کی تھی، لیکن بیلنس نہیں  
 تھا، اس لیے انہوں نے مجھ سے کال کرنے کا کہہ دیا  
 تھا، لیکن امی نے مجھ سے سوہاگل پھن کر رکھ لیا تھا کہ  
 کہیں میں آپ کو کال نہ کروں۔“

یہ حقیقت سُن کر احسن کی آنکھوں کے آگے  
 اندھیرا چھا گیا اور اُسے لمحہ بھر میں یاد آ گیا کہ اس دن  
 سارہ کے کہنے کے باوجود بیلنس ڈالوانا بھول گیا تھا۔

”یہ سارا قصور میرا ہے نہ میں بھولتا اور نہ اتنی بد  
 گمانیاں ہوتیں، میں نے تو امی پر ہمیشہ یقین رکھا،  
 مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب تک نمرہ کو نہیں ہلایا ہیں،  
 جب ہی تو سارہ کو انہوں نے دل سے قبول نہیں  
 کیا اور میں..... جب سارہ مجھے ان کا بیوہ بتاتی تو  
 مجھے نوٹس کرنا چاہیے تھا۔“

اوہ مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا۔“ احسن کے ٹینشن سے  
 پسینے چھوٹ گئے، صبا سے بھائی کی یہ حالت نہیں  
 دیکھی تھی تو بولی۔

”بھائی! ایک بات کہوں میں نہیں چاہتی کہ  
 آپ بھائی اور اُن کے گھر والوں کے سامنے شرمندہ  
 ہوں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ امی، بھائی کے ساتھ سچ  
 ہو جائیں اور کھر بکھرنے سے بچ جائے، اس لیے  
 آپ کو میں ایک آئیڈیا دوں جس سے سب کا فائدہ  
 ہے اس کے لیے آپ کو ایک ڈراما کرنا ہوگا، آپ کو  
 مضبوط بننا ہوگا ایک دفعہ پھر امی کے سامنے۔“

احسن کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب  
 ہو گئی تھیں۔ اس لیے اُس نے صبا سے کہا۔  
 ”بتاؤ میں سب سچ کرنے کے لیے سب کچھ  
 کروں گا۔“

سب سننے کے بعد احسن خوش ہو گیا اور اپنی بہن  
 کو ڈھانسیں دیں۔ اب وہ فخرہ بیگم کو بتائے بغیر سارہ  
 کے گھر میں موجود تھا۔

سب کا رُو یہ احسن سے رُڈو تھا، لیکن احسن کو پتہ  
 تھا وہ سب جائز ناراض ہیں اس سے اس لیے پرواہ  
 کیے بغیر اُس نے تمہید بانگی۔

”آئی! میں آپ سے صرف یہ کہنے آیا ہوں  
 میں سارہ کو جیسے کواچے ساتھ لے جاؤں گا۔“  
 ”لیکن کیوں اتنی جلدی خیال آگیا تم کو؟“

سارہ کی والدہ نے طنز یہ کہا۔

”امی! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“  
احسن نے فاخرہ سے کہا۔

”امی! میں نے سوچ لیا ہے کہ سارہ آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی لہذا میں سارہ کو الگ گھر میں لے کر رہوں گا، وہ بھی آپ کا رویہ بتاتی ہے اور آپ بھی اس سے خوش نہیں ہیں، اب میرے پاس یہ آخری حل ہے اپنی ازدواجی زندگی بچانے کا اب سارہ کو بھی پتہ چل جائے گا کہ الگ ہونے کے بعد اُسے پوری ذمہ داری کیسے اٹھانی ہے، پھر وہ سارا کام ڈھنگ سے کرنا سیکھ جائے گی۔“

احسن نے ماں کا چہرہ دیکھ کر بغیر ساری بات کہہ دی اور ادھر فاخرہ بیگم کے غرور اور جھوٹ کا کل ان کے سر پر آکر، انہیں توقع نہیں تھی کہ بیٹا یہ قدم اٹھا سکا ہے، آج انہیں اندازہ ہو گیا کہ کس طرح انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر بکھیر دیا ہے، اپنی بھانجی کے چکر میں اپنے بیٹے کی ہستی کیلئے زندگی داؤ پر لگا دی۔

آج ان کے الفاظ کم تھے، بس کہا تو اتنا کہا ”خبردار! جو یہ گھر چھوڑنے کی بات کی، اب بھی تو اس گھر میں میرے پوتے پوتوں کو کھیلنا ہے، بس رہنے دو، میں نے سب بھلا دیا اور کچھ بھی ہے سارہ میرا بھی، سبھی خیال تو کرتی تھی، ان لڑکیوں کا کیا ہے یہ تو اپنے گھر کی ہو جائیں گی، میرے گھر کی ہر روٹی اس کے دم سے ہے آج ہی چل کر میرے ساتھ سارہ کو لے کر آؤ۔“

میں ان کی والدہ سے بھی شرمندہ ہوں کہ ان کے سامنے میرے گھر کے اندرونی معاملات منظر عام پر آئے، میں ان سے بھی ملنا چاہتی ہوں۔“

فاخرہ بیگم ہکا بکا ایک منٹ میں لاکن پر آگئیں اور ادھر احسن نے وٹری کا نشان بنا کر صبا کو اس کے بہترین آئینے پر مہار کیا ددی اور وہی فرصت میں احسن، ماں کو لے کر سارہ کے گھر نئی اور خوشحال زندگی کی شروعات کرنے چل پڑا، جہاں ہر طرف خوشیاں مسکرا رہی تھیں۔

”میں سمجھتا ہوں کہ سارہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اس پر میں شرمندہ ہوں، لیکن یہ نہیں سمجھیں کہ مجھے کچھ خبر نہیں میں اس کا انداز اور سارہ کا صبر پرکھنے آیا ہوں اور اس کا پراپر انتظام اور حل نکالنے میں مجھے اتنا تاؤ لگ گیا۔“

سارہ نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے انداز سے احسن کو دیکھ کر کہا، ”احسن آئی کے روئے کو پہچانتا تھا، لیکن ابھی احسن نے ظاہر نہیں کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں احسن کی نظروں میں سرفرد ہوں۔“

”لیکن تم نے اس کا ایسا کیا حل نکالا ہے جو اتنا تاؤ لگا دیا کہ سارہ سے بات تک کرنے کی کوشش نہیں کی؟“  
سارہ کی والدہ نے کہا۔

”میں سارہ کے لیے ایک الگ گھر ڈھونڈ رہا تھا جس میں یہ سکون سے رہے، جب تک امی اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتیں میں اور سارہ اس گھر میں رہیں گے۔“  
احسن نے اطمینان سے بتایا۔

”کیا؟..... احسن! میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ آپ اپنی ماں بہنوں اور گھر سے الگ ہوں، آپ اکلوتے ہیں اور آپ کو ان کا خیال کرنا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتی یہ حل ٹھیک ہے۔“

احسن کو سارہ سے اس بات کی ہی امید تھی، احسن دل میں پشیمان تھا کہ وہ ایک ایسے ہیرو کے کھونے جا رہا تھا جس کا ہم البدل اُسے شاید کبھی نہیں ملتا۔

خیر احسن کے اس جھوٹ پر سب نے یقین کر لیا اور سب کا دل احسن کی طرف سے صاف ہو گیا۔

احسن نے سارہ کو سمجھایا ”وہ امی سے جب گھر سے جانے کا کہے گا، تو یقیناً وہ تمہاری طرف سے اپنا دل صاف کر لیں گی، وہ اپنا بیٹا کسی قیمت پر نہیں کھوئیں گی اور پھر ہم کسی اور گھر جانے کے بجائے اپنے ہی گھر واپس چلے جائیں گے۔“

جس پر سارہ مطمئن ہو گئی اور احسن دوبارہ آنے کا

# الحولہ و الثمین مسافر

مسافت طویل تھی تو مسافر و ثمین، مابین تعلق مضبوط ترین تھا، تو جذبات تلاطم انگیز تھے مگر فضا مبہم کیوں تھی؟ لیوں کا سکون جان لیوا کیوں تھا؟ کار میں موجود دونوں نفوس گرا انداز نشست میں اتنے قریب تھے، تو پھر دلوں میں فاصل کیوں تعمیر ہو رہی تھی؟ کوئی جواب نہ تھا ان سوالوں کا خود ان



پڑے سورج کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں تو دوسری طرف یسری امین چاند کی مانند سرخ و سفید شہنشاہ کی پہچانی روشنی کی مانند تھی اس لیے یہ تشبیہ ظاہر باطن ہر طرح سے فٹ آتی تھی۔

”الہیہ“ کا لفظ کتنے مفہیم اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسی ہستی جو آپ کے جان و مال کی مالک اور شراکت دار ٹھہر جائے مگر کیا اسے الہیہ کہنا مناسب تھا جو اس لفظ کے مفہوم سے ہی نہیں مابین رشتے کی جزئیات تک۔ سے نا آشنا تھی۔

موچے موچے کب بابر امین نے گردن موڑتے ہوئے اسے چمکی نگاہ سے دیکھا تھا کہ

کے پاس بھی جو قفل زدہ لیوں اور پہچان اٹھاتی خواہشات کے ساتھ بظاہر ایک دوسرے سے بے نیاز نظر آتے تھے۔

لاہور سے اسلام آباد بذریعہ بوڑھے سفر میں آخر وہ کس افتاد کے تحت مانند انجمنی ہمسفر ہوئے تھے۔

بابر امین اور اس کی الہیہ یسری امین کتنا مکمل جوڑ تھا۔ پہلی نگاہ پڑتے ہی چاند سورج کی تشبیہ دماغ میں آتی تھی اور انہیں قریب سے جاننے والے بھی اس رائے سے انکار نہیں کرتے تھے کیونکہ بابر امین روشن بھی گرم بھی حاکم تو کبھی مدغم



تیار نہ تھا۔ بلند آواز ایک دوسرے کی گفتگو میں غل  
ہو رہی تھی اور بات سمجھنا اور سمجھانا دشوار سے دشوار  
تر ہوتا چلا جا رہا تھا مگر پہل کون کرے، یہ دونوں  
میں سے کسی کو گوارہ نہ تھا۔

”نہیں یار ابھی تک تو حیدر آباد کر اس کیا  
ہے۔“

”لاہور اور اسلام آباد کے بیچ میں یہ کب سے  
آنے لگا؟“

احمد کے استفسار پر کہ کہاں تک سفر گزرا ہے وہ  
بھیرہ کہنے کے بجائے حیدر آباد کہا تھا، کیونکہ سیرٹی  
اپنی کزن سے حیدر آبادی تھیں سے متعلق کچھ  
ڈسکس کر رہی تھی۔ آواز سے آواز کرائی تو بات  
بھی کہاں سے کہاں جا چکی۔ احمد کے ریکارڈ  
لگانے پر اس نے فون بند کر دیا اور سرعت سے  
سیرٹی کی طرف متوجہ ہوا۔

”اگر آپ کار میں سفر کر رہے ہوں تو بات  
کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔“

وہ اپنی جینٹل کوٹرز میں لپیٹ کر پہلی مرتبہ اس  
سے مخاطب ہوا جو شریک سفری نہیں شریک زندگی  
بھی تھی اور یہ بھی نہیں کہ زبردستی اس کی زندگی میں  
شامل کی گئی ہو یہ رشتہ سراسر اس کی ایما اور ضد پر  
ہوا تھا۔

”اچھا اگر یہ اصول آپ نے سیکھے ہوں تو مجھے  
بھی سکھا دیجئے۔“

کیا پھول جھڑے تھے۔ تین ماہ کی لہن کے منہ  
سے جو آج تک اس کے سامنے غیر ضروری تو کیا  
ضروری ترین بات بھی نہیں کر پائی تھی، پھر آج کیا  
توبہ ماردی وہ حیرت کے سوائے کچھ نہ تھا۔

”محترمہ بات بند جگہ پر ہو یا کھلی فضا میں اس  
کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔“

اس کی زہریلی بات پر جواب حسب نتیجہ تھا۔  
اس جیسی سبک خرام ہستی اگر چہ سکتی تھی تو مقابل تو

جواب دہ بھی شعلہ برساتی نگاہوں سے اس کی طرف  
متوجہ ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے کے سفر میں یہ پہلی بار  
تھا جب ان کی نگاہیں آپس میں ٹکرائی تھیں ورنہ  
اب تک تو کون اور میں کون کے مصداق اپنی  
نشستوں پر برجمان تھے۔

”دیور جی شادی کے بعد پہلی بارش اور پہلا سفر  
یادگار ہوتے نہیں بنائے جاتے ہیں۔“ بانو بھائی  
کی کبھی بات کا دماغ میں آنا تھا جذبات میں مد  
و جزر اٹھنے لگے۔ جذبات سے گندھی دل میں گنتی  
خواہشات تھیں جو اب حسرت بننے لگی تھیں۔ اس کا  
سفر اس کے حال دل سے انجان کیوں تھا اس کی  
نگاہوں کی چمکتی خواہشات اس کو دکھائی کیوں نہیں  
دیتی تھیں۔

بابر امین سوچ سوچ کے ٹکڑھ رہا تھا۔ اس کی  
اندرونی خلفشار کا اندازہ اسٹیرنگ پر اس کے  
بیکٹے ہاتھوں اور کار کی کبھی غیر ضروری تیز رفتاری  
تو بھی حد سے زیادہ ست رفتاری سے بخوبی لگایا  
جا سکتا تھا۔

”من موحی بندہ ہے کبھی بارش بن کر رہتا ہے  
تو کبھی آسمانی بجلی بن کر کرتا بھی ہے۔“

سیرٹی امین جو اپنے سفر کی حرکات کن انکلیوں  
سے دیکھتی پہلے ہی خائف بھی بانو اپنا کے باہر کی  
بابت کہے گئے انکشاف کو یاد کرتے ہی دہل سی  
گئی۔ پیار کی بارش میں بھیجنے سے قبل ہی بجلی گرنے  
کے خوف نے اسے ایک خول میں بند کر دیا تھا۔ وہ  
چاہتے ہوئے بھی اس خول سے نکراتی اس کی بیجانی  
چاہت کو اپنے دل و وجود میں سامنے نہیں دینا  
چاہتی تھی۔

اتفاق تھا کہ دونوں کی ایک ساتھ سیل فون پر  
ہپ ہوئی تھی۔ فون اٹینڈ کیے دونوں ایک دوسرے  
سے تعاطل کا حسین مظاہرہ کر رہے تھے مگر ان کے  
مارے دونوں سے کوئی بھی اپنی آواز مدھم کرنے کو



تھامی ہوا کاجھونکا۔

”جی میں نے وہی عرض کیا کہ پہلے سیکھ لیجئے پھر سکھا دیجئے۔“

وہ اب بھی اپنے لہجے اور اعزاز سے بخیر کو تیار نہیں تھی دویدو بولتی تھی وہ کھول تو رہا تھا مگر ایک بات اس پر ضرور عیاں ہو گئی تھی کہ یسری امین کے بارے میں بتائی گئی ایک بات تو غلط ثابت ہوئی تھی کہ وہ تنجو کی حد تک کم گوئی۔

”آپ ہمارے سینے پر اتنی ہی بضد ہیں تو اپنی شاگردی میں لے لیجئے۔“

بابر امین نے اب خلاف توقع بمباری کے بجائے میٹھی چھری کا سا اعزاز اٹھایا، جواباً دہینویں اچکانی خود کو بے نیاز ترین ظاہر کرنے کے لیے سر سے اسکارف اتارے بال سینٹے لگی۔

”ہماری صحبت میں رہیں گے تو سب سیکھ لیں گے۔“

بنا بڈی کی زبان کب پھسل جائے کوئی نہیں جانتا۔ اپنی دانست میں ایک معقول جواب دیتی وہ کیا پیشکش کر گئی تھی اس نے اسے سر تا پا غرق آب کر دیا تھا۔ خود بابر امین کے لیے مٹھن زدہ سفر کون سا روزن کھلا تھا کہ مسام جاں کھل اٹھے تھے بند کار کے تناؤ میں نہ تو اسے سی کی کو لنگ نے وہ کام دکھایا تھا نہ تازہ ہوا کے لیے کھولی گئی کھڑکیوں نے مگر جو تازگی اس کے غیر ارادی لفتوں نے اور روشن چہرے پر بکھری سنہری لٹوں سے اسے میسر آئی تھی وہ کہاں ان کے لائق تھی ایک اور خاموشی کا آغاز ہوا تھا مگر اب کہ کہیں شرارت تو کہیں حیا کیوں پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

☆.....☆

نور بانو نے والد کے انتقال کے بعد ایک لمبی میٹھل کمپن میں جاب کر لی تھی تاکہ ماں اور یسری پر مشتمل اپنی چھوٹی سی فیملی کو فنانسی سپورٹ کر

سکے۔ سہنی آزا کبر علی سے کب علیک سلیک بڑھ کر اٹوٹ بندھن میں تبدیل ہو گئی وہ ایک روایتی کہانی ہے، ہاں اکبر کے بھائی بابر امین سے ان کی وچنی مطابقت کمال کی تھی۔ وہ رشتوں کا احترام کرنے والا انسان اسے بھابھی سے ماں بنا کر مقدس چاہتیں اس پر لٹانے لگا وہ بھی شوہر، اس کے والدین، ایک بھائی بابر اور ایک ہی بہن تانیہ کے لیے چھتار ثابت ہوئیں۔ ان کی چاہتوں کے گردیدہ ان کے سسرال نے بابر امین کی یسری کے لیے پیش کی گئی چاہت کا دل سے خیر مقدم کیا۔ اور وہ یسری امین بن کر اس کی زندگی میں شامل ہوئی مگر ان کے ملن کی راہ میں جانے کون سے پتھر حائل ہوئے؟ کیا سبب ہوا؟ کیا غضب ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے بے نیاز اور متغیر ہونے لگے کیا بیان کریں کہ بیان کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

”ہم تو بے تاب ہیں آپ ہی دیوار اٹھائے بیٹھی ہیں۔“

اس کی بے دھیانی میں کئی بات نے بابر امین کو کس رنگ میں نہلا دیا تھا کہ اب بات کرنے کا ڈھنگ ہی جدا تھا۔ وہ سرخ چہرے اور جھکی نگاہوں کے ساتھ جواب دیجئے سے قاصر تھی۔ کوئی کی مفت اب سامنے آئی تھی۔

”اس دیوار کے پار رنگوں کا جہاں آباد ہے ہمیں اس طرف صحرائیں کیوں چھوڑ دیا؟“ بابر کون سی چکایت بیان کر رہا تھا وہ متعجب تھی۔ شادی سے قبل اس سے جب بھی سامنا ہوا وہ ایک پُر لطف تعارف سے آگے نہ بڑھا اور شادی کے بعد پہلی ملاقات اس کی پہل کے انتظار میں گزر گئی جو بات اس بند کار میں اس نے کہی تھی وہ آج تک بند کمرے میں ادا کیوں نہ ہوئی۔

”کسی سڑک چھاپ شاعر کا کلام لگتا ہے آپ

کا کلام۔“

بابر امین نے کتنی بے اختیار نگاہ اٹھائی تھی اس کی جانب توجہ کہنا تھا کہ کار غیر متوازن ہوئی تھی اور وہ بھی غیر محسوس طریقے سے اس کا بازو تمام گئی تھی۔

بیرنی امین کے خوبصورت لیوں نے کیا گل افشانی کی اگر وہ ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو چند منٹ ضرور اچھلتا۔

”ایکسپوز می میم! مجھے سڑک چھاپ تو کیا شعراء آفاق شعراء سے بھی قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور پلیز میرے احساسات پر کمٹنس پاس مت کرو۔“

پہلے سفر کی پہلی حسین واردات بابر امین نے رائیگاں نہ جانے دی اور اپنے بازو کو پکڑے اس کے نازک ہاتھ کو دبا کر خاموش سبق پڑھا دیا۔

”بیرنی تجھے ڈیٹھ کی عادت ہے جبکہ بابر بحث و مباحثہ سے الگ ہے اس عادت سے پرہیز تیری زندگی سنوار سکتا ہے۔“

بانو ایما نے سرخ شرارے میں روایتی ہتھیاروں سے لیس چاند چہرہ دہن کو متوازن زندگی میں پاس ہونے کے لیے پہلا سبق پڑایا تھا جس کا خاطر خواہ اثر لیتے ہوئے وہ بحث و مباحثہ کی عادت ترک کرنے کی بجائے بولنا ہی فراموش کر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بابر امین کے پہلے پڑجوش سلام پر کوئی رد عمل تو کیا ہی دکھائی بے نیازی کا عظیم مظاہرہ کرنے لگی۔ مقابل کے دماغ میں بھی بانو ایما کے الفاظ من و عن جھلک چلائے ہوئے تھے۔

بیرنی امین کی پیشرفت رائیگاں گئی تھی۔ یہ بات اس کے لیے تازہ پانے سے کم نہ تھی۔ یہی رد عمل وہ خوف تھا جس نے پہلی ملاقات سے آج تک پہل کرنے سے منع کر رکھا تھا کیونکہ اسے حد درجہ یقین تھا کہ یہ کھڑی ناک والی نازک لڑکی سیدھے سمجھاؤ بات کرنے کی عادی نہیں ہے۔

بیرنی امین اپنے تنظیم پر خود بھی حیران تھی۔ وہ کبھی بھی طنز یہ گفتگو کی مرتکب نہیں ہوتی تھی اور پھر اپنے شریک حیات کے ساتھ ایسے برتاؤ کے متعلق تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جتنی درنا تائب لڑکی کی زندگی میں وہ کونسا جبر داخل ہوا تھا بیرنی کی رضامندی سے ہی یہ رشتہ استوار کیا گیا تھا۔

”معذرت کے ساتھ میں تو بس مبالغہ آرائی کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔ شاعری کا لازمی جزو ہے یہ۔“ وہ اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ذرا تفصیل سے گویا ہوئی شاعری سے خصوصی شغف بھی اس کا ایک سبب تھا اور بابر کی شاعری سے الگ رہتی ہے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔

”زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے ذرا سی مبالغہ آرائی کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔“ وہ بھی بات کو طویل دینے کے بجائے میز فائر کرتے ہوئے بولا۔ یہ اس کے مزاج کی متوازن اداسی جو بیرنی کے دل میں اتر کر مسکراہٹ بن کر لیوں پر آگئی۔

جائے ہوں بے معنی سوچ کا قلعہ تعمیر کیے دونوں اس میں محصور ہو گئے۔

☆.....☆

”اسلام آباد آنے میں کتنا وقت باقی ہے؟“ یہ پہلی مرتبہ تھا جب اس نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے سوال داغا تھا۔ باہر امین کہنا چاہتا تھا کہ آدھ گھنٹہ اور ہے مگر کہنے کی بجائے اس نے یئرٹی کا بڑی آنکھوں سے حیرن چہرہ ہاتھ کے کنورے میں لیا تھا۔ یئرٹی کے لیے شریک سفر کا لمس نیا نہیں تھا مگر حدت کچھ الگ سی تھی؛ کار چلاتے باہر کے دل میں کیا خواہشیں چل رہی تھیں اور آیا ان جذبات کا بڑا ڈوب تک آنے والا تھا یئرٹی کا پسینے سے شرابور جسم سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”تمہیں نہیں لگتا یہ سفر ختم نہیں ہونا چاہیے“ فاصلے طویل ہو جائیں، راستے پُر پیچ ہو جائیں، بس منزل نہ آئے۔“ باہر امین کے اندر یکایک طوفان سر اٹھانے لگے تھے۔ یئرٹی کی حیران آنکھوں کے ساتھ وہ خود بھی متوجہ تھا، کتنا عجیب تھا شادی کے تین ماہ تک جو بائیس دل میں دفن رہیں آج کیا غضب ہوا کہ خواہشیں انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو گئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پہلی بار ایک دوسرے کے ساتھ تنہا تھے بیابان کی نصیحتوں کو سر پر سوار کیے محض اپنی اپنی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مشاہدہ مختلف ہوا تو نتیجہ بھی حسب فطاعتی ہونا تھا۔

”اس سفر کی ابتداء میں آپ کے خیالات کافی مختلف تھے۔“

یئرٹی امین ایک بار پھر ہنسی سے اتر چکی تھیں۔ آخر وہ کیسے فراموش کر دیتی کہ یہ سفر سراسر بانو ایما کے اصرار پر طے ہوا تھا۔ اسلام آباد میں کسی عزیز کی شادی کی تقریبات کے سلسلے میں تمام فیملی پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی۔ ایک بزنس میٹنگ

کے سلسلے میں باہر امین کو عین وقت پر پہنچنا تھا۔ بانو بھابھی کی ایما پر وہ بھی باہر کے ساتھ رک گئی تھی اس بلا وجہ کی ذمہ داری پر باہر نے کافی ناک بھوں چڑھائے تھے اور باتوں کے دوران دو مرتبہ مصیبت کا لفظ بھی استعمال ہوا تھا۔

”سفر سے خوش تو آپ جتنا ہی نہیں تھیں اسی لیے آدھا گھنٹہ ہارن دیا تھا جب آپ کی سواری باؤ بہاری کار تک تشریف لائی تھی۔“ اب کے وہ بھی خوش گفتاری کا چولا اتار چکا تھا۔ بات آگے بڑھتی کیسے جب بدگمانی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

”ہاں تو کیسے فوراً آ جاتی آپ نے میرے اس قدر تیار ہونے پر ایک نگاہ ڈالنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔“ اُنسا سفر پر ایسی ڈر۔ سو کے پہننے کے فوائد گنوانے لگے تھے۔ پہنچ کرنے میں دیر تو ہوتا ہی تھی۔“ کتنا بے سرو پا الزام تھا، جو وہ دھر رہی تھی وہ کمال حیرت سے کار کو بریک لگا گیا تھا۔ نتیجہ وہ جو اپنے دھیان میں تھی ڈیش بورڈ سے جا کر گرائی۔ باہر نے سرعت سے اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کے سر کو سہلایا تھا۔ یئرٹی کے لیے اس کی قربت خود فراموش کر دینے والی تھی۔ تین ماہ کی رفاقت میں ایک ہی روم اور بستر نشین ہونے کے باوجود اجنبیت کے کون سے دلیفے تھے جن کا وہ چلہ کاٹ رہے تھے۔ یئرٹی نے اپنے ماتھے پر رکھے بھاری ہاتھ مہربان کو اپنے نازک ہاتھ میں تمام لیا۔ انتہائی قریب سے دیکھنے پر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب تک وہ جس مسافر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے تھے وہ کوئی اور ہی تھا۔

”تمہیں کیوں لگا کہ میں نے تمہیں نگاہ بھر کر نہیں دیکھا، میں نے تو تمہارے ذرے ذرے کو نگاہ کے راستے دل میں اتار لیا تھا، بلکہ مجھے تو تم سے شکوہ تھا کہ تم نے میری پسندیدگی کو جانتے ہی

کے زیاں ہونے پر شکوہ کناں تھیں، کیا تھا جو ایک بار کہہ سن لیا ہوتا خود ہی فرض کی گئی کہانی کب کسی انجام کو پہنچتی ہے۔

”یہ حسرت تو میرے بھی دل کی ہے، تم اتنے پاس ہو مگر بھی اتنے فاصلے پر کیوں نظر آتی ہو؟ میں تمہیں کیوں نہ بتا پایا کہ تم مجھے ہر روپ میں پسند ہو، خواہ وہ زیناں ہو یا سادگی، شاید اس لیے کہ میں سمجھتا تھا کہ تمہیں خود کو میری آنکھوں سے دیکھنا پسند نہیں ہے۔“

بابر اعتراف کر رہا تھا اپنی کوتاہی کا، ساتھ ہی اس نے واضح کر دیا کہ اس پچھلا ہٹ کی وجہ کیا تھی؟ بانو ایسا کا تجزیہ کہ وہ اکثر پیشتر ارشاد فرماتی تھیں۔ ”عجب بھول بھلیاں شخصیت ہے اس کی، نہیں مظلوم خود کی برائی مذاق میں ٹال دے اور کب ذرا سے لباس پر تنقید پر آفت مچا دے۔“

بس یہ تجزیات ہی تھے جو ان کے رشتے کو تحفظات میں لپیٹ کر بے مول کر گئے۔ ہر عمل کے رد عمل کے بذات خود فرض کیے جانے کے کھلنے والے دونوں کے درمیان فاصلے بڑھا دیے۔ زعمی کا سہانا سفر بے کیف، بے یقین رفاقت میں بدل گیا۔ ”ماں کہتی تھی کہ میں اسم با اسمی ہوں جس کی دنیا میں جاؤں گی آسانیاں پیدا کر دوں گی مگر جانے کیوں آپ کی زعمی میں آسانی کیوں نہ پیدا کر سکی، انجھنوں کا سبب بن گئی۔“

یہی نے خود کو احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کیا تھا۔ وہ نادم تھی کہ اس شخص کی پیاری پھوار سے دامن کیوں بچا کر رہی۔ دوسری طرف خود بابر بھی خود احتسابی کا شکار تھا۔ کیا تھا کہ مفروضوں کے بجائے مذاکرات کا راستہ اپنا لیا جاتا تو خواہ خواہ احساس زیاں تو نہ ہوتا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اسم با اسمی ہو میں ہی قدروان نہ تھا میرے پہلو میں حسین الاؤ دیکھتا

مخد کے مارے لباس بدل کیوں دیا، سارے راستے تو میں اسی بات کو سوچ کر کھول رہا تھا مگر تم کیا حکایت سنار ہی ہو میری سمجھ سے باہر ہے۔“

بابر امین کے ہاتھوں کی گرمی سے وہ پھل رہی تھی، تو لفظوں کی گرمی نے اسے مزید تڑپا دیا کیوں وہ اس کا دیکھنا نہ دیکھ پائی، کیوں وہ اپنی بے قدری پر گھٹنوں سلتی رہی تھی، جبکہ مقابل کا دل اس کے لفظوں میں ہی نہیں اس کے لمس میں بھی دھڑک رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ بانو ایسا کے وہ الفاظ تھے جو انہوں نے شادی کی پہلی دعوت میں اسے تیار کرتے وقت کہے تھے۔

”یہی! ہمیشہ مجھے سنورنے میں میانہ روی کا مظاہرہ کرنا، بابر کو اگر کج دمج سے چڑھے تو حد درجہ سادگی سے بھی تپ جاتا ہے اور موقع مناسبت سے تیار ہونے پر یکسر دینے لگتا ہے۔“

وہ تو اس میانہ روی کی تشریح کرنے میں ہی لپکان ہو گئی تھی۔ کئی موقعوں پر تو دل چاہتے ہوئے بھی اس نے سادگی کو اپنا لیا، تو کبھی دل کی مرضی کے بناء خوب خوبیاں بھی کی مگر ہر بار نتیجہ بابر کی بے رخی کی صورت ہی نکلا، وہ منہ سے بات نہ کرتا تو نگاہ اٹھانے کی زحمت بھی کم ہی کرتا تھا۔

”بابر! آپ میرے لیے ایک پھیلی بن گئے ہیں جو بوجھتی ہوں غلطی نکلتا ہے میں آپ کو کب جان پاؤں گی؟“

کتنا وفربل لگا تھا اس کے لیوں سے اپنا نام بابر تو ابتداء کے کلام سے ہی خود میں نہ رہا تھا۔ کار کو دھیرے سے اپنی ڈگر پر ڈالتے ہوئے اس نے چند لمبے خاموشی کے گزارے مدہوش ٹکٹن خاموشی، خاموشی کی بھی کتنی تھیں ہیں؟ ایک خاموشی وہ تھی جو سفر کے آغاز میں دونوں فریقین کے مابین تھی جس میں بدگمانیوں کی تاریخ رقم تھی تو ایک خاموشی اب بھی جس میں دھڑکنیں بے ترتیب اور قیمتی لمحات

ہونے کا خوف لیے نہ سینے میں دھڑکتے دل کی سی  
نہ پہلو میں مہکتے گل کی۔

☆.....☆

اسلام آباد کی سرد تازہ ہواؤں نے ماحول کو  
مسطح کر دیا۔ موسم کا اثر تھا۔ منزل پر پہنچنے کی تسلی یا  
بدگمانیوں کی گرد چھٹنے پر مطلع ذہن و دل مصحف  
ہونے کا اعجاز تھا کہ بابر امین اور یسر علی امین کے  
مزاج میں شوقی درآئی تھی تو یوں پر ٹکھٹھلا بیٹھیں  
گئی تھیں۔

”بانو اپنا سے ایک سوال ضرور کروں گی کہ  
انہوں نے آپ کا اتنا ہیبت ناک تصور کیوں پیش  
کیا؟“

یسر علی کی چکار دیکھنے لائق تھی۔ بار وفا سے  
ایک دم قریب آ جاتی بار حیا سے ایک دم خود میں  
سمٹ جاتی بابر کے لیے اس کی ہر ادا دیوانہ کر دینے  
والی تھی۔

”بانو بھائی کا اس میں قطعاً کوئی تصور نہیں  
انہوں نے تو صرف نقشہ پیش کیا اب ہم بے  
وقوفوں نے کیا تصور بنایا اس میں ان کا کیا  
دوش۔“

بابر کے بے وقوف کہنے کی اصطلاح نے  
دونوں کو ہی تہمتہ کھیرنے پر مجبور کر دیا۔ بابر نے  
اس کے ہتے موتیوں جیسے دانتوں کو انگلیوں کی  
پوروں سے چھوا تھا تو بابر کے چوڑے ماتھے پر  
بھمرے بالوں کی بلف کو یسر علی نے اپنی لائی  
انگلیوں سے میٹا تھا۔

سفر واقعی دلکش ہوتے نہیں بنائے جاتے ہیں  
جس سفر کی طوالت پر دونوں شکوہ کناں تھے اب  
اس سفر کے اختتام پر دونوں زہنگی کے طویل مگر  
سہانے سفر میں ایک دوسرے کے لیے دلچسپ  
مسافر کھلانے کے لیے دل و جان سے حاضر تھے۔

☆.....☆

تھا اور سینے میں دل چلتا تھا اور میں محض دماغ کی  
فضول سوچوں میں الجھا رہا۔“

بابر امین کی یہ خوبی اس پر شدت سے عیاں  
ہوئی تھی کہ وہ ہم جیسی خصلت کا مالک نہیں تھا اپنے  
قصور تسلیم کرنے میں اسے عار نہ تھی اور ایسی  
فطرت پر نگار ہونے کے لیے وہ بھی تیار تھی۔ یہی  
وجہ تھی کہ اب کے بابر کے اسٹیزر جگ پر رکھے ہاتھ  
بر اس نے نرمی کے ساتھ گرفت کی تھی بابر کا جوابی  
عمل اس کی سوچ کے خلاف تھا شاید دیکھتے الاؤ  
سے بچنا اب اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ کار کی  
رفتار کم نہ ہوتی تو اس لطیف شرارت کے اثرات  
تکلیف بھی مرتب ہو سکتے تھے یسر علی پہلے غصے  
کی تواب حیا کی شدت سے خاموش تھی۔

”یسر علی تو صرف اپنی ہی نہیں میری بھی زہنگی  
چے گی تیرے ہر عمل سے تم دونوں کی گزرتی مٹاؤ  
ہوگی۔ بابر کب شعلہ کب شبنم بن جائے پتہ ہی  
نہیں چلا۔“

بانو اپنا کی نصیحتیں کسی اڈھے کی طرح اس نے  
خود پر سوار کر لیں۔ تین ماہ تک اپنے ہر عمل کے  
جواب میں شعلہ فٹانی کے خوف نے اسے بابر کے  
شبنمی جذبات سے کوسوں دور کر دیا۔

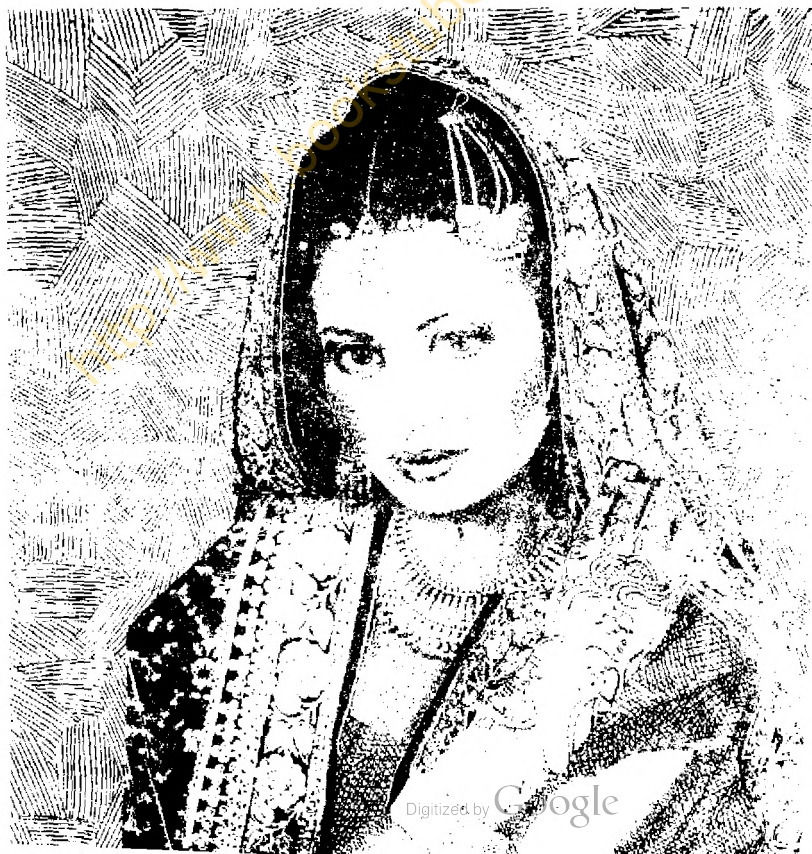
کار میں سوار ہونے سے قبل وہ درود پاک کا  
درد کرتی خود کو ہر غیر ضروری حرکت، بات سے دور  
رکھتی جانے کیوں اسے ڈر لکھتا سمجھ بیٹھی تھی کتنی  
حلاوت تھی اس کی گفتگو میں اور کتنی لگاؤ تھی اس  
کے بار بار خود سے لگانے میں۔ شعلہ تھا اس کے  
اندر جذبات کا جس نے اس کے وجود میں  
ہزاروں شمعیں روشن کر دی تھیں۔

دوسری طرف بابر اس گلاب کو پتھر سمجھ کر اکتور  
کرنے کی غلطی بر سخت پشیمان تھا۔ اصل تصور وار تو  
وہ خود تھا اگر وہ پتھر تھی بھی تو بھی اسے گلاب بنانے  
کی سعی کیوں نہ کی، کیوں جذبات کے بے مول



## مشرق کی شہزادی

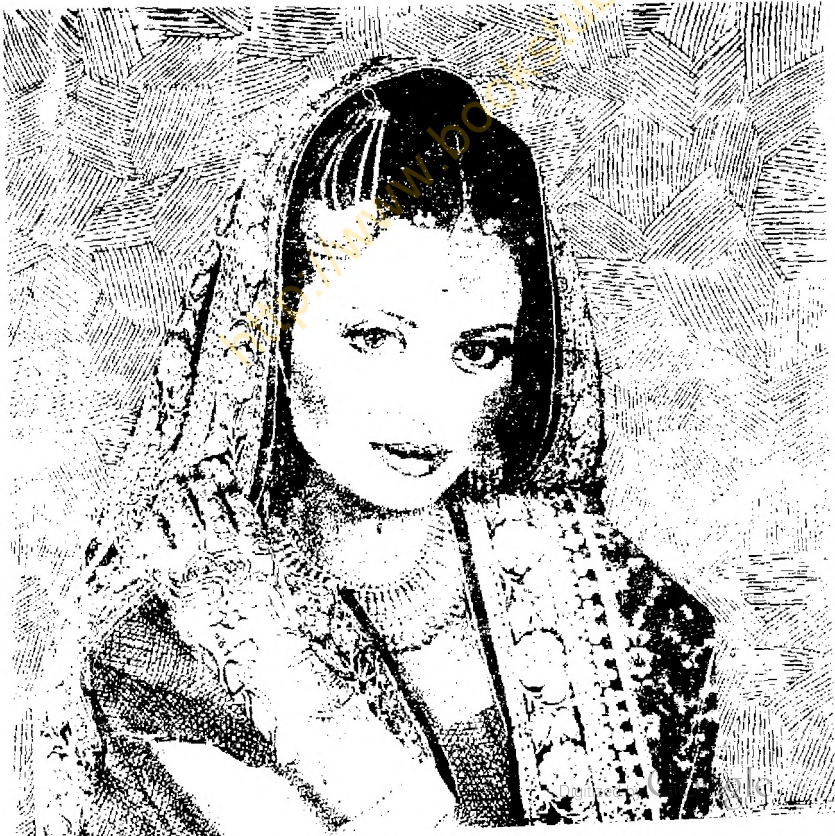
وہ مسکرا دی اور چپکے سے ایک کنگرچ تالاب میں پھینک دیا۔  
غراب کی آواز کے ساتھ ہی تالاب میں صُور بن گیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح لطف لیتی دیر تک مسکراتی



رہی۔ وہ نکلر وقتے وقتے سے بھیجی رہی۔ وہاں کی تنہائی میں نکلر کی آواز دور تک پہنچتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔  
 افراتیم درخت کی اوٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ بچوں کی سی دالہانہ و معصوم مسکراہٹ وہ بہت انمول لڑکی  
 تھی۔

”پر یوں کی ملکہ۔“ دھیما لہجہ و بھاری مردانہ آواز۔ اس تنہائی میں اس کی سماعتوں تک پہنچا تو وہ چونک  
 گئی۔ اس نے اپنے بائیں طرف ایک دراز قد و اسٹ شرٹ و بلیک پینٹ میں لبوس و جیہہ سے شخص کو کھڑے  
 دیکھا۔ جس کے گلے میں کمرہ لنگ رہا تھا۔

بالکل مناسب کتنا اچھا نام دیا ہے میرے ذہن نے آپ کو دیکھ کر۔“ وہ سامنے جمیل پر نظریں جمائے  
 بے خودی میں بولا تھا۔  
 زمر حیران تھی۔ ایک اجنبی شخص اس سے یوں مخاطب تھا گویا ان کے درمیان برسوں کی آشنائی ہو۔



”بعض اوقات ہمیں من چاہا مل جاتا ہے۔ مکمل بغیر کسی کی پیشی کے مگر صد افسوس کے دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس دن باغیچے میں آپ کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ میں تو بہر حال محبتوں کا سیر فحش ہوں، کوئی بھی محبت سے مکر فحش آپ کو دیکھ لے تو پہلی نظر میں عبت کر بیٹھے گا۔ میری کوئین آف ہارٹ مجھے ملی بھی تو بد رنامی خوش قسمت شخص کی ہو چکی۔ بہت سی لڑکیوں سے میری دوستی ہے۔ کچھ یہ بیک وقت کئی سو کے گرل فرینڈ ہیں میں بھی ان سے فٹ کر لیتا ہوں مگر مجھے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جسے دیکھ کر میرا دل کہے ہاں یہ مکمل ہے۔ حسن..... پاکیزگی..... معصومیت..... نزاکت جس میں یہ تمام گر پائے جاتے ہوں، وہی میرے دل کی ملکہ (کوئین آف ہارٹ) ہوگی۔ قسمت کو شاید آپ سے ملوانا تھا۔ اسی لیے میرا یہاں کام بڑھتا چلا گیا۔ جس دن سے آپ کو دیکھا ہے کئی بار حوٹلی کے آس پاس چکر لگا چکا ہوں کہ شاید آپ کی ایک جھلک نظر آجائے اور آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔ لگن بھی ہو تو راستے خود ہی ہموار ہو جاتے ہیں۔“ کانی باتوں کی فحش تھا اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

آپ بھی کیا سوچ رہی ہوں گی کیسا سر پھر ا فحش ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی دل کی باتیں کہہ گیا۔ مجھے افراہیم کہتے ہیں اور آپ؟“ اس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا اور چہرہ اٹھا کر خود سے ذرا فاصلے پر اونچے پتھر پر بیٹھی حسین سی نازک لڑکی کو دیکھا۔

زمر د عجب شکش میں مبتلا تھی اس کی طبیعت اس قسم کی تھی کہ وہ اجنبیوں سے عموماً جلد بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔

”گھبرائیے نہیں، آپ کو بدر صاحب سے پھینچنے نہیں آیا، بے ضرر سا فحش ہوں، سوائے باتوں کے کچھ نہیں کر سکتا۔ میری طبیعت بہت سادہ ہے آپ سے دوستی کر کے مجھے اچھا لگے گا۔“ اس کا سادہ لہجہ اس کی سچائی کا غماز تھا۔

”زمر..... زمر ذلیل احمد۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اپنی جگہ سے اٹھی۔  
 ”ارے، آپ تو جانے لگیں، ابھی تو میں نے جی بھر کے باتیں کرنی تھیں آپ سے۔“ افراہیم حیرت سے کہتا کھڑا ہو گیا۔

”سوری مجھے جانا ہوگا۔ کانی دیر ہوگئی ہے۔“ وہ جانے کے لیے مڑی۔  
 ”اتنا تو بتانی چاہیں! اگلی ملاقات کب ہوگی۔ میں منتظر رہوں گا؟“ افراہیم نے خود سے دور ہوتی زمر د کی پشت کو تھمتے اوپنی آواز سے ہانک لگائی۔ زمر د کے قدموں کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ اس کی طرف سے جواب نہ پا کر افراہیم نے سر پر ہاتھ مارا تھا۔

☆.....☆

لکڑیاں ساری کٹ چکی تھیں۔

”اب ان کا کیا کریں گی یہ عورتیں؟“ زمر د نے زہرہ سے پوچھا جو ان سب کو پانی پلا رہی تھی۔  
 ”ان کو باغچہ کرکھڑیوں کی صورت کمر پر لا کر سرخ مکھن لے کر جائیں گی۔“ زہرہ اس کو جواب دے کر اپنے کام پر لگ گئی۔  
 کچھ ہی دیر میں ساری عورتیں اپنا کام مکمل کر کے چلی گئیں۔ زہرہ اور زمر د نے بھی قدم آگے بڑھائے۔

”بی بی جی!“ زہرہ چلے چلے رک گئی۔  
 ”اچھا ہے صاحب! آگئے۔“ زہرہ کی بات پر اس نے سامنے دیکھا۔ درختوں کی اوٹ سے نظر آتی تھی  
 سڑک پر سیاہ پراڈور کی کھی۔  
 موٹر بوڈ شاٹلار سا بدر آنکھوں پر سیاہ کاغذ چڑھائے گاڑی سے اتر کر تیز قدموں سے ان کی طرف  
 آ رہا تھا۔  
 ”بدر!.....!“ زمر دیر برب بڑبڑاتی۔ دل کی دھڑکنیں رکتی چھوٹتی ہوئی تھیں۔  
 ”سلام صاحب جی۔“ زہرہ ہاتھ بائیں بائیں کھڑی تھی۔ وہ کچھ قافلے پر تھا کہ اس نے سلام  
 جھاڑا۔

”میرے دل کے چین میرے دل کے مالک میرے دل کے دھڑکنے کے سبب خوش آمدید۔ تمہاری  
 راہ تھکتے تھکتے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہونے لگی تھی۔ تمہیں دیکھ کر پھر سے جی اٹھی ہوں۔ اے میرے  
 چین و سکون، میرے دل کے شہزادے خوش آمدید۔“ زمر کی پیاسی نگاہیں اسے سختی دل ہی دل میں اس  
 سے مخاطب تھیں۔ اس کا بنیدہ چہرہ، پھر ملے تاثرات اور چال کی تیزی نے زہرہ کو ٹھکانا دیا۔  
 ”یا اللہ خیر! اس نے خشک حلق کو تھوک نکل کر تر کیا۔ جب کہ زمر دہر بات ہر احساس سے عاری، بے  
 نیازی اس شاندار سے شخص کو اپنی طرف آتا دیکھتی رہی۔  
 زمر نے کچھ کہنے کو لب دا کیے ہی تھے کہ بدر کے مضبوط ہاتھ کا تھپڑ اس کا چہرہ جھلسا گیا۔ وہ لڑکھڑاکر  
 اچانک اس افتاد پر اپنے پیچھے ایستادہ مضبوط درخت کے تنے سے ٹکرانی تھی۔  
 زہرہ نے خوف زدہ انداز میں بدر کی سمت دیکھا۔

”یہ کچھ سننا، دیکھنا نہیں چاہتی، اپنی آنکھ اور کان بند کر رکھے ہیں مگر تم تو کھلے رک سکتی ہو، چوبیس گھنٹے  
 اس کے ساتھ چپکی رہتی ہو مگر اس کو یہاں کے طور طریقے نہیں سمجھا سکتی تم سب کے سب نمک حرام ہو، کسی  
 کام کے نہیں۔“ اس کا لوجہ امانت آمیز اور زبان انگارے برسا رہی تھی۔  
 زہرہ کی ساری شوخی و طراری عائب ہو چکی تھی وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سر اٹھا کر بدر کی سمت دیکھنے کی  
 طاقت تک نہ تھی اس میں۔

”تم!.....“ اب کے وہ درخت کے تنے سے لپٹی چمکیوں سے روتی زمر کی سمت مڑا، وہ بے چاری اپنا  
 قصور تک نہیں جانتی تھی۔  
 ”چلو میرے ساتھ، بے حیا لڑکی۔“ اس کی پیشانی کے زخم سے بے نیاز وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے  
 ہوئے گاڑی تک لایا تھا۔

زہرہ کی آنسوؤں سے بھری لبالب آنکھیں، اس اذیت سہتی نرم و نازک سی لڑکی پر جمی تھیں۔

☆.....☆

ماں جی..... ماں جی.....“ وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے حویلی کے کشادہ صحن تک لایا تھا اور  
 دھاڑتے ہوئے ساجدہ جہاں کو پکار رہا تھا۔

”الٹی خیر!“ ساجدہ جہاں افتان و خیزہ میڑھیاں اتر کر نیچے آئیں تھیں۔ حویلی کی ساری ملازما تھیں،  
 کھونوں کھدروں سے جمائی تھر تھر کا ہتھی، بدر غفار کا خوشخوار انداز اور نئی نویلی نازک سی دھن کی اتر حالت

دیکھ رہی تھیں۔

”سننا لیے اس بے حیا لڑک کو، اسے آوارہ گردی کی لت ہو گئی مگر یہ شہر نہیں گاؤں ہے۔ ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے نانی چوڑیاں پہن رکھی ہیں کہ جو اس کا دل چاہے یہ کرتی پھرے اور ہم خاموش تماشا کی بنے رہیں۔“ اس نے زمر کو ساجدہ جہاں کے قدموں میں پنچا تھا۔

وہ زمین پر گر گئی پتھریوں کے ساتھ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس میں سر اٹھا کر اپنا تماشا دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

ساجدہ جہاں کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا مگر بیٹے کی موجودگی سے سنجیدہ و پریشان سی صورت لیے کھڑی رہیں۔

زہرہ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ حیرت زدہ سی سرخ عمل پہنچی تھی۔ اس نے جو یہ منظر دیکھا تو ساکت رہ گئی۔

حوالی کی خواہش کا آج تک کسی نے ایک بال تک نہیں دیکھا۔ یہ آج اس حلیے میں بغیر چادر کے گھر سے نکلی ہے اور اسے کوئی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ یہاں ایسی باتوں پر قہر ہو جاتے ہیں۔ خاندان کے خاندان آپس میں لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ آج کتنے لوگوں کی بے باک نظریں اس کی سمت اٹھی ہوں گی۔ ملک غفار کے خاندان کی عورتوں کے لیے باغی شرم بات ہے بلکہ مر جانے کا مقام، ماں جی یہ آپ کے حکم پر گھر سے نکلی تھی۔ کم از کم ایک چادر ہی اسے آپ مہیا کر دیتیں۔ آج کے بعد اگر یہ اس حلیے میں گھر سے نکلی تو بچنی بھی گولیاں میرے رویو اور میں ہیں، وہ تمام اس کے سینے میں اتار دوں گا۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ آگ برسا کر دھپ دھپ کرنا مضبوط قدموں سے بیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

”ساری عمر اس کی ماں نے میری زندگی مذاپ کیے رکھی، اب یہ میرے بیٹے کی زندگی جہنم بنانے آگئی ہے۔“ ساجدہ جہاں نے حقارت سے کہہ کر ایک سنگینی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”بی بی جی!“ زہرہ بھاگ کر اس کے پاس آئی اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔

”زہرہ! اتنی تذلیل! میں مریوں نہیں مگنی۔ بد نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔“ اس کا درد کی زیادتی سے پھٹنا لہجہ زہرہ کا دل چھیر گیا۔

”ہمت سے کام لیں بی بی جی!“ اس نے آگے بڑھ کر روتی ہوئی زمر کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔

کتنی اکیلی اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ ”اسے بی بی جی پر بہت رحم آیا تھا۔“

”جاؤ اپنا کام کرو تم لوگ۔ یہاں کوئی تماشا نہیں لگا جس کا تم لوگ نظارہ کر رہی ہو۔“ زہرہ کی ڈانٹ پر وہ سب اپنی اپنی جگہ روانہ ہو گئی تھیں۔

”رو میں نہیں۔ میں آپ کا زخم صاف کرتی ہوں۔ کافی خون جم گیا ہے۔ دودھ میں ہلدی ملا کر پلاؤں گی تو سارا درد دور ہو جائے گا اٹھیں۔“ زہرہ نے اسے کھلی دے کر سہارا دیا اور اٹھنے میں مدد دی۔

”کون کون سے درد دور کرو گی میرے۔“ اس نے اذیت سے سوچا تھا۔

زہرہ کو اپنی جس بی بی جی پر رشک آتا تھا۔ اس لمحے بے پناہ ترس آ رہا تھا۔

☆.....☆

چاکلیٹی کلر کا شب خرابی کا لباس زیب تن کیے وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑکی میں کھڑی کسی ساکت مجھے



کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

پیشانی پر زخم کا نشان، لبوں پر چب کا قفل لگائے، متورم کانچ سی نیلی روئی روئی آنکھیں، اس کی حالت قاطبی رحم ہی۔ غسل سے فارغ ہو کر سر گڑھتے بدر کی نگاہ اس پر پڑی تو ایک پل کو ٹھٹھک گیا تھا۔

”چھوٹی سے چھوٹی بات پر میری ماں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھنے والا میرا شاعر اور پڑھا لکھا باپ، نمک کم یا تیز ہو جانے جیسی ادنیٰ سی بات پر میری ماں پر گرفت کرتا مگر ماں جی نے کبھی اف نہ کیا۔ ان کے ماتھے پر بھی بابا کے لیے ایک فکس تک نہ ابھری، ایک یہ محترمہ ہے ہونہہ! اتنی بڑی غلطی پر صرف تھپڑ لگا دیا۔ اب ایک سال تک سوگ مناتی رہے گی۔ ان عورتوں کے یہ نام نہاد فریب (مکر)۔“ وہ بالوں کو اتنی سخت سے رگڑنے لگا دیا وہاں زمر دبی ہو۔

”بدر! میں ان سب چیزوں کی عادی نہیں۔“ اس کی آواز اگرچہ بہت دھیمی تھی مگر بدر نے بخوبی سن لی تھی۔

”یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ میں نے نہ مگن پوائنٹ پر تم سے نکاح پڑھوایا تھا اور نہ ہی تمہاری منت کی تھی کہ پلیز مجھے اپنا لوتو تمہارے بغیر مر جاؤں گا میں ہونہہ۔“ اس نے بالوں میں برش پھیر کر سنگار میز پر بٹھا اور ترش روئی سے گویا ہوا۔

”پلیز بدر! میری اتنی انسلٹ مت کرو۔ بہت محبت کرتی ہوں تم سے۔“ حسین ٹھنکین سی اس نے اپنی کانچ سی نیلی آنکھیں کھڑکی سے باہر نظر آتے کھیتوں، پگڈنڈیوں کے وسیع سلسلے پر سے ہٹا کر اپنے دل میں بے شمار ادے کی حقیقی شبیہ پر بھائی، لہجہ بھرایا ہوا اور فکست خوردہ سا تھا۔

”مگر مجھے تم سے رتی برابر محبت نہیں، جانتی ہو کیوں؟ کیوں کہ میں تمہارے حسن اور مصومیت کے پیچھے چھپے کردہ چہرے کو پہچانتا ہوں، مجھے خالی خولی حسن اثر ٹیک نہیں کرتا۔“ اس کے تصور کے پردے پر زمر داوڑ آکاش کی اکٹھی شبیہ لہرائی اور وہ خاک ہو گیا۔

”تم اس گھر میں صرف میری ماں کی خواہش پر ہو۔ ان کا طرف بہت وسیع ہے۔ جس عورت نے انہیں ہمیشہ آنسو دیے، وہ انہی کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لائیں۔“ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا اور اس کی کلائی دبوچ کر کئی جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔

”مجھے سے تمہیں کبھی کوئی سکھ نہیں مل سکے گا۔ اب یہ آنسو اور پچھتاوے ہی تمہارا مقدر ہیں۔ میری ایک نگاہ التفات کو ترس جاؤ گی مگر میں تم پر نفرت بھری نگاہ ڈالنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں۔“ ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑ کر بدر نے انکارے چبائے تھے۔

اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

زمر دای طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ کانچ کے کھنڈرے لبالب آنسوؤں سے بھرے تھے۔ ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

وہ کبل اوڑھے، لائٹ آف کیے جانے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمر کی ٹانگوں میں حرید کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تو وہ دیوار سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر بچکیوں سے روکنے لگی۔

”خاموش۔“ وہ دھمازا زمر دانی جگہ سے اچلی تھی۔

”کس کا سوگ منا رہی ہو۔ خاموش نہیں ہو سکتی تو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اب اگر میری نیند خراب کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ زمر نے اپنی خود ساختہ چیخوں کا گلا گھونٹا تھا۔ منہ پر سختی سے ہاتھ جمائے وہ سک رہی تھی۔

☆.....☆

”ہماری خوش بختی کہ میڈم آسره نے صبح صبح ہمیں یاد کیا، زہرے نصیب، کبھی ہیں؟“ وہ جو دارڈروب سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔ بدر کی خوش باشی آواز اس کی ساعتوں سے نکلائی۔ سرخ شلوار سوٹ میں نکھرا سترا خوشبو میں نکھیرتا وہ شاندار سا شخص اس کی ایک مسکراہٹ مقابل کو چاروں شانے چت کر دیتی، وہ ساحر تھا، جس کی ایک جادو بھری نگاہ کسی کو بھی اپنے دام میں گرفتار کر لیتی تھی۔

”میرا ہو کر بھی مجھ سے کتنا بدگمان ہے۔“ زمر نے باتوں میں مگن اس کی ذات کو یکسر فراموش کیے فون پر جو گفتگو بدر کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

”آج دوپہر تک مجھے اسلام آباد کے لیے نکلتا ہے، ماں جی سے ملنے آیا تھا۔“ وہ مقابل کی بات سننے کو رکا۔

”ہوں شارق زیدی سے ہمارا کنٹریکٹ ڈیل ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں اہم میٹنگز ہوں گی۔ کوشش کروں گا آپ کی برتھ ڈے پارٹی میں آنے کی دوثق سے نہیں کہہ سکتا۔“

مقابل نے جانے کیا کہا تھا کہ وہ مسکرایا، وہی مخصوص پرکشش مسکراہٹ۔

”یہ تو خالص خواتین کا شعبہ ہے۔ خیر آپ اتنا ہی اصرار کر رہی ہیں تو کچھ دیر کو ٹائم نکال کر آ جاؤں گا۔“

زمر دے حریف سننے کی طاقت نہ رہی تو وہ ہاتھ روم میں لمس لیتی تھی۔

☆.....☆

”آتا گوندہ کر دو پہر کے لیے سالن بنا لیتا، پروین تہیاری مدد کر دے گی، تم اس گھر کی بڑی اور اکلوتی بہو ہو، بچپنا چھوڑا اور گرہستی سنبھالو۔“ وہ ہدایات دے کر چلی گئیں۔

زہرہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے آتا خود ہی گوندھا۔ ساتھ ساتھ لازم عورتوں سے بھی ہدایات لے رہی تھی۔

زہرہ نے سالن کے لیے جلدی جلدی سبزی کاٹی اور آگ جلا کر دیکچہ چولہے پر رکھا۔ زہرہ اسے بتاتی جاتی اور وہ کھانا پکاتی رہی۔ سالن بہت حرے کا بنا تھا۔ زمر دیکچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی کہ ساجدہ جہاں خوش ہوں گی، اس کو شاباشی دیں گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ انہوں نے کھانا کھایا، بغیر اچھے یا برے تاثر کے انہوں نے نماز پڑھی اور کچھ دیر کو سو گئیں۔

وہ برتن اکٹھے کر کے دھوئے کارادہ کر رہی تھی مگر کسی نے اسے حریف کام نہیں کرنے دیا۔ وہاں سب کو ہی اس سے محبت اور ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو بدتر تیار کھڑا تھا۔ گانگڑ پہن کر ریست واج پہنی، بال بنائے، موبائل، والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھا کر برف کیس اٹھایا۔

”آپ کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟“ زمر کی آواز پر اس کے دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

”میں نے تمہیں یہ حق نہیں دیا کہ میرے معمولات میں دخل دو، ماں جی کی وجہ سے تم سرخ محل کا حصہ ہو، جب تک ان کا حکم مانو گی۔ یہاں تمہارے لیے جگہ ہوگی۔ جس دن ان کی حکم عدولی کی وہ تمہارا آخری دن ہوگا۔ دھکے دے کر یہاں سے نکالی جاؤ گی یا درکھنا اور اپنی اوقات بچانا۔“ وہ پلٹا اور شعلے برسائے۔

”میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی۔ آکاش نے کہا تھا ملنے کے لیے آنے کو، سب مجھے بہت یاد کرتے ہیں، دادی، مبی، پاپا اور میں بھی انہیں بہت یاد کرتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

”اوہ..... تو یہ مسٹر آکاش کے دل کی خواہش تھی جو تمہارے لیوں پر آگئی اور تم نے سب کو اس میں کھینٹ لیا۔ ویری اسٹریچ۔“ وہ استہزائیہ ہنسا۔

”تمہاری تان آکاش سے شروع ہو کر آکاش پر ہی ختم ہوتی ہے۔ ایک بات تو بتاؤ تم دونوں کو ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت تھی، تو شادی کیوں نہیں کی۔ مجھے کیوں ڈھال بنایا۔ بظاہر اس میں کوئی رکاوٹ بھی نظر نہیں آتی۔“ بدر کی ہنسی ہوئی نظریں، زمرہ کے جھکے چہرے پر جمی تھیں۔

”پلیز بدر!“ اس نے درد کی شدت سے بلبلاتا کر جھکے سے سراٹھایا تھا۔ آنسو بھری کانچ سی آنکھوں میں الجھا تھی۔

”کیوں تکلیف محسوس ہوئی ناں؟ ایسی ہی تکلیف مجھے بھی ہوتی ہے۔ جب تمہیں اور آکاش کو ایک ساتھ سوچتا ہوں میرے دماغ کی شریان پھٹنے لگتی ہے۔ تم لوگوں نے میری انا کو کچلا ہے۔ میری مردانگی کی تذلیل کی ہے۔ میرا مذاق اڑایا ہے۔ بسک بسک کر ماروں گا تمہیں۔ تمہارا عاشق، وہ جب جب تمہیں تڑپا دیکھے گا۔ موت کی آرزو کرے گا کہ موت بھی اسے نہیں بخشے گی۔“ غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سرخ اور نیس ابھرا آئیں تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں بدر! میں..... بدر نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”بس۔“ اس کی دھاڑ پر وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

”بس کوئی وضاحت نہیں، نہ اندھا ہوں اور نہ ہی بہرہ، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔ حریف ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں پیش نہیں کرنا۔ آج تم نے اتنی ہمت دکھائی اور میرا راستہ روکا، آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ حشر کروں گا کہ اسے سائے سے بھی پناہ مانگوں گی گھٹیا عورت۔“ وہ نفرت سے زمین پر گرتی تھوکتا دھاڑ سے دروازہ اپنے پیچھے بند کرنا کمرے سے نکلتا تھا۔

وہ زمین پر گر کر دوڑا تو بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر زور رہی تھی۔

”تمہارا عاشق..... گھٹیا عورت.....“ ان ہی الفاظ کی نفرت بھری بازگشت ہار بار اس کی سماعتوں کو چھیڑ رہی تھی۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا پگھلا ہوا سپسہ کوئی اس کی سماعتوں میں اٹھیل رہا ہو۔ وہ سوائے درد کی شدت سے چیخنے چلانے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی ہر سواذ بیت تھی۔

”آکاش! تم ٹھیک تھے۔ صحیح کہتے تھے۔ میں ہی غلط تھی۔ میں نے چپکٹی شے کو سونا سمجھ لیا تھا۔ میری جیسی حکمرانوں کی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے جیسا میری سزا ہے۔“ زہرہ جو دروازہ بجائے کو ہاتھ اٹھا رہی تھی زمرہ کی آواز سی سن کر تیزی سے دروازہ کھولتی اندر آئی تھی۔

وہ بے چاری حیران و پریشان سی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتی پکارنے لگی۔ دوسرے ہاتھ میں

کارڈ لیس پکڑا تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں بی بی جی!“ وہ صحیح معنوں میں پریشانی ہو گئی تھی۔

زمر داسی طرح آکاش کو مخاطب کرتی روٹی رہی۔

”صاحب ان کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ بعد میں فون کر لیں۔“ اس نے کارڈ لیس کان سے لگا کر آکاش کو مخاطب کیا۔

وہ سارا کچھ سن رہا تھا۔ زمر دکاروٹا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔

”بدر کہاں ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”صاحب تو ابھی ابھی اسلام آباد کے لیے نکلے ہیں۔“ زہرہ کی بات پر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہہ تک پہنچا تھا۔

اس نے فون بند کر دیا۔

”بدر غفار! چھوڑو انہیں تمہیں، تم نہیں جانتے کس کو تکلیف دی ہے تم نے۔ نام نہاد غیرت کے مارے اپنے غرور میں مست انسان تلف ہے تم پر۔“ وہ نفرت اور غصے کی زیادتی سے انگلیاں مروڑتا کرے میں ادھر سے ادھر نکل کر اس کے پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔

☆.....☆

”اسنے شاعر اور امیر کبیر شخص کی بیوی ہیں آپ، اوپر سے بے تحاشا حسن کی مالک اور ہیرے جواہرات پہنے ہوتی ہیں۔ حیرت ہے بھی آپ کو کسی قسم کے پروٹوکول میں نہیں دیکھا۔ سوائے اس یاگل زہرہ کے، جو ہر وقت آپ سے جھٹی ہوتی ہے۔“ افرایم نے مہندی لکھ کے سادہ سوٹ اور سیاہ رنگین کڑھالی کی چادر میں ملبوس سوگوار حسین سی زمرہ کو دیکھا۔ زہرہ کچھ فاصلے پر درخت سے مائلے توڑ کر کھا رہی تھی۔

اسی سے میں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئیں کہ مجھے میری ”کوئین آف ہارٹ۔“ (دل کی ملکہ) مل گئی۔ وہ مجھے لڑکیاں دکھائیں اور میں کسی خانی کسی کی کے سبب انکار کرویتا۔ وہ میری اس عادت سے بہت بے زار تھیں۔ آپ کے بارے میں جان کر ان کو حقیقتاً بہت خوشی ہوئی۔ ملنے کے لیے بے تاب ہوئیں۔ تو میں نے آپ کی شادی کا بتایا تو بہت افسردہ ہوئیں۔ کافی رنج ہوا تھا ان کو، میں نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ میری نہیں ہو سکتی تو کیا ہوا مجھے مل تو گئی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا۔ میری ساری زندگی کی تلاش ختم ہو گئی۔ دیکھا، بات کی، پھر مل لیا۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔“ وہ واقعی صاف گو اور نیک انسان تھا۔

زمر داسے خاموشی سے سنتی رہی۔ زہرہ اسے باہر لائی تھی کہ شاید اس کی طبیعت کا بوجھل پن کچھ کم ہو جائے اتفاقاً افرایم سے ملاقات ہو گئی۔

”مجھے آج گھر جانا ہے کچھ دنوں تک واپسی ہوگی۔ آکر آپ سے معلومات بھی لیتی ہیں تب تک آپ یہاں سے کافی حد تک واقف ہو جائیں گی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے اور درمیں میں قبول ہو گئی۔“ وہ جانے کے خیال سے اداسی سے مسکرا رہا تھا۔

باقی سارا وقت وہ بولتا رہا زمرہ خاموشی سے سنتی رہی۔

☆.....☆

بدر آفس پہنچ کر فائلز دیکھ رہا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر آکاش کے آنے کی اطلاع دی اس نے آنے کی اجازت دے دی۔

وہ دروازے پر دستک دے کر اس کے شاعر سے آفس میں داخل ہوا تھا۔

”آسکتا ہوں؟“ اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

”تشریف رکھیے۔“ بدر نے بھی اسی کے انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ سلام دعا کا تکلف دونوں میں سے کسی نے نہیں برتا۔

”میں نے سرخ محل فون کیا تھا۔ زمر نے مجھ سے بات نہیں کی۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جو وہ یوں شدت سے رو رہی تھی؟“ بیٹھے کے بعد آکاش نے سنجیدگی سے ریوالونگ چیز پر بیٹھے شخص کو دیکھتے پوچھا تھا۔

”چوٹ اسے پہنچی اور تکلیف تمہیں ہوئی تھی، واہ..... قدیم محبت ہے۔ ویسے وہ کون سا کبوتر ہے؟ جو اتنی تیزی سے ہر خبر پہنچا دیتا ہے۔“ وہ استہزائیہ بولا تھا۔

آکاش نے کرسی کے دولوں پر تھکے مضبوطی سے تھام کر خود پر ضبط کیا تھا۔

”اس کا قصور کیا ہے آخر۔ کیوں اسے مار چڑ کر رہے ہو؟“ وہ بہت محل سے گویا ہوا۔

”اس کا سب سے بڑا قصور تمہاری یہاں موجودگی ہے۔ کس تعلق سے تم اس کی حمایت کرنے میرے سامنے موجود ہو؟“ بدر اس سے بھی زیادہ تیزی سے بولا تھا۔

”اپنی بات پر غور کرو، غصے میں تم کسی بے گناہ پر بہت سنگین الزام لگا رہے ہو۔“ زمر کا معصوم چہرہ اس کے سامنے لہرایا تو اس کا لہجہ خود بخود شکست خوردہ ہو گیا۔

”محبت تھی تو مجھے درمیان میں لائے بغیر دونوں ایک ہو جاتے، بے خبری میں میرے جذبات کو کیوں غصے پہنچائی؟ میں ایک سچا اور کھرا شخص ہوں۔ تم جیسے بزدل اور دو غلط مرد عورت سے مجھے نفرت ہے۔

ایک مرد کے سامنے اس کی بیوی کی حمایت کرنے والے اور اس کے درد پر بلبلانے والے کو تمہاری ڈکشنری میں کیا کہتے ہیں؟ کس حیثیت سے تم میرے سامنے ہو؟ میں اسے خوش رکھوں یا ناخوش تم کون ہوتے ہو مجھ سے اس کا حساب مانگنے والے؟ اس کے طلب گار تم دونوں میرے جذبات سے کھیلتے رہے، میرے گناہ

گار ہو۔ میرا جی چاہتا ہے تم جیسے گھٹیا اور بزدل لوگوں کو عبرت کا نشان بنا دوں۔ تاکہ آئندہ کوئی کسی کی عزت اور غیرت سے نہ کھیلے۔“ اونچی آواز سے کہتے اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دونوں ہاتھ پیشے کی ٹیبل پر

زور سے مارے تھے۔

”افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“ آکاش اپنی جگہ سے اٹھا۔

”اگر مرد ہونو اقرار کرو، میں نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ ہے، میرے ذہن کا فتور؟“ وہ سچ و تاب کھاتے

ہوئے بولا۔

”وہ سراسر بے قصور ہے۔“ آکاش اتنا ہی کہہ سکا۔

”تو کوئی تم قصور وار ہو؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”ہاں یہ سچ ہے کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں مگر وہ معصوم ہے۔ کورے کاغذ کی طرح خالص،

اس سارے میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ صرف تم سے محبت کرتی ہے۔ حقیقت اور کچھ نہیں۔“ وہ شکست خوردگی سے بولا تھا۔



بدراپنی جگہ سے اٹھ کر آکاش کی سمت آیا تھا اور اسے گریان سے پکڑ لیا۔

”اس اعتراض کو سننے کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں۔ زمر دکنی زندگی جہنم بنا دوں گا۔ ایک ایک دن سک سک کر گزرا رہے گی۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔ اس کی حمایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم دونوں کی ایک دوسرے کے لیے دیوانگی، اندھوں سے بھی پوشیدہ نہیں، میں تو پھر بصارت رکھنے والا ایک غیر مت مند انسان ہوں، رشتوں کے احترام کو سمجھنے والا باضمیر انسان۔“ اس نے آکاش کے گریان کو کئی جھٹکے دے کر چھوڑ دیا تھا۔

”میں بھی تم پر ہاتھ اٹھا سکتا ہوں مگر تم زمر دے شوہر ہو، یہی لحاظ مجھے متحمل رکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے کچھ میں اپنے شرٹ کے بٹن بند کرنا چلے گیا۔

”دفع ہو جاؤ، ایک منٹ کے اندر اندر میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ دھکے دے کر نکلوانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“ وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر غایا بغیرت سے اس کا چہرہ مجلس رہا تھا۔

”ایک دن تمہیں اپنی کہی ہوئی ان باتوں پر افسوس ہوگا۔“ آکاش نے اس خوب صورت سے شخص کی مضبوط پشت کو دکھ سے دیکھا۔ بدر نے مٹھیاں بچھ کر خود پر قابو پایا۔ آکاش جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

اس کے جاتے ہی بدر نے ٹیبل پر موجود ہر شے کو ہاتھوں سے گرا کر تھس تھس کر دیا تھا۔

☆.....☆

”مگر اس کا گناہ کیا ہے اور تم اتنے خستے میں کیوں ہو؟“ ساجدہ جہاں کو بدر نے فون کیا تھا۔

”اس کا گناہ بہت بڑا ہے۔ ایک شخص کی بیوی ہو کر کسی اور کو دل میں بسائے رکھنا، راہ و رسم بڑھانا، ناقابل معافی جرم ہے اور وہ اس کی مرتکب ہو رہی ہے۔ میں ایسی متناقض اور دوغلی عورت کو عبرت ناک انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وعدہ کریں ماں میں! جب تک وہ زندہ ہے میری موجودگی میں یا میری غیر موجودگی میں اس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پہل عذاب بنائے رکھیں گی۔ ایذا یا رگڑ رگڑ کر موت مانگے مگر اس پر ترس نہیں کھائیں گی۔ ایسی عورتوں کا انجام آخر کار کیا ہوتا ہے۔ یہ تمام عالم جان لے۔“ وہ ٹیش کے عالم میں کف اڑاتا بولا اور اپنی بات مکمل کر کے فون کر یڈل پر ختم کر دیا تھا۔

ساجدہ جہاں نے فون بند کر دیا۔ عجیب غم مسم سا انداز تھا۔

وہ تو بہت مصوم دکھتی ہے۔ اتنے دن میں نے اس کے ساتھ کیسا بھی سلوک روا نہ رکھا مگر حیرت ہے کسی سے شکایت تو دور ذرا تک نہیں کیا اور وہ دادی، وہ تو ہر وقت اپنی چچی کو فون کرتی ہیں مگر زمر دے منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی ورنہ اب تک تو بڑھیا زمین و آسمان ایک کر دیتی۔ شاید بدر نے دھمکایا ہو، آخر کو میرا فرمانبردار بیٹا ہے۔ ماں کی برائیاں کیونکر برداشت کرے گا۔“ وہ دیر تک بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں سوچتی رہیں۔

☆.....☆

”میری وجہ سے ایک انسان جاہ ہو رہا ہے۔ مجھے زبردستی اس کی نجی زندگی میں گھسیٹا جا رہا ہے اور آپ کہتی ہیں خاموشی اور درگزر سے کام لوں۔ مجھے اپنی فکر نہیں، اس مصوم لڑکی کا خیال ہے وہ کیوں گناہ گار

قراردی جائے۔ کیوں سزا جھگٹے؟ جب کہ اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ سوری مای اس معاملے میں، میں آپ سے الگدی نہیں کر سکتا۔ میں خاموش نہیں رہوں گا۔“ آکاش نے راحت نیگم سے بات کی تو انہوں نے اپنا موقف سنایا جو اسے کسی طور قبول نہ تھا۔ اسے صرف اور صرف زمر کی فکر تھی۔

”تم اس عورت کو نہیں جانتے، ساری زندگی اس نے اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانا، جو کچھ ٹھان لے کر گزرتی ہے۔ اسے روکنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ بدر کے ذہن میں یہ زہر بھرنے والی بھی اور کوئی نہیں سوائے ساجدہ جہاں کے، تم خود کو اس سب سے دور رکھو، اس معاملے میں خود کو مت گھسیٹو، یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ زمر دمیری بیٹی ہے۔ وہ ہر حال میں اپنا گھر بچائے گی۔ جتنا تم اس معاملے میں دخل دو گے، بات بننے کے بجائے بگڑتی چلی جائے گی۔ شادی کے ابتدائی دو سال میں نے حویلی میں کیسے گزارے ہیں، یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اس عورت نے میری زندگی عذاب بنارکھی تھی۔ اماں بھی اس کی زبان درازی کے آگے خاموش ہو جاتیں۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ صرف غفار بھائی تھے جن سے دقت تھی۔ اللہ کی پکڑ سخت ہوتی ہے، میں نے ہمیشہ اپنا دل صاف رکھا۔ میں نہیں جانتی کہ آخر وہ مجھ سے خدا واسطے کاپر کیوں رکھتی ہے۔ روایتی جھٹانوں والا رویہ کیوں مجھ سے روارکھا حالانکہ میں ہمیشہ ان کی عزت کرتی آئی ہوں۔ ہمیشہ میں نے ان کو بڑی بہنوں والا پہا دیا۔ اس کے باوجود وہ مجھے بخشنے کو تیار نہیں۔ جانے کہاں جا کر ان کی یہ بدمنشی اختتام پذیر ہوگی۔ پہلے میں تھی اب میری بیٹی کو تکلیف دے کر مجھے نشانہ بنا رہی ہیں۔ مجھے زچ کرنا چاہتی ہیں مگر میں کچھ نہیں کہوں گی ہمیشہ کی طرح اب بھی میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا۔“ انہوں نے آکاش کے جذبات کو سرد کرنے کے لیے اتنی طویل گفتگو کی تھی۔

”چاہے آپ کی یہ خاموشی اور مبر زمر کو کسی عظیم نقصان سے دو چار کر دے۔ تب بھی آپ یہی کہیں گی؟“ آکاش نے افسوس سے اپنی بزدل وڈرپوک سی مای کو دیکھا تھا۔

”ہاں کیوں کہ میں کہہ چکی ہوں۔ اس عورت کو روکنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تمہارے ماموں میرے ساتھ نہیں، وہ اپنے بیٹے اور بڑی بھائی پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں اگر کچھ کہوں گی تو یہی سمجھیں گے کہ عام عورتوں کی طرح میں ان کو اپنوں کے خلاف کر رہی ہوں۔ ان کے کان بھر رہی ہوں اور تم جانتے ہو، وہ یہ سب کچھ کتنا پسند کرتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ۔ اللہ پر سارا معاملہ چھوڑنے میں، میں کتنی حق بجانب ہوں۔“ وہ بے چارگی سے بولیں تھیں۔

”ٹھیک ہے جو آپ کی مرضی مگر میں زمر کو اکیلا ہر گز نہیں چھوڑوں گا۔ آپ لوگوں کے لیے یہی بات کہانی ہے کہ وہ سگے چچا کے گھر رہے۔ نہ رابطہ نہ ملاقات، ایسے لگتا ہے آپ لوگوں نے اس کی شادی کر کے اپنی جان چھڑائی ہے۔“ وہ ہر حال میں اپنی بات پر ڈٹ رہا۔

”ان معاملوں کی نزاکت تم نہیں سمجھتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خاموش رہو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

”آپ لوگوں کی خاموشی نے ہی تو یہ دن دکھایا ہے۔ وہ لوگ حریف شہر ہو گئے۔ آپ لوگ اگر زمر کو ایسے نہ چھوڑتے تو وہ اسے یوں اپنی ملکیت نہ سمجھتے۔ وہ لاوارث نہیں۔ آپ لوگ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

راحت نیگم نے خاموشی سے کمرے سے نکلنے میں عافیت پائی۔ آکاش نے بہت افسوس و دکھ سے انہیں جانا دیکھا تھا۔

سیاہ رنگ کا بھروں کو چھوٹا لباس پہنے، ساتھ ہم رنگ جیولری پہنے وہ اداس سی اپنے کمرے کی طرف کھلتے والے تھرس میں کھڑی تھی۔

سیاہ رنگ میں اس کی دودھیارنگت کھڑکھر کر مزید جم جم کرتا نکلا ہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سہرے لہرے دار بال ہوا سے کھیلنے اس کے روپ کو جلا بخشنے رہے تھے۔

معاں نے دیکھا سفید کردا اس رخ مکمل کے پورچ میں آکر رکی تھی۔ وہ ذرا سا ریٹنگ تمام کر چکی، گاڑی سے اترنے شخص کو دیکھ کر اس کی نیلے کانچ سی سکھوڑی آنکھیں، جبرائیلی خوشی سے پوری مکمل کیں۔

اس نے ریٹنگ سے ہاتھ ہٹاتے، دونوں پہلوؤں سے لباس تھا، تیز قدموں سے بھاگتے کمرے سے نکلی، جیزی سے رابڈاری عبور کر کے بیڑھیاں اترنے لگی۔ میکے سے آنے والی ہوا بھی مسرت بخشتی ہے۔ آنے والا تو پھر آکاش تھا۔ طویل بیڑھیاں عبور کر کے وہ جوئی کے کشادہ صحن میں اتری تھی۔ سامنے ہی آکاش نظر آیا۔ مکمل کمرے کے شلواریں میں پشاور کی چہل پہل پہنے کھرا کھرا سا آکاش، وہ بھاگتے ہوئے آکر اس سے لپٹ گئی۔

”آکاش!“ وہ بری طرح سے روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔

”کتنا یاد کیا تم سب کو۔ مجھے بالکل بھول گئے۔ سوائے دادی کے کوئی فون نہیں کرتا۔“ وہ ہچکچوں سے روتے، ٹھوکر کر رہی تھی۔

”تنتی معصوم ہے۔ بدرا خدا بھی تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ آکاش کی آنکھوں میں نمی لہرائی اس نے خود سے لپٹی روئی سستی زبرد کی کمر پر ایک ہاتھ رکھا دوسرا اس کے سہری بالوں والے سر پر رکھ کر تسلی دینے کے اعزاز میں تھمتنے لگا۔

”اب تو میں آگیا ہوں نا، روؤ مت بھئی، میں تمہارے پاس ہوں۔“ اس نے زبرد کو چپ کروانے کی کوشش کی تھی۔

بہت سارا رونے کے بعد وہ شرمندہ شرمندہ ہی اس سے الگ ہوئی اور اپنے آنسو پونچھے۔

”ممی، پاپا، دادی سب کیسے ہیں؟ پاپا مجھے یاد کرتے ہیں یا بھول گئے؟“ وہ آنسوؤں کے درمیان

بولی۔

”کوئی نہیں بھولا۔ ایک حقیقی شہزادی کو، کون بھول سکتا ہے بھلا۔“ اس کا لہجہ بہت مضطرب تھا۔

”شہزادی اب نہیں رہی، وہ تو بہت بدل گئی ہے۔“ وہ جیسے بڑبڑائی تھی مگر آکاش نے سن لیا تھا۔

”وہ اپنے اندر سے شک میں مل مل کر نہیں ختم کر رہا ہے۔ مٹا رہا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کسی کے لیے تم خود کو نہیں بدلو گی۔ مگر انوس تم نے ایک ایسے شخص کے لیے خود کو بدل لیا جو تمہارا ہے ہی نہیں، اس کی انا اور اس کا زعم اسے تمہارا ہونے ہی نہیں دے رہا۔ تم ہو کہ اس کی اصل صورت پہچاننے سے انکاری ہو۔ وہ تم پر کتنے رکب اثرات لگا چکا ہے اور تم اب بھی اس کے لیے پاگل ہو رہی ہو؟ میں تمہیں لینے آیا ہوں، اب تم حریف اس مٹھیا آدمی کے ساتھ نہیں رہو گی۔“ آکاش کی بات پر بیڑھیاں اترتی ساجدہ جہاں کے قدم وہیں ٹھم گئے تھے۔

”میری محبت اس کے دل سے شک اور ہر قسمی سوچ مٹا دے گی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ آکاش کے بدر

کے لیے کہے گئے الفاظ اسے حقیقتاً برے لگے تھے۔  
 ”سوچ ہے تمہاری، ساری زندگی انتظار کرو گی۔ تب بھی وہ تمہارا نہیں، اپنی خود ساختہ انا کے دھم میں تمہیں تڑپاتا رہے گا۔ کبھی سکھ نہیں دے گا۔ تم ہمیشہ تکلیف میں رہو گی۔“ وہ غصے سے بولا۔  
 ”میں تمہیں لینے آیا ہوں، تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ جانا ہو گا۔ تم حریذیت برداشت نہیں کرو گی۔ وہ گھٹیا شخص تمہیں میرے نام پر زچ کرتا رہے گا اور تم سستی رہو گی۔ یہ میں ہونے نہیں دوں گا چلو۔“  
 اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”جہاں.....“ زمر نے اس کے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کر کے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا تھا۔  
 ”تم کون ہوتے ہو، میری زندگی میں مداخلت کرنے والے، بدر میرا شو ہر ہے اور میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں، جب تک ہمت ہے میں اس کی بے رخی اور ہر اذیت برداشت کروں گی۔ تمہیں مجھ پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں اپنی خوشی اور اپنی رضا سے یہاں موجود ہوں، مجھے اگر جانا ہوتا تو پہلے ہی دن دل برداشتہ ہو کر یہ گھر چھوڑ دیتی اور مجھے یہ کرنے سے کوئی بھی روک نہیں سکتا تھا۔ آئندہ میرے سامنے بھی مت آنا۔ میرا رستہ کھٹا کر کے میرا گھر اجاڑ کر تمہیں کیا ملے گا؟“ وہ چلائی تھی۔  
 ساجدہ جہاں تنگ رہ گئی تھیں۔ ٹھیک کبھی حالت آکاش کی تھی۔

”اتنی ہمت..... تم اتنی بہادر کب سے ہو گئیں؟ میں تو سمجھ رہا تھا تم روو گی، گڑ گڑاؤ گی۔ مجھ سے مدد کی بھیک مانگو گی۔ تم نے ناموافق حالات سے لڑنا کب سیکھ لیا؟ حیرت ہے تم اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے پتا ہی نہ چل سکا۔“ وہ آنکھوں میں نمی لیے حیرت سے اس نازک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جسے ہوا بھی تیزی سے چھو کر گزرتی تو وہ آکاش کی طرف دیکھ کر منہ بسورتی تھی۔ ہر موڑ پر آکاش کی جھانک وہ چھوٹی سی لڑکی، آج اسے اپنا گھر نہ جاننے کی درخواست کر رہی تھی۔ اتنی بڑی بڑی باتیں اس کے منہ سے سن کر وہ حیران تھا۔  
 ”میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز زمر دمیرے ساتھ چلو۔ تم یہ سب سستے سستے ٹوٹ جاؤ گی۔ پلیز خود پر ظلم مت کرو۔“ اس کی التجا پر ایک ہل کو زمر کے قدم لڑکھڑائے تھے مگر اس نے بروقت خود پر قابو پا لیا۔

”پلیز آکاش! مجھے ان حالات سے لڑنے دو۔ مجھے کمزور مت کرو۔ میں نے بدر کو بانے کی خاطر بہت طویل انتظار کیا۔ قسمت مجھ پر مہربان ہو گی۔ میں اب بھی انتظار کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اگر میرا ہے تو ضرور میری طرف لوٹے گا۔ میری ہمت گھٹانے کے بجائے بڑھاؤ، مجھے تمہارے حوصلے کی بہت ضرورت ہے، مجھے کمزور مت کرو۔“ وہ بے بسی سے رو پڑی۔

”مگر میں یہ سب کیسے برداشت کروں گا۔ تم تکلیف سستی رہو اور میں تمہیں حوصلہ دیتا رہوں۔ بہت مشکل بات ہے۔“

”تمہیں یہ کرنا ہو گا اگر جو تم میرے غلط دوست ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ کیونکہ میں یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہمت ہے سب سستی رہوں گی۔ جب ہمت جواب دے گی اسی پہل تمہارے در پر مدد مانگنے آؤں گی۔“

”جائے اس سارے میں تمہیں کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ اپنی شخصیت مسخ کرنا پڑے؟“ وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولتا تھا۔

”ہاں..... یہی چاہتی ہوں، اپنی محبت کی مضبوطی ماننا چاہتی ہوں۔ میری محبت کتنا سہہ سکتی ہے مجھے کتنا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ سب محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک عزم سے بولی تھی۔

”آدھا زمانہ تمہارا طلب گارہ کیوں یہ سب کر رہی ہو؟ اس ناقد شخص پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ خود کو اتنا مت گراؤ۔ وہ کبھی تمہیں نہیں سمجھے گا۔“ آکاش نے اسے باز رکھنے کی آخری ناکام کوشش کی تھی۔

”تم جانتے ہو جو میں ٹھان لوں، اسے پورا کر کے رہتی ہوں، اس لیے تردد مت کرو، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ وہ قطعی پن سے بولی۔

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی، اللہ تمہاری راہ آسان کرے۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے وہاں سے چلا گیا۔

زمر دہاتھوں میں چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سادہ جہاں لئے حیدروں اپنے کمرے میں گئی تھیں اور بدر کو فون پر تمام صورت حال سے آگاہ کیا تھا وہ بچہ دتاب کھاتا رہ گیا۔

☆.....☆

آستین کہیوں تک فولد کیے انگارہ ہوتی آنکھوں پر گاگلز چڑھائے وہ لب بھینچے جانے کب سے رش ڈرائیو تک کر رہا تھا۔ سفر تھا کہ کتنے کے بجائے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے دماغ پر ایک ہی بات سوار تھی آکاش سرخ مکمل آیا تھا اور زمر دے مل کر گیا تھا۔ یہی نہیں اسے ساتھ لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔

وہ سرخ مکمل پہنچا تو سارا گاڈز میٹھی نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک تو اس کے اعصاب جھج رہے تھے۔ اوپر سے گیٹ بند تھا اور چونکیدار کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

وہ ہارن پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا۔ چونکیدار جو اندر کوارٹر میں سو رہا تھا بغیر قیصر کے ہی بڑبڑا کر جاگتے ننگے پیر باہر کو بھاگا اس نے گیٹ کے دونوں پہن بمشکل صاحب کے خوف سے کھولے تھے اور ایک سائیڈ پر مودب سا کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی جھاڑ کا منظر تھا مگر حیرت کی انتہا نہ رہی جب صاحب نے کار تیزی سے پورچ میں لے جا کر روک دی اور خود تیز قدموں سے چلتے اندر حویلی میں چلے گئے۔

اس نے سکھ کا سانس لے کر گیٹ بند کیا تھا۔

☆.....☆

ماں جی سمیت تمام ملازم سو چکے تھے۔ پوری حویلی میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ تیزی سے بیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں آیا تھا۔

زمر دسیاہ لمبا رے میں لمبوس صوفے کی پشت سے سر نکالے سورہی تھی یا جاگ رہی تھی۔

چہرے پر آنسوؤں کے سٹے سٹے نشان موجود تھے۔ چہرہ خم اور گلابی سا محسوس ہو رہا تھا۔

بدر نے ایک چھدتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر ہاتھ میں پکڑا موبائل والٹ گاڑی کی چابی تمام چیزیں اس نے سائیڈ ٹیبل پر ڈالیں۔ شور کی آواز سے سوئی جاگتی سی کیفیت میں زمر دے آنکھیں کھولیں اور بدر کو سامنے پا کر حیرت و خوشی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

”آپ!“ وہ اس کی طرف دیکھتے اٹھنے لگی تھی کہ بدر نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔



”مجھے ان چونچلوں سے رام کرنے کی کوشش بے سود ہے۔ بیٹھی رہو ابھی بہت حساب لگتا ہے تمہاری طرف۔“ اس کا لہجہ اس کا انداز سب بیگانگی لیے ہوئے تھا۔  
 زمر دھسکی تھی۔

اس نے کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا۔ ٹائی ڈھیل کر کے گلے سے کھینچی اور کمرے میں دور پھینک دی۔  
 کمرے کے وسط میں آکر زمر د کے عین سامنے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ اس کی خاموشی و جسم کر دینے والی  
 نظروں سے زمر د کو بہت خوف محسوس ہوا۔

”سیاہ رنگ کا انتخاب کر کے کس کا سوگ منا رہی ہو؟ کیا میرا؟ میں تو ابھی زندہ ہوں۔“ اس کی سرد  
 آواز واستہزائیہ لہجہ کمرے میں گونجا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”میرے سامنے یہ معصومیت کا چولا اتار دیا کرو، مجھے نفرت ہے اس ڈرامے بازی سے۔“ وہ دھاڑا۔

زمر د نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ان لہجوں کی عادی ہی کب تھی۔ آنسو دیوانہ وار بہہ نکلے۔

”وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ جب کہ میں تم سے کہہ چکا تھا کہ مجھے وہ شخص اپنی زندگی میں قطعی برداشت  
 نہیں۔ یہ ہمت تم نے اسے دی ورنہ اس جیسے بزدل شخص کی یہ بچال کہ وہ میری غیر موجودگی میں میرے گھر  
 آئے اور میری ہی بیوی کو اپنے ساتھ جانے پر اکسائے، کس کی شہہ پر وہ یہ سب کرتا رہا، صرف تم ہو اور  
 کوئی نہیں۔“ اس کے لہجے کا پھر بلا پین زمر د کو کن کر گیا۔ وہ نا سمجھتے ہوئے بھی سمجھ گئی تھی۔

بدرنے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے مقابل کھڑا کر دیا۔

جس شخص کی ذرا سی قربت اسے سرشار کر دیتی۔ آج اس لمحے اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔

”میری طرف دیکھو۔“ بدرنے اس کا بازو سمجھوڑا، زمر د کا ہنسا سر نہ اٹھ سکا وہ خود میں بدر کی طرف

دیکھنے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی۔

”پلیز چھوڑیں مجھے۔“ اس نے کمر ورساد فاع کیا۔

”میں نے کہا میری آنکھوں میں دیکھو۔“ اس کی دھاڑ پر زمر د نے کانپتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان

پھیر کر اس کی طرف ایک لمحہ کو دیکھا مگر اس کی سرخ ہوئی آنکھوں اور چہرے کے سخت تاثرات نے نگاہیں

جھکانے پر مجبور کر دیا۔

”تو تم اعتراف نہیں کرو گی؟“ اس نے زمر د کے بازو پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کرتے اسے تسخیر کیا

اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔

وہ جو ایک قدم پیچھے ہو کر اپنا بازو سہلانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ اس کی حرکت

قلب بند کرنے کو کافی تھا۔

”بدر.....!“ اس کی آنکھیں خوف و حیرت کی زیادتی سے پھٹ پڑیں۔ لرزتی لہجوں سے اس نے

بیشکل بدر کو نکارا تھا۔

وہ پینٹ کی سیٹ کھینچ کر نکال چکا تھا۔

زمر د کے ذہن نے فوراً سے بیشتر ایک راہ سجائی تھی۔ وہ جچی سے تودہ لے سکتی ہے یہ سوچتے ہی وہ

دروازے کی سمت بھاگی۔ دروازے کا ناب ہر طرح سے آزمانے لگی مگر وہ کھل کر نہ دیا۔

جو یقیناً لاک کیا جا چکا تھا۔  
 ”بدر پلیز.....“ وہ دروازے کے ناب پر ہاتھ جمائے بالکل دروازے سے لگ کر کھڑی تھی اور سوکھے  
 پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

ہاتھ میں کس کر بیٹ پکڑے، بھینیں ارادوں سے اس کی طرف بڑھتے بدر کو دیکھ کر وہ رونے لگی۔  
 کچھ دیر پہلے آکاش سے کیے گئے وعدے اور ہمت کا ذکر اب ختم ہونے کو آ رہا تھا اسے اپنی ساری  
 ہمت زائل ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔  
 ”آکاش کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے؟ کچ بچا تا نا؟ وہ اعتراف کر چکا، اب تمہاری باری ہے۔“ اس کی  
 آنکھوں سے لہو بہتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دروازہ چھوڑ کر دیوار سے جا لگی۔  
 ”پلیز بدر! ایسا کچھ نہیں۔“ وہ رونے لگی۔

”مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔  
 ”چٹاخ۔“ یکے بعد دیگرے ہنسنے اس کے منہ پر نشان چھوڑ دیا تھا۔ وہ صونے کے ہتھے سے ٹکرائی  
 اور زمین پر گر گئی۔

”پلیز بدر!“ وہ روتے ہوئے التجا کرنے لگی۔  
 ”تم جیسی عورتوں کا علاج مجھے خوب آتا ہے۔ میں ایک خاندانی اور عزت دار شخص ہوں۔ میرے گھر  
 میں یہ ساری ذلالت نہیں چلے گی۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم آئندہ اس کا نام لینا تو دور اسے سوچتے  
 ہوئے بھی کانپو گی۔“ بدر کا بیٹ والا ہاتھ ہوا میں معلق ہوتا دیکھ کر اس کا چہرہ دھلے ہوئے ٹھٹھے کی طرح سفید  
 ہوا تھا اور منہ سے ہلکی سی چیخ ابھری۔

وہ منہ سے کف اڑاتا، مفلکات بکاتا اسے مارتا رہا وہ جسم پر پڑنے والے نیلوں کو سستی چینی رہی۔ مدد اور  
 رحم کی بھیک مانگتی رہی۔

خواب دیکھنے والی شہزادی کی آنکھوں میں خوشیوں کے بجائے آنسو تھے۔ درد تھا۔ وہ اپنی مصمصیت کی  
 قسمیں کھا رہی تھی مگر کوئی یقین کرنے والا نہ تھا۔

اپنی انا اور اپنی ذات کے زخم میں مبتلا وہ شخص اس پر رحم کھانے پائین کرنے کو تیار نہ تھا۔  
 وہ مار کھاتے ہوئے سب کو پکاری ان ناموں میں ایک نام آکاش کا بھی ہوتا اور بھر بدر کے جھٹتے ہاتھ  
 دوبارہ پوری قوت سے اسے مارتے۔ وہ درد سے چیختی رہی۔ درد جو صرف جسم پر پڑنے والی ضربوں کا نہ تھا،  
 اپنے خواب کی اتنی بھیاں تک تعبیر کا تھا۔

☆.....☆

خوب صورت و ناک سی شہزادی کا ناتواں وجود نیلوں میں تھا۔ جسم کا ایک ایک جوڑ درد سے ٹوٹ رہا تھا۔

وہ رات کے آدمے پہر میٹرس کے کھلے خنکی والے ماحول میں بھی سسک رہی تھی۔

”وہ تم جیسی شہزادی کو سونے کے بنجرے میں قید تو رکھ سکتا ہے مگر تمہاری قدر بھی نہیں جان سکتا۔ اس کی  
 توجہ حاصل کرتے کرتے تم مرجاؤ گی۔ مگر وہ تمہیں بھی نہیں ملے گا۔“ اس کی ساتوں میں آکاش کی کبھی گئی  
 ایک ایک بات گونج رہی تھی۔

”وہ ایک اتار پرست اور حاکم ذہنیت کا شخص ہے۔ ویسا بالکل نہیں ہے جیسا تم سمجھتی ہو۔“ درد کی ایک لہر

اس کے پورے وجود سے ہو کر گزری تھی۔  
 ”زندگی خوابوں خیالوں کے سہارے نہیں گزرتی، حقیقت کو تسلیم کرنا سیکھو، تم اس کے ساتھ ٹوٹ جاؤ گی۔“ وہ اسے پکارتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔  
 ”میں تمہیں تنہا رہنے سے اور تصور سے کہیں حسین زندگی دے سکتا ہوں۔“ اسے آکاش بہت یاد آ رہا تھا۔

”میری محبت تمہاری امانت ہے۔ آخری لمحے تک تمہارا خطر رہوں گا۔ آہ آکاش.....!“ اس کی آنکھوں سے درد کی برسات برس رہی تھی۔  
 ”آکاش! تمہارا تھا تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔ کسی کے کہنے پر کبھی مجھے مت چھوڑنا، اپنے آکاش کو مت چھوڑنا، ہم ہمیشہ سے ایک ہی تھے۔ دنیا کے خوف سے، کسی دکھ کے ملنے پر، ہر چوٹ اٹھنے پر، وہ مہربان و مخلص بائیں اس کے لیے دوا ہوتیں۔ وہ بہت سے رشتوں کو چھوڑ کر صرف اسی کی طرف بڑھتی۔ آج اس لمحے اسے وہ مہربان بائیں بہت یاد آ رہی تھیں۔ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔  
 اس بچے و مخلص شخص نے اپنا ہر وعدہ پورا کیا تھا۔ زمر نے ہر ہل اس سے جھوٹے وعدے کیے۔ وہ ایک وعدہ بھی پورا نہ کر سکی تھی۔ آج وہ اس کی مدد کو آیا تھا مگر زمر نے اسے دھکا دیا تھا۔  
 بدر کے کہنے پر اسے چھوڑ دیا۔ اس نے خود کو بدل لیا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔

☆.....☆

وہ بڑبڑا کر خواب سے جاگا تھا۔ اس کا تنفس بہت تیز تھا۔ چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے خواب دیکھا تھا زمر دبہت برے حال میں تھی اور بچوں کی طرح بائیں پھیلائے ہتھکیوں سے رو رہی، اسے پاس بلا رہی تھی۔  
 اس نے جگ میں سے پانی گلاس میں اڑایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ بیڈ سے اتر کر وہ کمرے میں بے چینی سے ٹھنسنے لگا۔ اسی مضطرب سی کیفیت میں وہ فون تک آیا اور زمر کو فون ملانے لگا۔ رات آدھے سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اسے زمر کی بات یاد آئی تو ریسور کر ڈیل پر رکھ دیا۔  
 ”کیا کروں؟“ وہ سر ہٹا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ بھر وہ اٹھ کر وضو کرنے چلا گیا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ رب کے حضور زمر کی آسودہ و خوشیوں بھری زندگی کے لیے دعا کرنے لگا تھا۔

☆.....☆

شب خوابی کے نیلے لباس میں وہ بیڈ سے پاؤں لٹکائے بیٹھا۔ اپنی جہائی روک رہا تھا۔ رات بھر اس نے بہت مہل و آسودہ نیند لی تھی۔  
 اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ چونکا، پورے کمرے میں نگاہ دوڑائی زمر دیکھیں نہیں تھی۔  
 وہ تیزی سے دروازے کی سمت گیا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پلٹا اور ٹیرس کا دروازہ کھول دیا۔ وہ زمین پر دیوار سے ٹک لگا کے سگری سگری ہی بیٹھی تھی۔  
 ”اٹھو۔“ اس نے زمر کو ٹھوس لہجے میں آواز دی۔ وہ اسی طرح قافل رہی۔  
 ”اب کے بدر کے پاؤں کے انگوٹھے سے اسے ضرب لگائی اور اونچی آواز میں حکم دیا۔

وہ ہڑبڑا کر جاگتی تھی۔ اسے دیکھ کر زمر کی روئی روئی متورم نیلی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔  
 ”میرے پاس تمہارے ہاؤس کے باغ میں اٹھانے کا وقت نہیں، فوراً کھڑی ہو جاؤ۔“ اس نے ہنسنے پر ہنسنے سے  
 وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔

بدر نے اس کا بازو جتنی سے تھا اور میس کا دروازہ ٹھوکر سے کھولتا باہر آیا تھا۔ زمر دہلیز میں کچھ پوچھنے کی  
 ہمت نہیں تھی۔ اس کی آنکھ کے پونے رونے کی زیادتی سے سوچے ہوئے اور چہرہ سستا ہوا تھا۔  
 وہ بدر کے ساتھ ٹھٹھکی رہی۔

نیچے سیزمیں کے اختتام پر ساجدہ جہاں کچن کی سمت جا رہی تھیں۔ ٹھٹھک کر رکیں۔  
 ”یہ بدر کب آیا؟ مجھے کسی نے خبر تک نہ دی۔“ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ پریشانی فطری تھی۔ وہ تو چھینکتا بھی  
 ماں کی اجازت سے تھا۔

زمر کی اتر حالت۔ مار کے نشانات اس کے چہرے اور گردن پر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بدر کا  
 اس کو یوں پکڑے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے کے جانا وہ فوراً سے پیشتر سارا معاملہ سمجھ گئی۔

وہ اسے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ ملا زمین کے کوارٹر کی طرف لایا تھا۔ قطار در قطار بننے ان کوارٹرز سے گزر  
 کر وہ اسے ایک تاریک کمرے میں لے کر آیا جس کی سیزمیں نیچے زمین کو جاتی تھیں۔

”تم شام تک یہاں بھوکی، پیاسی، تہارہ کر اپنی موت کا انتظار کرو گی یا میرے سامنے اقرار کر کے معافی  
 مانگو گی۔ یہ نہیں کرو گی تو پھر یہ اذیت اور ذلت تمہیں برداشت کرنا ہو گی۔“ اس نے چنا چنا کر کہتے اس کو  
 تاریک و سنسان کمرے میں دھکیلا۔ دھول مٹی سے اٹا کر ہ بالکل خالی پڑا تھا۔ زمر دے اس سارے  
 دور لیے میں پہلی بار لب واپس کیے تھے۔ بدر کے واپس کو پلٹتے قدم رک گئے۔

”آپ کو مجھے اذیت دے کر تسکین ملتی ہے تو میں یہ سب کچھ برداشت کرتی رہوں گی۔ جب تک مجھ  
 میں ہمت ہے۔ سستی رہوں گی۔ اس لیے نہیں کہ میں بے بس ہوں یا مجبور، اس لیے کیوں کہ میں آپ سے  
 بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کا ہر ظلم ہر اذیت اور ہر ذلت چپ چاپ سہتی رہوں گی۔ ایک نہ ایک دن آپ کو  
 میری صداقت پر اعتبار کرنا پڑے گا۔“ کانچ سی نیلی آنکھیں لب لباب آنسوؤں سے بھری تھیں۔ گردن پر نیلا  
 نشان خوب صورت چہرے پر بدر کے مضبوط ہاتھ کا نشان، اس کی پیشانی پر چمکتا خون کا نشان، یہ سب کچھ  
 بدر کی دین تھے۔

اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا جس نے ایک ہل کے لیے بدر کو ساکت کر دیا تھا۔  
 آکاش کا اعتراف یاد آتے ہی اس کے وجود میں شرارے دوڑے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر زمر کے  
 سنہری بالوں کو طعنی میں جھکڑا تھا۔

”کل رات کی مار شاید تم بھول گئی ہو۔ اسی لیے تمہاری زبان میرے سامنے چل رہی ہے۔ آئندہ  
 میرے سامنے زبان چلائی تو کاٹ کر ہاتھ میں دے دوں گا۔ میرے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ جو کہتا  
 ہوں وہ کر گزرتا ہوں۔ آئندہ خیال رہے۔“ اس نے بن پانی پھسکی کی طرح تڑپتی زمر کے بالوں کو کئی بار  
 جھٹکے کے دراندازت پیٹے غرا کر کہا تھا اور اپنی طعنی سے اس کے ہال آزاد کیے۔

اس کی بات پر زمر کا پورا وجود ہلکا ہوا تھا۔ بدر اسے وہاں روتا بلکتا چھوڑ کر دروازے کو موٹا سا تالہ لگائے  
 چلا گیا تھا۔  
 (باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

# الشعار

حاصلی..... ملتان  
اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں  
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آ پہنچے  
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعمیر کرتے ہیں  
نوشین مدر..... لاہور

نئی رتیں نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے  
سال نو کے سنگ ہیں تیری گلاب رفاقتوں کے سلسلے  
کبھی دن بھر تجھے سوچتا بھی رات بھر ہے جاگتا  
تیری یاد ہے میں ہوں اور جنوری کی شاموں کے سلسلے  
امبرین حیدر..... اسلام آباد

مطر بدل گئے پس مہر بدل گئے  
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے  
موسموں کے بدلنے پر بھی حیراں نہ ہوئے تھے ہم  
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے  
نوربانو..... کوئٹہ

پہلے سے خدوخال نہ پہلے سے ہیں خیال  
ہم کتنا ایک سال کے اندر بدل گئے  
عائشہ نیازی..... ربوہ

اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں  
چلو ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
خزاں کی اجاڑ شاخیں نہ آئیں اگلے سال  
آؤ اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں  
☆.....

سہاس گل..... رحیم یار خان  
خرچ ہوتی رہی سانسوں کی۔ نقدی  
سفر ہم رائیگاں کرتے رہے بس  
راؤ تہذیب، حسین تہذیب..... رحیم یار خان  
عیب آتے ہیں نظر تو دوسرے انسان میں  
ہر کوئی اک دوسرے پر طعنہ زن ہے آج کل  
یہ بھی سچا وہ بھی سچا میں بھی سچا ہوں اگر  
کون سچا ہے یہاں اس عالم امکان میں  
مدیحہ اعجاز..... کراچی  
زندگی دوڑتی رہی خزاں کی زہریلی شاموں میں  
اس کا نشان پھر بھی نہ مجھ کو صبح کے اجالوں میں  
ریما نور رضوان..... کراچی

جو دل پہ بوجھ ہے اتار دو  
دو دن زندگی کے ہیں فس کر گزار دو  
میں تم کو اپنی جان دوں گی سب کچھ  
بدلے میں تم مجھ کو اپنا پیار دو  
عابد محمود..... ملکہ ہانس  
کتنے ہی درد بھانے سے میرے پاس آ کر  
دیکھتے ہیں کہ میری شام سہانی تو نہیں  
فرزانہ شوکت..... کراچی  
وہ پاس رہ کے بھی رکھے گا فاصلہ مجھ سے  
یوں میرے وہ عشق کو بے مثال کر دے گا  
لیپٹ کے غم دنیا میں دے گا اپنا غم  
وہ اس طرح سے مجھے مالا مال کر دے گا



# اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباس

تعلیم، مشترکہ دشمن

دو بڑے زمین داروں کا ذکر کیے بغیر جھگ میں میرے ملاقاتیوں کا سلسلہ بخند رہ جائے گا۔ ایک روز ایک بڑے زمین دار صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے خود تو بڑی حد تک ناخواندہ تھے مگر تعلیم کے فوائد اور فضائل پر طویل تقریر کرنے کے بعد بولے۔

”جناب! آپ اس پسماندہ ضلع کے لیے نیکی کا ایک اور کام کرتے جائیں فلاں فلاں گاؤں میں ایک پرائمری اسکول کھول دیا جائے۔ تو یہی اس علاقے کے لوگوں پر احسان عظیم ہوگا اگر آپ قبول فرمائیں تو بندہ اسکول کے لیے مفت زمین نہیں ہزار روپے نقد اور ایک استاد کی ایک برس کی تنخواہ جیب سے ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

ریمانور رضوان۔ کراچی

گلدھے

اگرچہ میں سیمینارز کو ذرا انٹرویو کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن ان دنوں میری شدید خواہش ہے کہ ملکی مسائل کے بارے میں ہمیں کوئی سیمینار منعقد ہو اور مجھے اس میں شمولیت کی دعوت مل جائے کیوں کہ ابھی سال ہی میں مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ پاکستان کے مسائل کی اصل وجہ کیا ہے اور میں اس سلسلے میں اپنا تھیسس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ مجھے ابھی تک کسی جانب سے اس قسم کے سیمینار میں شامل ہونے کے

لیے کوئی دعوت نامہ نہیں آیا اس لیے اپنا یہ زیر دست تھیسس آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جگر تمام کر یا دل پر پتھر رکھ کر اسے پڑھ لیجیے گایاڈ رہے کہ یہ انکشاف تازہ ترین اور ملکی مسائل کی جڑ ہے اور انکشاف یہ ہے کہ ہم گلدھوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ہم ان سے اتنا لڑا پیار کرتے ہیں کہ ان کی عادتیں بگڑ گئی ہیں اور وہ پہلے سے بھی زیادہ گلدھے ہو گئے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی تھیسف ”گلدھے ہمارے بھائی ہیں“ سے اقتباس  
نوشین مدر۔ لاہور

اس کا ماہ کا شعر

نیاسال

تو ہے نیا تو رکھا صبح نئی شام نئی  
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال نئی

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کا قلمف

زندگی بندھوا رہی تھی مگر جو لوگ اللہ کی رحمت سے باہوس نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بندھوا رہ کھلنے پر بھی باہوس نہیں لاتا پس اللہ کے فیصلوں پر عمل اعتماد اور رحمت کا کامل یقین ہی تو زندگی گزارنے کا اصل مقصد ہے۔

امیرین حیدر۔ اسلام آباد

اس ماہ کا وعدہ

یہ جو وعدے ہوتے ہیں یہ تو زندگی کی آس

ہوتے ہیں اور آئیں زندہ رہنے پر، جبر کاٹنے پر، دکھ  
سننے پر، انتظار کرنے پر، آنسو پینے اور چھوٹی لمبی ہنسنے  
پر مجبور کرتی ہیں۔

عابد محمود۔ ملکہ ہانس

اس ماہ کی

ہری سر جھیں

شوہر نے کار چلائے ہوئے ٹیکم سے کہا۔ ”ذرا کار  
کی کھڑکیاں تو کھول دو گری سے برا حال ہو رہا ہے۔“  
بیوی نے جواب دیا۔ ”چپ چاپ بیٹھیں۔ پچھلے  
ماہ پر پڑی اسلم صاحب کی کار آ رہی ہے انہیں پتا چل  
جائے گا کہ ہماری کار میں مایہ ناز کنڈریشنر ہے۔“

☆

ایک ماں نے اپنے بچے کا سکول میں داخل کر دیا  
ہوئے کہا۔ ”میرا بچہ حساس ہے اسے سزا پر گزند بھیجے گا  
اگر یہ اتفاق سے شراوت کر بیٹھے تو اس کے ہمراہ والے  
بچے کو ذور سے پتھر مار دینے کا یہ خود بہ خود سمجھ جائے گا۔“

☆

ایک خاتون نے ٹریفک سارجنٹ کو اپنی تیز  
رفتاری کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

”نمری گاڑی کے بریک خراب ہو گئے ہیں اس  
لیے میں چاہتی ہوں کہ کسی حادثے کے بغیر گھر پہنچ  
جاؤں۔“

سیدہ امیر ہاشمی۔ کراچی

اس ماہ عورت کے روپ.....!

عورت ہی ظالم ہے۔ عورت ہی مظلوم، عورت ہی  
حاکم ہے، عورت ہی محکوم، عورت ہی ساس ہے، عورت  
ہی بہو، عورت ہی اند ہے عورت ہی بھابھی۔ اگر تمام  
فساد کی جڑ عورت ہے تو ان دامن کی فائدہ بھی عورت  
ہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ  
استعمال عورت ہی کا ہوتا ہے۔ کہیں اسے کوڑیوں کے  
مول بیچ دیا جاتا ہے تو کہیں اسے بیکر کی جوتی سمجھا جاتا

ہے۔ وہ تمام ہوش مند مرد جوانی بیوی کو بیکر کی جوتی سمجھتے  
ہیں کیا وہ اپنی ماؤں اور بہنوں کو بھی بیکر کی جوتی دیتے ہیں  
کیوں کہ آخر وہ بھی تو عورتیں ہی ہیں۔

اگر عورت بھابھی کی شکل یا پھر نند کے روپ میں  
فساد کرواتی ہے تو ان ”مستل مند“ مردوں کو تو اپنی  
آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں اور انصاف سے کام لینا  
چاہیے۔ انہیں نہ تو بیوی کی محبت میں اندھا ہونا  
چاہیے اور نہ ہی ماں۔ بہنوں کے پیار میں پاگل۔ انہیں  
ہر بات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہی دونوں  
فریقین میں سے کسی کو کچھ کہنا چاہیے۔

ہمارے ملک میں طلاق کی شرح میں روز بروز  
اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی عورتوں کے آپس کے  
جھگڑے ہیں۔ یعنی عورت ہی ظلم کرتی ہے اور عورت ہی  
ظلم سہتی ہے۔ عموماً جب کوئی ماں اپنے بیٹے کی شادی  
کر دیتی ہے تو اسے یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ میرا  
بہنہ ہار سپوت اس باہر والی (بیوی) کے پتھر میں ٹھس کر  
مجھے تو بھول ہی جائے گا۔ یہی سوچ بہنوں کی ہوتی ہے  
بس پھر شوہر کے کان کچھ اس طرح سے بھرے جاتے  
ہیں کہ وہ نہ صرف اپنی بیوی سے بدمن ہو جاتا ہے بلکہ  
اپنے بچوں سے بھی بے بردا ہو جاتا ہے۔

اگر یہ مرد اپنی عقل کے خانوں کو کھول کر سوچیں تو  
انہیں بخوبی احساس ہو جائے گا کہ وہ عورت جو اپنے اسنے  
پیارے رشتے چھوڑ کر آئی ہے تو کسی کی خاطر؟ اپنے  
شوہر کی خاطر ہی نا!! اگر وہ شوہر بھی اسے اعتماد دے،  
اس پر اعتبار نہ کرے تو پھر اس کی زندگی کا مقصد کیا  
ہے؟ ایک عورت اپنے شوہر سے صرف اعتبار چاہتی  
ہے۔ وہ اعتبار کا دامن تمام کر مشکل سے مشکل کام سر  
انجام دے لیتی ہے اگر وہ کوئی غلطی کرتی ہے تو شوہر کو  
پہلے اس سے بات کرنی چاہیے نہ کہ تین حرف کا  
استعمال کرے کہ اس کی زندگی الجھن کر دے۔ اگر مرد  
طلاق کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں تو اس سے نہ صرف  
ان کی بلکہ ان کے بچوں کی زندگی بھی داؤ پر لگ جاتی

ہے۔ اس سے نہ تو ان کی بہنوں کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ ہی والدہ کا۔ جب بہنوں کو اپنے بچے گھروں کو چھوڑ کر روز روز مکہ والوں کی خدمت کے لیے آیا پڑتا ہے تو ان کی محبت کی قطعی بھی چار دن میں کل جاتی ہے۔ اس لیے اپنے بچے بچے گھروں کو محض کسی کی باتوں میں آکر اجاڑنے سے پہلے اپنے معصوم بچوں اور بے بس بیوی کی طرف سچے دل سے ایک نظر ضرور ڈال لیجیے تاکہ آپ کو حقیقت کا ادراک ہو سکے۔ باقی آپ مرد و ماشاء اللہ ہوتے ہی عقل مند ہیں۔

نوٹ: یہ تحریر ان مظلوم بہوؤں کے لیے جو حقیقت اپنے سرال والوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں نہ کہ ان کے لیے جنہوں نے اپنی ساس مندوں کو ناکوں چنے جو اٹے ہوئے ہیں۔

ایس اتیا ز احمد۔ کراچی

#### اس ماہ کا

پاکیزہ جذبہ

جب تم کسی کو نظر انداز کرو

اور وہ تمہیں اس کا بدلہ

وفا سے دے

تو

جان لو

کہ وہ تمہیں خود سے زیادہ

اور سچی محبت کرتا ہے

ریمانور رضوان۔ کراچی

#### اس ماہ کا افسانہ

خواب اور جگنو

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وادی میں جگنوؤں کی تلاش میں وہ اس قدر دور چلی آئے گی کہ واپسی کا راستہ بھول بیٹھے گی۔

بھاڑی کے اس پار ایک دلکش وادی تھی جہاں تھلی اور جگنو کا کھیل ہوتا تھا۔ وہ روزانہ شام کو اپنے بابا سے

آنکھ بچا کر جگنو پکڑنے لگ آتی تھی۔

اس شام بھی ایسا ہی ہوا لیکن گیٹ پار کرتے بابا نے اسے دیکھ لیا۔ ”پارس بیٹے کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے فوراً اپنے بابا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پلیز بابا جانی بس ایک جگنو پکڑ کر ابھی آزاد کی گئی مجھے جانے دیں، پلیز بابا۔“

”او کے لیکن پر اس کرو کہ ابھی پانچ منٹ میں آؤ گی۔“

”جی بس یوں۔“ اس نے چنگی بھائی اور بھاگ گئی۔

اس نے وادی میں جھانکا جہاں رنگ رنگ کی تتلیاں اور جگنو منڈلاتے ہوئے ایک خوشگوار احساس پیدا کر رہے تھے۔ اس نے اپنے سنہری بالوں کو بیڈٹ کیا اور ایک جگنو کو اپنی مٹھی میں چھپانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔

شام کا منظر بھیک کر خود کو رات کی تاریکی میں سو رہا تھا لیکن وہ جگنو پکڑنے میں اس قدر مگن بھی کس سے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ ایک ایسی جگہ آگئی جہاں پہلے کسی نے آئی تھی اس نے اپنی چاروں طرف نظر دوڑائی تو ایک انجان جگہ بھی اور وہ راستہ کہیں نہ تھا جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا اور گرد چنگی درندوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

جگنو پکڑنے کی خواہش اس پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے پیارے بابا جانی سے کیا وعدہ توڑ بیٹھی تھی۔

”اف نہیں۔“ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھا اور چیخ مچی ”بابا جانی۔“

”پری بیٹے کیا ہوا، خواب میں ڈر گئی ہو۔ یہ خواب تھا اس نے اپنے بابا جانی کے ہاتھ پکڑتے ہوئے حقیقت کی دنیا میں آتے ہوئے سوچا۔

پارس نے شکر ادا کیا کہ راستہ بھولنے سے پہلے ہی اسے احساس ہو گیا کہ ”خواہشات کو اپنے اوپر اس قدر حاوی نہیں کرنا چاہیے کہ آپ اپنی منزل بھول بیٹھیں۔“

حرم قاطرہ۔ جنگ



### حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: ”ایک آدمی کسی دوسری بستی میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بٹھا دیا جو اس کا انتظار کرتا تھا جب وہ شخص اس کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”اس بستی میں میرا بھائی رہتا ہے

اس کے پاس جا رہا ہوں۔“

فرشتے نے پوچھا۔ ”کیا اس کا تم پر کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم یہ تکلیف اٹھا رہے ہو اور اس کا بدلا اتارنے جا رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ میں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔“ فرشتے نے کہا۔ ”میں تیری طرف اللہ کا فرشتہ ہوں (اور بیتانے کے لیے آیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت کرتا ہے جیسے تو اس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے۔) (مسلم)

سیدہ نورین۔ کراچی

### محبت

محبت سے غم اور اداسی ضرور پیدا ہوگی وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کر دے۔ (اشفاق احمد)

نوشین مدثر۔ لاہور

### کچھ کٹھا بیٹھا

☆ اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا

چاہتے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑنا چاہیے۔

☆ تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے کی فیس بہت زیادہ ہے۔

☆ ڈیپٹیٹ وہ شخص ہے جو ایک عورت کی ساگرہ کا دن تو یاد رکھے لیکن اس کی عمر بھول جائے۔

☆ تین آدمیوں میں راز، راز، راز رہ سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں سے دوسرے جکے ہوں۔

☆ ایک مرتبہ شادی کرنا فرض ہے دوسری مرتبہ حماقت اور تیسری مرتبہ پاگل پن۔

☆ ہجوم میں گئی سر ہوتے ہیں لیکن دماغ نہیں ہوتے۔

☆ مہمان چلے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔

☆ جب دولت کچھ ٹنگو ہوتی ہے تو کوئی قطع کلائی نہیں کرتا۔

☆ اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیں یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہو جائے گا۔

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر نہیں پیش کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔

☆ خوشی امیدی ایک ”ناشرکی“ ہے جس سے ہر بندہ روزانہ کھولا جاسکتا ہے۔

☆ انسان کی زندگی بھی پودوں جیسی ہوتی ہے کچھ کو پانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی کو راہ دکھاتے ہیں

کچھ کو جنگل کے پھولوں کی طرح خود سنہالتے ہیں۔

اسیرین حیدر۔ اسلام آباد

## نصیب دالے

جھڑکیاں دینے والا، رعب بجانے والا، دمکیاں دینے والا بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ انسانوں پر رعب بجانے اور انہیں جھڑکیاں دینے کا اسے کوئی حق نہیں۔ ہر نعلی استحقاق صرف غرور نفس کا دھوکا ہے اور غرور انسان میں صرف اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو۔ نصیب دالے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔ (داحف علی داحف)

نورین ملک۔ کراچی

## سوچا ریزے

☆ کچھ ارادے کچھ فیصلے کچھ خواہشیں دریا کنارے بنی بستیاں جیسی ہوتی ہیں جنہیں کچھ پورا نہیں ہونا ہوتا۔ وقت مٹی کی ڈھیری میں تبدیل ہو جاتا ہوتا ہے اور انسان کیا ہے ایک مٹی کی ڈھیری اور اکڑتا کتنا ہے؟ ☆ کچھ لئے ایسے بھی تو زندگی میں آتے ہیں جب دعائیں بھی پوری نہیں مانگی جاسکتیں اور ادھوری دعائیں بھی روک جیسی ہوتی ہیں ہم کسی کا ساتھ مانگتے ہیں اور وہ دل بھی جاتا ہے لیکن پھر نباہ نہیں ہو پاتا۔ فطرتوں میں تضاد نکل آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑے پھیل کر جدائیوں کا دشت بن جاتے ہیں تو وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہم نے دعائیں ادھوری مانگی ہوتی ہیں۔ دعائیں تو بڑی مکمل بڑی جامع ہونی چاہئیں۔

عابد محمود۔ ملکہ ہانس

## یاد پر!

چاہتوں کے سفر میں کچھ یادیں ہمارے ذہن و دل میں بہت گہرے نقوش مرتب کرتی ہیں۔ وہ یادیں ان خوشگوار گھوڑوں پر محیط ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ان گنت مسکراہٹوں کا باعث بنتے ہیں جب کہ ان میں سے کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے

لیے نہایت اذیت کا سبب بنتی ہیں۔ جس گھڑی ان یادوں کا دل پر نزول ہوتا ہے اس وقت ہماری آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ ہر نئی سانس ہمارے لیے ایک نئی اذیت کی پیا مبرین کر ابھرتی ہے۔ یہ یادیں ایک زہریلی ناگن کی شکل میں ہمیں ڈستی راتیں ہیں اور ان یادوں کا زہر ہماری روح و جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سے اس زہر کو نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن یہ زہر ہماری رگ و جان میں پیوست ہو جاتا ہے کیوں کہ جن لوگوں کو ہم اپنے دل میں بسا لیتے ہیں۔ ان سے وابستہ یادیں ہمارے دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ ہم ان یادوں کو بھلانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر وہ یادیں ہمارے دل پر حملہ آور ہو جاتی ہیں اور پھر سے ان یادوں کے زہر آلود نشتر ہمارے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ یادیں ایک عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور یہ عذاب زندگی کی سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ ہم اپنے دل پر بوجھ تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس بوجھ سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ ہم سانس تو لے رہے ہوتے ہیں لیکن ”جی“ نہیں سکتے۔ زندہ رہنے اور جینے میں فرق یہ ہے کہ جینے سے مراد ایسی زندگی بسر کرنا ہے جو خوشیوں سے بھرپور ہو۔ ہر لمحہ ہمیں نئی خوشیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ہمارے ساتھ ایک ایسا شخص ہو جس کا وجود ہمارے لیے سرپا خلوص ہو۔ ہم اپنی زندگی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اس کی مرضی سے بسر کریں جب کہ شخص زندہ رہنے کا مطلب ایسی زندگی بسر کرنا ہے کہ جس میں ہماری زندگی کی تمام تر خوشیاں ہم سے رونق چکی ہوں گویا ہم سانس تو لیتے ہیں لیکن ہمارا دل انہی یادوں کے جھروکوں میں کھو جاتا ہے اور ہم انہی یادوں میں تمام عمر بسر کر دیتے ہیں۔

ایسی امتیاز احمد۔ کراچی



ہے مگر جب کوئی راہ دکھائی نہ دے تو حالات کے آگے  
تھیکر بھی ڈال دیتی ہے۔  
دعاؤں کی چھاؤں میں وہ اپنی چاہت کو غم  
آنکھوں سے اپنے ہی ہاتھوں کی اور کوسوں پر دیتی ہے  
اور انہیں نہیں کرتی۔

زارا صدق قمر۔ کراچی

**دولت**  
دولت کا انبار کھاد اور کوڑے کے ذمیر کی مانند ہے۔ جس شخص کے پاس یہ ذمیر جمع رہتا ہے اس کے وجود سے اس کے گرد و نواح اور اس کی سانوں سے بدلو کے بجھکے آتے رہتے ہیں لیکن جو غنی کھاد کا یہ ذمیر دور دور تک پھیر دیا جاتا ہے اور آسمانوں سے اس پر شبنم کا نزول ہوتا ہے۔ تو اس میں سے خوب صورت رنگوں والے خوشبو دار پھول پیدا ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے ساری کائنات متکنتی لگتی ہے۔

اشفاق احمد شہر آراء۔ صفحہ 368

☆ اندھیرا آپ کو اندھیرے سے باہر نہیں نکال سکتا صرف روشنی ہی ایسا کر سکتی ہے۔ نفرت آپ کو نفرت سے باہر نہیں نکال سکتی صرف محبت ہی آپ کو نفرت سے باہر نکال سکتی ہے۔

☆ عزت کے موتی ہر اگر ایک بار میل آجائے تو  
سینکڑوں دریا بھی اسے دھو نہیں سکتے۔

☆ خوشامد ہوں سے بچو وہ تمہیں کسی بھی جگہ  
ذیل کر دے سکتے ہیں۔ (حکیم اقلیوس)

☆ اگر تم سخت محنت کے عادی ہو تو مفلس  
تمہارے نزدیک نہیں آئے گی۔ (زرتشت)

☆ اپنے سے اچھے کو تلاش کر، اپنے جیسے کے  
ساتھ تو عمر ضائع کر دے گا۔ (حضرت شیخ سعدی)

زار اصف قمر۔ کراچی

تم کیا جانو کہ زندگی کیا ہے؟  
 زندگی بھی ایک دائرے کی مانند ہے جس کے ہر صفحے  
 پر دن، تاریخ، ماہ و سال زندگی چسپاں ہیں۔ مگر ایک سے  
 لے کر آخر تک زندگی اس پر بے شمار تاریخیں لکھتی ہے ہر  
 تاریخ کی نوعیت زندگی کے حراز پر منحصر ہے۔ جب یہ  
 خوش ہوتی ہے تو دھمک کے ساتوں رنگ ڈائری پر سجانی  
 ہے اور جب ناخوش ہوتی ہے تو تاریکی سیاہ رنگ سے مٹھوں  
 کو نکالا کر دیتی ہے۔ ہم اگر شروع سے آخر تک اسے  
 بڑھتے جائیں تو پہلے چلے گا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ  
 محرروں میں چنگلی سوج اور تجربہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن  
 انفس کو جوں ہی ہم ان تجربوں سے فیض یاب ہونے  
 لگتے ہیں ڈائری کے صفحات ختم ہو جاتے ہیں۔

شاء کنول اللہ دے۔ لودھراں

محبت  
محبت اپنے عروج کے بعد زوال ضرور دیکھتی ہے۔  
جس طرح خاموشی سے کوئی دل میں کمر کر جاتا ہے۔  
اسی طرح بہت خاموشی سے کوئی اپنے سے پرایا بھی بن  
جاتا ہے۔ چند واقعات کے لیے محض کچھ لمحے ہی درکار  
ہوتے ہیں۔ کسی کے دل سے اترنے میں اور پھر دل کی  
زمین ختم ہو جاتی ہے۔ وہاں محبت پھر کسی پر دان نہیں  
چڑھتی بس بادلوں کی کمر درزی زمین رو جاتی ہے۔

دانش آفرین - کراچی

**مرد اور عورت**  
 مر خطرتا ایک بچہ ہے جب کسی کی چاہت میں مبتلا  
 ہوتا ہے تو پھر اسے پانے کے لیے اس کی کیفیت ایک  
 ایسے خدی بچے کی سی ہو جاتی ہے جسے اپنا من پسند کھلونا  
 ہر حال میں چاہیے ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ  
 خود کو ہر بازارِ نیلام تک کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

جب کہ ہمارے معاشرے کی عورت اکثر ایک ایسی خاموشی جھیل کی مانند ہوتی ہے جس میں چرچہ چھپنے سے وقتی تاخیر ضرور پیدا ہوتا ہے مگر پھر شانت ہو جاتی ہے وہ جس سے محبت کرتی ہے اسے اپنا بھی جانتی

# دورِ دل سے کہنا

عظمو  
کچھ دیر بھلا کر ان پرانی باتوں کو  
جو تہارے میرے درمیان آئیں ہیں  
جو دوری کا سبب تھیں  
آؤ جان نور  
ہاتھوں میں ہاتھ لے کر  
شانوں پر سر ٹکا کر  
ایک دو بے کوبانہوں میں بھر کر  
دسمبر کی دھوپ میں بیٹھ کر  
اپنے درمیاں سے خفگیوں  
غلط فہمیاں، دوریاں نکال کر  
آؤ جانِ جاناں  
مل جل کر تمام اگلی پچھلی باتیں یاد کریں  
کہ تم کہاں صحیح تھے  
میں غلط تھی  
کہاں میں غلط تھی  
تم صحیح تھے  
اور.....  
کہاں وقت غلط تھا  
اور کیا اچھا ہوا؟  
کیا برا ہوا؟  
بیکٹی مہکتی جنوری کی دہلیز پر  
کچھ رنگ زیت کے بکھیریں

رمینا نور رضوان

دھڑکنوں کا قرار اللہ ہو  
زندگی کی بہار اللہ ہو  
حیرتِ رحمت کے سبب اب تک  
ہے یہ روشن دیار اللہ ہو  
سُکھی شاخوں کے سر برہنہ پر  
پھر ٹھکوں کا ستکار اللہ ہو  
خٹک، بچر، دیران دھرتی پر  
بارشوں کی پھوار اللہ ہو  
دنیا والے سب مان جائیں گے  
ہے دلوں کا نکھار اللہ ہو  
سب ترے کرم سے ہی ممکن ہوا  
ہے جو گل کا وقار اللہ ہو  
سہاگل

بسم اللہ الرحمن الرحیم  
کلی کھلتی ہے بسم اللہ کہتی ہوئی کھلتی ہے  
بادل سے پوند چلتی ہے بسم اللہ کہتی آتی ہے  
بحر و بر بسم اللہ کہہ کر آواز سناتا ہے  
بانی کا مکتبِ حق سے جاتا ہوا بسم اللہ کہتا ہے جانا  
صبح کو آنکھ بسم اللہ کہتی ہوئی کھلتی ہے  
فرخ سلطانیہ

نیاسال

جان نور  
سنو جاناں

نظم

دن ڈھلتا نہیں  
دن گزرتا نہیں  
کچھ بھی اب نہیں  
بھاتا ہے مجھ کو  
سب کچھ ادھورا ادھورا

سا

لگتا ہے  
نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس لگتی ہے  
نہ آنکھ لگتی ہے  
نہ پیاس لگتی ہے  
نہ سکون ملتا ہے  
نہ ہیچین ملتا ہے  
جاناں  
جب تم مجھ سے  
روٹھ جاتے ہو

تم کو چاہتوں کی منزل  
تک خود ہی  
حوصلوں کے ساتھی کو سنگ تمہارے  
ہم قدم نہ کر دے

مریم ماہ منیر

اگر

سر پہنچے  
ایڑیاں رگڑتے  
ہراک کو  
مناتے  
روتے  
چپختے  
چلاتے  
اگر  
خند کرنے سے  
تم مل جاتے

جہانہ آفتاب

افسانہ آفتاب کاوش

نظم

چاہتوں کی منزل تک  
خواب مگر کے  
رستے میں  
گر رکاوٹیں انگنت  
قدم تمہارے تھکا ڈالیں  
چاہتوں کے بدلے میں  
غفرتوں کے سگی ہوں  
پیار بھری باتوں کو  
طرز بھرے بھوں کا  
سامنا ہر سو ہو  
من لور متی میرے  
تم کو چلتے رہتا ہے  
اس وقت تک کے تمہاری  
خواب مگر تک جاتی راہ

محبت کے اسیر

محبت کے اسیر اکثر  
محبت کی تحریک نہیں کر پاتے  
بیشمل برکتی  
ہیرے ٹپکی چاہت  
کوئٹہ کی کیمروں میں بدل ڈالتے ہیں  
محبت کے مطلب، معانی، معیار سے عاری  
اپنی سوچوں کے قاطوں کو  
ہر سمت دوڑاتے رہتے ہیں  
جذبے پر کھتے ہیں  
وفا نہیں تو لے لے ہیں  
کبھی اس سے  
کبھی اس سے ملاتے رہتے ہیں  
یہ محبت کی شدتیں ہی اکثر  
اس کی روح کو گھائل کر جاتی ہیں

حکیم خان حکیم

### دیار یار

ذرا پوچھو تو مجھوں سے دیار یار کی قیمت  
کہ کیوں وہ چھوٹا تھا میری لپکی کی گزر گاہ میں  
زینچا کے قمر یوسف گئے کتنے مراحل میں  
مگر یقوت سا یاد کہاں سے ہم جگر لائیں  
نہیں میرے محمد کا زمانے میں کوئی جانی  
کرے فائق نہ کیوں ان کے مدینے کی تہنائیں  
عمران فائق

### غزل

شامل جو محبت میں اذیت نہیں ہوتی  
اے دل کبھی جھیل جمیت نہیں ہوتی  
جو ہوش نہ ہو سر کا وہ ہوتی ہے عبادت  
سر سجدے میں رکھے سے عبادت نہیں ہوتی  
کچھ اپنے ہیں انہوں کا گلہ کس سے کریں ہم  
کچھ غیر ہیں تو غیروں سے شکایت نہیں ہوتی  
جان دینے کا تمہیں شوق ہے تو سن لو  
مغل میں ترپنے کی اجازت نہیں ہوتی  
فرزانہ شوکت

### لڑکیاں!

کتی نادان ہوتی ہیں لڑکیاں  
بچپن سے خواب بنتی ہیں لڑکیاں  
ماں باپ بھائیوں کی سلامتی کے لیے  
خدا سے سجدہ رو ہوتی ہیں لڑکیاں  
ماں باپ کا مان رکھتی ہیں  
بھائیوں پر جان چڑھتی ہیں لڑکیاں  
نازک سارا مان دل میں لیے رکھتی ہیں  
زندگی میں بس پیار چاہتی ہیں لڑکیاں  
کالج کی چڑیوں سے خوش ہونے والی  
سچا ہمسفر چاہتی ہیں لڑکیاں  
ایس احتیاز احمد

یہ دوسروں کو  
مور دا لڑا تم بھرانے والا "عشق"

اپنی بات کا اکثر  
خود ہی سبب بنتا ہے

منہ زور دل کی  
لاحتناہی خواہشیں

بے پناہ حسرتیں

جو پیار کے رستوں پر بھی

پر جوش قدم چاہتی ہیں

اور غلے کے محاذ پر بھی

جنگ کی قاتل ہیں

پھر وہ خود کو سزا کیسے سنائے؟

جو محبت! خود اپنی ہی قاتل ہے

اپنی جلالت، کم ہمتی، ناقدری سے اکثر

انمول سپنے تعبیر نہیں کر پاتے

عہد ناموں کے نکل ادھارنے والے

اعتبار تعبیر نہیں کر پاتے

محبت کے اسیر اکثر

محبت تعبیر نہیں کر پاتے

حمیرا انصاف

### غزل

آنکھوں میں انتشار بڑی دیر تک رہا  
کل اس کا انتظار بڑی دیر تک رہا  
کل اس کی یاد نے مجھے تڑپا کے رکھ دیا  
دل میرا بے قرار بڑی دیر تک رہا  
شاخ وفا پر پھول کوئی کھل نہیں سکا  
گو موسم بہار بڑی دیر تک رہا  
اس نازنین کو رب نے دیا ہے عجیب حسن!  
چاند اس پہ جاں نثار بڑی دیر تک رہا  
سچ ہے کہ مجھ کو ترک تعلق کے باوجود  
اس بے وفا سے پیار بڑی دیر تک رہا

## غزل

اس نے جب درد بڑھانے کا ہنر سیکھ لیا  
میں نے بھی اشک چھانے کا ہنر سیکھ لیا  
اس نے سیکھا ہے ہنر قطعِ تعلق جب سے  
میں نے ہر طور بھانے کا ہنر سیکھ لیا  
روٹھ جانے کا اسے شوق ہوا ہے جب بھی  
میں نے ہر بار مٹانے کا ہنر سیکھ لیا  
سامنا ہونے لگا ہے میرا رسوائی سے  
جب سے آئینہ دکھانے کا ہنر سیکھ لیا  
بھول جانے کا بشارت وہ سبھی کھیل تماشے  
میں نے جب چھوڑ کے جانے کا ہنر سیکھ لیا

سید بشارت شاہ

## نظم

اے دلبرانہ یاراں تو نے چھوڑ دی

وہ الفت وہ عنایت

وہ خوشیاں ہزاروں

وہ امرِ محو کی سادگی

وہ بات بے بات کھلکھلاتا

وہ لوٹ کے اب نہیں آئے گا زمانہ

وہ بہاروں کی خوشیاں نہ ٹھہریں گی واجدان کو

وہ تئلیاں نہ چھوڑیں گی رنگ بوؤں پر

وہ آشیانہ ناب روشن ہوگا تیرے جدِ جو سے

جس میں نہ ہوگی مسکراہٹ تیری

وہ شاعروں کے بچوں میں نا ہوں گی

نہ ہوگی نیوں میں آگئی سردی

کہا ہے دلبرانہ یاراں لوٹ آ اب کہ

دوسرے گزرائیں بھکی بھکی رات ہے ابھی

کہ آگلا کر جنوری کو خوش آمدید کہیں

سارہ احسان

## نظم

تیری یادوں کی روانی

## اور یہ جنوری

میری باتیں تری کہانی

اور یہ جنوری

میرا ہاتھ تیرا ساتھ اور لمبی سڑک

اور یہ جنوری

گم سم شامیں سنہری راتیں

اور یہ جنوری

بکیتی ندی گاتے پنچھی اور اڑتی دھند

اور یہ جنوری

کالی بستر، تری محبت

اور یہ جنوری

تھامیں، تہا چاند میرا کرا

اور یہ جنوری

میری آنکھیں، میری نیند، تیرے خواب

اور یہ جنوری

شامہ کنول اللہ دتہ

## غزل

وہ اپنے چال بدلتا نہیں کبھی  
پھول سائے کے ساتھ چلتا نہیں کبھی  
دے کے داغِ جدائیوں کے ہمیں  
میرے غم میں تیرا پیار ڈھلتا نہیں کبھی  
تیری سوچوں کے گھرے سمندر میں  
یہ دل میرا پھر سے ڈوبتا نہیں کبھی  
فضا صاف ہے تیرے پیار کی طرح  
کوئی کسی کے غم میں جلتا نہیں کبھی  
ہم کیوں نہ بدل لیں راہیں اپنی جاوید  
یہ دل کسی کی یاد میں دھڑکتا نہیں کبھی  
محمد اسلم جاوید

## غزل

وہ جس کی خاطر ہر رشتہ چھوڑتا چلا گیا  
ایک خواب تھا وہ بھی ٹوٹتا چلا گیا



ستاروں کو چھونے کی تمنا میں جو آگے بڑھا  
سفاک تھا اس قدر زمانہ رو مٹا چلا گیا  
جانے کیوں دلوں میں اس قدر کدو تھیں آگئیں  
بھری محفل میں ہی وہ منہ موڑتا چلا گیا  
خوابوں ہی خوابوں میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کو  
خوش فہمیاں اس قدر کہ جوڑتا چلا گیا  
شہرتوں سے بھلا مجھے کیا مطلب سحر  
ایک احساس تھا جو ان کی طلب میں چھوڑتا چلا گیا  
سحر میں

آنسو

میں سر بھی جاؤں  
تو

میرے جنازے کے قریب  
مت آنا

کیوں کہ  
میرے ہاتھ نہیں انھیں گے تیرے  
آنسو پونچنے کے لیے

کاوش اقبال

دسمبر کی آخری رات

دسمبر کی آخری رات  
گزرے سال کے نقش خالی دالان  
جنوری کی کن سن میں  
بھگی راتیں، نرم کونوں کا دان  
فروری کے رومالوی رنگ میں  
محبت کے جزم، عہد دیان  
مارچ کی مہکتی فضا میں  
ہنستے چہرے، بیگیتے نین  
اپریل کی بوجھل چادر میں  
اداس آنکھیں، دل بے چین  
مئی کے بدلتے تیروں میں  
جلتا سورج سلگتے چمن

جون کے تپتے صحرا میں  
آبلہ پا وصال چٹھن  
جولائی کی گھنٹڑی پر  
آنکھیں سونی خواب رہن  
اگست کے کیواڑوں سے  
جھاکتے بچہ دل ناداں  
ستمبر کی سرشاری میں  
مگن گاتے لب حسین گمان  
اکتوبر کے سرمست بادل پر  
پیار کے برندے تیر گمان

نومبر کی آنکھ بھولی میں

بچتے پہنچے ہم تیراں  
دسمبر کی خشک ہواؤں میں  
خضر تالان، تیرے جدان  
دسمبر کی اس آخری رات میں بھر.....  
تیری آہٹ کے امکان دل خوش گمان

نائلہ طارق

سال نو

اب کے جو نیا سال آئے  
سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے  
نہ کسی دل میں کدورت رہے  
نہ کسی دل میں رنجش رہے  
نہ کسی دل میں غموں کا بغیرا ہو  
نہ کوئی آنکھ آنسوؤں سے غم ہو  
کسی کے ہاتھ سے نہ کوئی ہاتھ چھوٹے  
نہ کوئی اپنا کسی اپنے سے روٹھے  
سب بچڑے ہوؤں کو ملانے  
اب کے جو نیا سال آئے  
سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے

راجہ افضل خان

اے سال نو

اے سال نو

لیکن نگہروں سے آزاد اور چین سے کب وہ سویا ہے  
بس سوچوں میں رہتا ہے گم سم کیا کاٹا کیا بویا ہے؟  
اس شہر میں بسنے والوں نے خون کو اپنے دھویا ہے  
قاتل مقتول کے جنازے پر آ کر زور سے ر دیا ہے  
انصاف تو اندھا ہے اور ہمت کہنے کی کس میں  
میرے شہر کو میرے لہو میں تم نے ہی تو بھگوایا ہے  
شمینہ فیاض

پکار

شام کے دھندلے  
ڈوہتا سورج  
لونچے پچھلی  
لہراتا آجکل  
یادوں کے جھونکے  
بیتے آنسو  
بھٹکی پلکیں  
بوہل من  
تنہائیں اور ایک پکار  
لوٹ آؤ ناں

صائقر قریشی۔ آکسفورڈ

اے نئے سال

اے نئے سال!

میری دعا ہے اس سال  
کچھ ایسا کرنا

پیار کرنے والوں کا دامن

تجلی خوشیوں سے بھرنا

سب غریبیں، کدورتیں، غلط فہمیاں

دلوں سے ختم کرنا

خلوص، پیار، وفا، چاہت سے

سب پیاروں کے دامن بھرنا اور

انہیں سدا سلامت دکھنا (آمین)

ایبزرؤف، مصباح مسکان

☆.....

تو اپنے ساتھ

بہار لانا

جس سے پھول کھلیاں سب کھل اٹھیں

ایسی خوشبو لانا

جو ہر سوتا زگی بکیر دے

ایسا موسم لانا

جس سے دکھ مٹ جائے

غم چھٹ جائے

دلوں پر چھائی گرد بھی ہٹ جائے

سال نو تو اپنے ساتھ

ایسی صبا لانا

جو نفرتوں کو کدورتوں کو مٹا دے

سال نو تو ایسا آفتاب لانا

جس کی روشنی سے اندھیرے چھٹ جائیں

جس کی کرنیں باہم امیدوں

اے سال نو ایسی شام لانا

جو سب رنج و ملال اپنے اندر سمیٹ لے

ایسے تارے اور چاند لانا

جو محبت کا پیغام ہوں

اے سال نو تو میرے ہم وطنوں کے لیے

اسن لانا

سکون لانا

چھین لانا

خوشیاں لانا

دانیہ آفرین

شب غم

آج شب پھر کوئی بچہ فاقے سے سویا ہے

پھر اک بے بس باپ خون کے آنسو رویا ہے

سیاست کے دیوانوں سے اک حردور گویا ہے

بڑبڑانوں نے کیا دیا ہے؟ کیا پایا کیا کھویا ہے؟

غربت کے ماروں نے پھر بوجھ نیا اک ڈھویا ہے

حالت یہ ہے مہالوں کی آمد پر سفید پوشی دیا ہے

## سفرِ زیلے

**افشاں علی..... کراچی**  
 بہت ساری دعاؤں و نیک تمناؤں کے سنگ  
 افشاں علی حاضر ہے۔ سخا کلاؤز کی مانند دعاؤں و  
 محبتوں کے گچھے حرفوں کی صورت تکمیر نے افشاں علی  
 آپ سب کی بزم میں حاضر خدمت ہے۔ وقت کا تند  
 و تیز دھارا ہر شے کو بہا کر لے جاتا ہے۔ ابھی سال کا  
 آغاز ہوا تھا کہ اختتام آ پہنچا۔ پلک جھپکتے سال بیت  
 چلا زندگی کی راہ گزرنے ایک اور سال کی مسافت  
 طے کر لی۔ شب و روز، ماہ و سال کا پرچ سفر راہ میں  
 کتنے ان دکھے موڑ آئے اور گزرتے طے گئے۔ کبھی  
 منزل کی تو کبھی سراب، کبھی عروج تو کبھی زوال پر  
 زندگی کا سفر ایسا گن نہ گیا اور یوں ہی گزرتا چلا۔ نئی  
 خواہشوں نئے خیالوں نئی امیدوں اور نئے خوابوں  
 تلے ایک اور سورج طلوع ہونے کو ہے۔ سال نو دلہیز  
 پر آکھڑا ہے اور سال گزشتہ یادوں کی کھڑکی سے دہے  
 پاؤں رخصت ہو چلا۔ دعاگو ہوں کہ نیا سال ہم سب  
 نئی زندگی میں روشنی بن کر آئے اور ہمارے ملک میں  
 امن سلامتی اور خیر کا اجالا ہو، آمین۔ اب باری آتی  
 ہے شگ سرد و خٹکی بھرے دبیر کی۔ ٹائیکل بے حد پسند  
 آیا جیسے کوئی معصوم الہزی دوشیرہ بنی تو بلی دہکن کی مانند  
 شرمیلی سی نگاہ و خوب صورت سی مسکراہٹ لیے نئے  
 سال کی ہنسنے ہو۔ سب سے پہلے فہرست پر نگاہ دوڑائی  
 اتنے سارے افسانے واؤ زبردست و ہیں اپنے  
 افسانے کو بھی شامل دبیر دیکھ کر از حد خوش ہوئی۔ آپ  
 آپ کی سرگوشیاں پڑھیں۔ آپنی ان معنقات میں میرا

**صلحہ قریشی..... آکسفورڈ**  
 السلام علیکم! اردا قارئین کی خدمت میں صائرہ  
 قریشی کا پہلا پیار بھرا سلام۔ ”سو جان سے دل  
 ہارے“ ردا میں میری پہلی تحریر۔ مجھے اعزازہ نہیں تھا  
 کہ میرے اس بیٹھے بھائے آتے خیال کو اتنی  
 پذیرائی ملے گی۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی کہ کن الفاظ میں،  
 میں ان ڈھیروں میسجز کا شکریہ ادا کروں جو میری اس  
 شوخ سی تحریر کے بعد آپ سب کی طرف سے ملے۔  
 اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اس کے بعد میری  
 فیملی کی حوصلہ افزائی اور پھر میری وہ بہت پیاری سی  
 فرینڈز جن کی وجہ سے جن کے پیار کی وجہ سے میں ظلم  
 کو دیکھ نہیں پا رہی ہوں سب کا نام لینا ممکن نہیں ہے  
 کیوں کہ میری یادداشت کبھی بھی بادا مومن کی  
 مرہون منت ہو جاتی ہے اور پچھلے کچھ دنوں سے  
 مصروفیت کی وجہ سے باوام کھانے کا نام نہیں مل رہا  
 ہے۔ کسی کا نام رہ گیا تو بھرم ٹوٹ جائے گا۔ اچھا بھلا  
 امپریشن خراب ہو جائے گا (ہاہاہا)۔ میں صالحہ آئی کا  
 تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کی سپورٹ  
 نے بہت خوشی دی۔ اور انشاء اللہ بہت جلد آپ ردا  
 کے صفحات پر صائرہ قریشی کی ایک اور طویل تحریر دیکھ  
 سکیں گے۔ آپ سب کی محبتوں کی حوصلہ افزائی کی  
 مجھے بہت ضرورت رہے گی۔ آپ سب کے تہرے  
 تعریف و تحقید کا انتظار رہے گا۔ بہت ساری دعاؤں  
 اور نیک خواہشات کے ساتھ آپ سب کی اپنی  
 صائرہ قریشی۔

خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

زار اصف قصر..... کراچی  
السلام علیکم! اس ماہ دسمبر کا ”کوش آگہی“ پڑھ کر  
بہت اچھا لگا۔ یقین کریں صالحہ آلہ جی اینڈ نورین  
آلی اور آلہ اصف خصوصاً صالحہ ایپا جی کی میں دل  
سے بہت عزت کرتی ہوں۔ میں ریمانور رضوان کی  
کزن زار اصف قمر ریمانور رضوان آلہ کے کہنے پر  
جب سے ردا کو جوائن کیا ہے تب سے فضول کام  
فضول گپ شب چھوڑ تھوڑا بہت ٹائم ملنے ہی ردا کا  
مطالعہ کرتی ہوں۔ میں جو افسانہ جو ناول پڑھتی  
ہوں بس ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ اتنی دلچسپ تحریر  
ماشاء اللہ سے لکھتے ہیں رائٹرز میں ردا اور اس کے  
لکھنے والوں کی تحریر کو دل سے سراہتی ہوں۔ صالحہ ایپا  
جی زور قلم اور زیادہ۔

شاہیہ مصطفیٰ عمران..... کراچی  
السلام علیکم! امید ہے آپ اور تمام لکھنے اور  
پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے اور میری خیریت  
یہ ہے کہ میں بھی اللہ کا شکر ہے خیریت سے ہوں۔  
آج شادی کو تین سال ہو گئے ہیں مٹی جلدی وقت  
گزر رہا ہی نہیں چلا۔ میں ایک پیاری سی بیٹی کی ماں  
بھی بن گئی اور میری بیٹی ایمان میری اور میرے  
سویڈ عمران کی کل کائنات ہے۔ ایمان آج دو سال  
کی ہونے والی ہے۔ ماشاء اللہ سے اور مجھے وہ لکھنے  
نہیں دیتی کتنی ہے مجھے چین دو لکھوں گی۔ ہاں تو  
میرے پیارے قارئین اور رائٹرز بہنوں کیسی ہیں  
آپ سب میڈم جو قافلہ لے کے چلی نہیں اس میں  
نئے لکھنے والے بھی شامل ہو رہے ہیں۔ صائرہ  
قریشی، نائلہ طارق دونوں ہی بہت خوب صورت لکھ  
رہی ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے۔ ڈائجسٹ  
پڑھتی ہوں مگر یہ میری ایمان رسالہ تک نہیں چھوڑتی  
مجھے چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ رائٹرز جتنی بھی ہیں سب  
خوب لکھ رہی ہیں اور میں ان سب سے بھی بہت کچھ

سیکھتی شاموں کے پرسوں خیر ماحول میں بیٹھ کر ردا کو  
پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ ”ردائے جنت“ سے فیض یاب  
ہوئے۔ ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ اچھا جا رہا ہے۔  
صائرہ قریشی جی اپنی یار ایپا اور شمیر کی نوک جھونک  
بڑے حرے کی مٹی۔ ایمان علی میرے لیے تمہارا نیم  
نیو نہیں ہے۔ میرا خیال ہے افسان، ایمان، ایمان،  
نائلہ، عاتکہ خان کی اب تک ایسی کوئی کاوش نہیں جو  
میری نظر سے نہ گزری ہو۔ ”جو عشق میں جیتی وہ عشق  
ہی جاتے“ نائلہ آلہ میں تو خود Sad ہو جاتی ہوں۔  
بس جو بھی کرنا اچھا سمجھیے گا۔ فروش جی! مقصوم کو کہاں  
غائب کر دیا۔ مہرین کنول ابھی کاوش مٹی۔ حنیف گاڈ  
ہیرو نے دسمبر کی شام پالی مٹی۔ یاسمین اختر کی عنوان  
کی طرح کہانی بھی زبردست تھی۔ حافظہ مون شاہ  
نے کرداروں کے نام اچھے رکھے تھے۔ ”اسی بحر  
کرب میں“ اور ”احساس“ مٹو قیاد رکھوں گی۔  
”مشرق کی شہزادی“ واہ جی واہ زبردست۔ مگر پلیز  
کرداروں کے ساتھ نا انصافی مت کیجیے گا۔ ریسٹ  
آر زو، شام کنول، شاہدہ علی نے بھی خوب لکھا۔ حنا  
اصفر کی ”خوشیوں کے آئینے میں“ لا جواب تھی۔ اس  
بار سب افسانے ہی سبق آموز اور اچھے تھے۔ ”ردا کی  
ڈائری“ میں حبیبہ عارف اور سعدیہ اسلم کی ”دسمبر“  
پسند آئی۔ اشعار میں دانہ آفرین، سعدیہ عابد، ریمانور  
نور، مصباح مسکان، مصباح، حنا علی، عاتکہ نیازی کے  
اشعار پسند آئے۔ ”اس ماہ میں“ افسان علی، ایس  
امتیاز، سعدیہ عابد، نور بانو اور عاتکہ نیازی اچھائی ہوئی  
تھیں۔ ”خوشبو“ کے لیے نام ہی کافی ہے۔ ”ذرا پھر  
سے کہنا“ سب ہی نے لا جواب لکھا۔ ”سندے لیے“ ریمانور  
نور رضوان کا تبصرہ اچھا تھا۔ ”دوستوں کے نام پیغام“  
اچھا سلسلہ ہے۔ ”جگن“ دال کا سوپ پسند آیا۔  
شاہدہ دسمبر کا شمارہ زبردست اور خوب تر تھا۔ اکملین  
کھٹنکس آلہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اگلے  
ماہ تک اجازت مانجیے اپنا اور خوشے وابستہ رشتوں کا

ہوگی۔ شاہد علی، مدبر اعجاز، حنا اصغر، امیر اقلین ٹائٹل  
آپ سب نے بھی خوب لکھا۔ ایمان علی ”بھروسہ“  
تحریر بھی اچھی تھی مجھے پسند آئی ویل ڈن۔ اس بار بھی  
ردا ہر بار کی طرح زبردست تھا۔

ذالہجہ..... کھراچی

دل و جان سے عزیز نہایت قابل احترام صالحہ  
آپنی اور سوہیت نورین ملک اور تمام ردافریڈز کو سلام!  
امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سوہیت  
صالحہ آپنی تمویذی دیر کے لیے آپ کی آواز سنی مجھے اتنی  
خوش ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ آپنی جی اسی بار ردو  
کے ٹائٹل نے دل خوش کر دیا اور ”کوشہ آگہی“ میں  
لکھے آپ کے الفاظ نے مجھے اپنے بچپن میں پہنچا دیا۔  
نہ جانے کیوں دسمبر سے جڑی یادیں ہمیں اداس  
کر دیتی ہیں۔ ”ردائے جنت“ بلاشبہ اس میں لکھے لفظ  
ہمارے ایمان کو تازہ کر دیتے ہیں۔ ایمان علی کی کاوش  
”بھروسہ“ بہت پسند آئی اور نائل طارق کا افسانہ  
بہت زبردست تھا۔ باقی تمام رائٹرز نے بھی کمال کا  
لکھا۔ ہر اسٹوری میں کوئی نہ کوئی سبق چھپا ہوا تھا اور  
میں ریما نور کو کابے حد شکر ادا کر دے گی کہ انہوں نے  
مجھے اپنی فریڈز لسٹ میں شامل رکھا اور میری صحت  
کے لیے دعا کی۔ خوش رہیں ریما جی۔ ردائے تمام  
سلسلے ہمیشہ کی طرح جبکہ نظر آئے۔ ردائی ڈائری  
میں مہوش جواد کی نظم پھر سہ لگی۔ ”ذرا پھر سے کہنا“  
میں دانیہ آفرین کی نظم بہت اچھی تھی۔ آپنی جی ملک  
کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آخر  
کب یہ سب ختم ہوگا۔ دعا ہے کہ آنے والے سال کا  
سورج ہم سب کے لیے خوشیاں لائے، آمین۔  
ہمارے ملک میں ترقی اور خوش حالی کی ہواں چلیں  
اور ناامیدی کے بادل چھٹ جائیں۔ آپ سب کو نیکو  
ایڑ کی ایڈوائس مبارک اس دعا کے ساتھ کہ جنوری  
کا امیدوں اور خوشیوں سے بھر اسورج ہم سب کے  
لیے راحت و سکون لائے، آمین اب اجازت چاہوں

سیکھ رہی ہوں کیوں کہ سیکھنے کا عمل تو ساری زندگی چلتا  
ہے۔ ہماری میڈم کی ہم سب لکھنے والوں کو رہنمائی  
ہے جو ہم لکھ رہے ہیں۔ میڈم نے میرے ہر ہر قدم  
پر ساتھ دیا اور رہنمائی کی میں ان کی اتنی شکور ہوں کہ  
نہیں۔ مجھے لکھنے کا پلیٹ فارم دیا اور آج یہ انہی کی  
حوصلہ افزائی ہے کہ میں سلسلے وار ناول صرف ان کی  
بدولت لکھتی ہوں ورنہ کوئی سلسلے وار ناول لکھنے کا موقع  
کہاں دیتا ہے۔ میری سب سے ہی گزارش ہے کبھی  
بھی اپنے دل و دماغ میں غرور نہیں لائے گا کیوں کہ  
ہماری میڈم صالحہ محمود کو دیکھیے جو ذرا بھی غرور نہیں  
کرتیں ہم سب لکھنے والیوں کے ساتھ ہیں۔  
ڈائجسٹ کے تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح لا جواب ہیں  
مجھے جو سلسلہ سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے وہ میں شوق  
سے پڑھتی ہوں ”دوستوں کے نام پیغام“ اس کے  
ساتھ ہی اجازت چاہوں گی کیوں کہ عمران بار بار  
مجھے دیکھ رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجتے والے ہیں  
ایمان سورہی گئی تو میں نے سوچا لکھ لوں اس کے  
ساتھ ہی میں اپنا انٹرویو بھی بہت مزے دار لکھوں گی  
بہت جلد۔

شاء ڪنول الله حقہ..... نومبر ۱۱

السلام علیکم صالحہ آپنی! افشاء علی، کشف ضیاء،  
نورین آپنی، صبا عبدالغنی وغیرہ سب کو میرا محبت بھرا  
سلام قبول ہو۔ سب سے پہلے آپ نے میری کہانی  
شائع کی اس کا شکریہ۔ سب سے پہلے ”ہم کی بار  
مرنے والے تھے“ اور ”اس بحر کرب میں“ پڑھی۔  
نائل طارق کیا کہوں دل خون کے آنسو رو دیا۔ افشاء  
علی ”معمولی گرہ“ واقعی بالکل صحیح لکھا۔ مہربن کنول  
”دسمبر کی شام“ ایک پیاری تحریر تھی۔ ہلکی چمکی مزید  
اچھا لکھیں۔ کیوٹی حافظہ مون شاہ بخاری دسمبر کیا  
تحریر تھی سچ میرے تو آنسو ہی نکل آئے۔ ایمان علی  
بالکل صحیح لکھا آپ نے ہم دیکھوں سے لڑو نہیں سکتے  
مگر انہیں کم ضرور کر سکتے ہیں یہ کوشش ہی کسی کی زندگی

گی۔ اللہ حافظ۔

واقعی سندیے پڑھنے کو دل چاہنے لگے۔ ”کچن“ میں مردیوں کے حوالے سے سوچ بنانے کے ڈھیر سارے طریقے بتائے گئے۔ ”ہنگامہ“ میں موسم سرما کے لحاظ سے بیوٹی پلان بہترین رہا۔ اب اجازت ڈھیروں دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ۔“

**فریدہ فرید..... پاکپتن شریف**  
السلام علیکم! جس وقت یہ سطور آپ کی نگاہوں سے گزریں گی۔ 2015ء کا سورج روئے دنیا پر طلوع ہو چکا ہوگا۔ اللہ کرے اس سورج کی ہر کرن عالم اسلام اور پاکستانوں کے لیے خیر و برکت کی پیامبر ہو۔ یہ سال خصوصاً ردا کی شہادیوں کے لیے خوش بخت ثابت ہو۔ آپ کی تخلیق ”میرے پیار کا پہلا شہر“ ابتدائے نظم سے انتہائے دھماکا سا حیرانہ گرفت لیے ہوئے تھا۔ آپ کی شخصیت کی مانند آپ کی تحریر بھی شفیق ہے آپ کسی بھی کردار سے خواہ منفی ہو یا مثبت کچھ برا نہیں ہونے دیتی۔ آپ کا پیغام محبت ہر دل میں اتر جائے ایک جھلک ردا کے سندیوں میں بکھری نظر آنے لگ گئی ہے۔ سو میٹ افشاں علی دوائے عجب کہ آپ کے سندیے طویل اور افسانے مختصر ہوتے ہیں اور غضب یہ کہ دونوں بحر پور توجہ کے لائق ہوتے ہیں۔ افشاں جی اپنی یونیک شخصیت اور طرز گفتگو کی مانند عایہ یازی مسلسل غیر حاضری چھٹی واردار۔ ”گوشہ آگئی“ سے آپ کی تسبیہ پر خود کا احتساب کرتے ہوئے رداے جنت میں ایمان اسلام احسان کا فرق خوب اچھی طرح سے سمجھ گئے۔ یاسمین اختر، ریمیل آرزو، ثناء کنول، حنا اصغر، شاہدہ علی کوثر، دافنہ مبارک باد۔ ایمان علی دلیل ڈن۔ غرض تمام رسالہ خوب تھا۔ آپنی جان، نورین ملک اور تمام سبھیوں کو خدا حافظ۔

☆.....

**گیتی آراء..... بکراچی**

پیاری آپنی السلام علیکم! امید ہے حراج بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کو نورین کو اور ردا کے تمام رائٹرز قارئین، داراکین کو ہماری طرف سے نئے سال کی ڈھیروں مبارکباد۔ اللہ آپ سب کو ایسی ڈھیروں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ اب بات ہو جائے باہر کے ردا کی تو سب سے پہلے ”گوشہ آگئی“ کی خوب صورت لفظوں کے بحر میں ڈوبی باتوں نے ہمیں اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ آگے چل کر ”ردائے جنت“ میں دینی باتیں اور معلومات مشعل راہ بن کر ہمارے دل میں اتر گئیں اور اب باری بھی سلسلے وار ناول، ناولٹ کی جیسے ہمیشہ کی طرح آج بھی ردا کے قارئین کو اپنے بحر میں جکڑا ہوا ہے اور اب باری بھی افسانوں کی تو سب سے پہلے افشاں علی اپنی ”معمولی گرہ“ کے ساتھ حاضر تھیں جس میں انہوں نے ہمارے معاشرے کے ایک اہم مسئلے اور بات کی طرف بہت خوب صورتی سے قلم اٹھاتے ہوئے بڑی گہری چوٹ کی ہے۔ عائشہ خان کا ”پچھتاوا“ نے دھکی کر دیا۔ مہرین کنول کی ”دسمبر کی شام“، ”وقت کا دست سترم“، ”دسمبر“، ”وہ لمحہ نہیں ملا“ دلچسپ اور اچھی تحریریں تھیں۔ ایمان علی کی ”خوشیاں ڈھونڈ ہی لیں گے“، ”ہم کئی بار مرنے والے تھے“، ”تمہی دامان لوگ“، ”اس بحر کرب میں“، ”احساس“ کے طرز تحریر نے متاثر کیا۔ ”ردا کی ڈائری“ کے سبھی انتخاب بہترین تھے۔ اس ماہ میں اس ماہ کا اقتباس سے لے کر اس ماہ کا لطیفہ سب ہی شاعر اور ہے۔ ”خوشبو“ ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ کی ساری ہی غزلیں، نظم بہترین تھیں۔ خاص کر زاہدہ ہاشمی، حکیم خان حکیم، ایس امتیاز، جمیر افغا، فرح ناز، سندیسے میں افشاں علی واہ پڑھ کر حیرت آ جاتا ہے۔ ایسا کہ



بڑھایا۔ آج ان سب ہی کی بدولت میں اتنا لکھ پائی

رابعہ افضل خان۔ کراچی

ہوں۔ مجھے آئندہ بھی آپ سب یوں ہی سپورٹ کیجئے گا پلیز۔ اب باری آتی ہے ان سب کی تعریف و تہنیرے حوصلہ افزائی جو قدم بہ قدم مجھے نکھارتی رہی۔ جی ہاں آپ سب قارئین کی تو مصباح مسکان، ہندوستان، کول، اللہ دتہ، افسانہ آفتاب، سیدہ فرزادہ حبیب، ایمان علی، دانہ آفرین، حشر فاطمہ، روشنی فیصل، سہاس گل، انجم خان، ورثہ کول، فریدہ فرید، ریمانور، امبرین حیدر، صبا حشر، دھنک تاز، عانیہ نیازی۔ صبا عبدالغنی، نور بانو، فرزادہ شوکت، سیدہ امبر ہاشمی، پیاری، گیتی آرام، نوشین مدثر، جہان آفتاب اور جو نام رہ گئے ان کے لیے تہ دل سے معذرت اور تمام وہ قاری بخش جنہوں نے نام صرف میری تحریروں پر نہیں بلکہ ان کی دی گئی رائے نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا تو میری پیاری دوستوں سال کے اس اختتام پر میں تہ دل سے آپ سب کی مشکور ہوں کہ آپ سب نے سندھیے کے ذریعے مجھے سپورٹ کیا۔ آئندہ بھی میرے ہمراہ رہیے گا۔ الغرض سب ہی کو افشاں علی کی جانب سے شکریہ۔ اپنی دعاؤں میں افشاں علی کو بھی یاد رکھیے گا۔

### افشاں علی۔ کراچی

#### ردا فرینڈز کے نام

حسب عادت سب سے پہلے تمام قارئین ردا اور رائٹرز کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دبیر میں رابعہ افضل خان آپ کی برتھ ڈے تھی۔ لہذا ردا کے توسط سے مبادولت آپ کو مبارک باد دیتی ہیں، قول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ آپ کے لبوں سے دور بھی مسکان نہ ہو اور آپ کو بھی زندگی میں کوئی نقصان نہ ہو، آمین۔ افشاں علی! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کو آپ کی برتھ ڈے وٹس نہیں کر پائی مگر میں نے آپ کو دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھا۔ چاہے؟ میں آپ کو بہت زیادہ جانتی ہوں۔

آپ کی تحریروں اور آپ کے سندھیے مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں جتنی آپ کی تعریف کروں اتنی ہی کم ہے۔ آپ کی تعریف کے لیے الفاظ ڈھونڈنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ڈیزر افشاں! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ آپ کی دوستی میرے لیے کیا ہے؟ اگر آپ کی دوستی کو ایک انمول خزانہ کہا جائے تو یہ لفظ بھی آپ کی دوستی کے آگے پیچ ہے۔ جس خلوص سے آپ اپنی تمام دوستوں کو یاد رکھتی ہیں اور ان پر دعاؤں کے خزانے لٹاتی ہیں اتنا اچھا اور اعلیٰ اخلاق کا حامل شاید ہی میں نے آج تک کسی کو دیکھا ہو اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے آپ کو پڑھ کر ہی لکھا سیکھا ہے۔ میں آپ کے سندھیے بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ اسی لیے مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہوئی ہے کہ میں ردا کے مستقل سلسلوں میں شامل ہو سکوں۔ آپ کو تو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی لیکن ساتھ ہی میں اپنی باقی دوستوں کو بھی نہیں بھولی ہوں۔ امبرین حیدر! آپ کہاں مصروف ہیں یا دوستی کے بھول گئیں۔ مجھنی دوستی کر لی اب تھوڑی کپ شپ بھی کر لیا کریں۔ آپ کو میں بتا دوں کہ آپ بھی مجھے بہت عزیز ہیں کیوں کہ آپ وہ پہلی قاری ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مجھ ناچیز کو دوستی کے قائل سمجھا۔ آپ کی دوستی بھی میرے لیے ایک انمول خزانہ کی طرح ہی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بھی نہ بھلا میں اور نہ ہی میں آپ کو بھولنے دوں گی۔ اب آپ مجھے جلدی سے بتا دیجیے کہ آپ کی برتھ ڈے کی ڈیٹ کیا ہے؟ تاکہ میں ردا کے توسط سے آپ کو خوش کر سکوں اور افسانہ جی! آپ بھی بڑی بڑی ہو گئی ہیں۔ جلدی سے ردا میں واپس آجائیں۔ میں آپ کو بہت مہم کر رہی ہوں۔ مصباح مسکان جی! شکریہ کیا؟ آپ کی تحریر واقعی قائل تعریف بھی اسی لیے میں نے آپ کی تعریف کی۔ مہرین کنول جی! آپ سے بھی میں کبھی ہوں گی جو مصباح مسکان جی سے

تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اگر قسمت مجھے پنجاب سے  
کراچی دوبارہ لے گئی تو ج میں تمہارا گھر ضرور  
دیکھوں گی خدا تمہیں ایک اچھا اور نیک ہمسفر عطا  
کرے۔ سنو اس دوستی کو کبھی مت توڑنا سمجھیں۔

میری لطم صرف تمہارے نام

میرا اور تمہارا اک رشتہ ہے جاناں

اور یہ رشتہ ہر رشتے سے سچا ہے جاناں

سنو جاناں!! اس رشتے کو مت توڑنا

پلیز میرے دل کو مت توڑنا تم وہ لڑکی ہو

جسے دوستی کرنے کو دل چاہا ہے تو سنو لڑکی

اس دل کی خطا بڑی سچی پر کم اسے مت توڑنا

اس رشتے کو مت توڑنا افشاں علی

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

جیون ساتھی کے نام

میرے جیون ساتھی ساتھ بھائی میں گے

ہماری رروحوں کو سہرا ب کر جائیں گے

جب بھی خودی ستائے چندہ مکمل نظر آئے

دھیرے سے گداز لیں پیار کی شمشاد جگائیں گے

مانا انا پرست ہوں پر ہوں وفادار

گرفت میں تیری سائے چھاتی پہ تیری سراپنا

ڈکائیں گے

تیری نام کی لگا کر بونے ہندی کس پر کنگن

نام کے تیرے چڑھائیں گے

سنگلتا بھرے ہاتھ کالوں کی لونگ

لے جائیں گے

پھر احساسِ محبت دلائیں گے

یہ کھاتی شام کی یون حسین رت کی بدلیاں

میرے جیون ساتھی جب بھی روٹھ جاؤ

بھلا کفر یاد کرنا

ہر انداز سے منائیں گے ہم اپنی محبت کو

تھہ پر جتناں گے ہم!!

کہا ہے اور ہاں سحر بہن جی! آپ اگر ہر دوست کا  
بڑھا ہوا ہاتھ تھامتی ہیں تو پلیز میرا بھی تھام لیں۔

آپ سب کی دوست بن کر کبھی مجھے بے حد خوشی ہو

گی۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی دوستی میرے لیے سلگتے

صحرا میں چھاؤں جیسی ہے۔ عانکہ خان! میرے

سندے کو پسند کرنے کا بے حد شکر یہ۔ میں آپ جیسی

مخلص لوگوں کی جتنی تعریف کروں اتنی ہی کم ہے۔

اس لیے تمام قارئین ردا کی تعریف میں چھوٹے سے

اس شعر میں سمیٹ رہی ہوں

خالق کائنات نے ہمیں یہ حسین اعزاز دیا

کہ اس نے آپ جیسے ستاروں سے نواز دیا

آہم صرف آپ کے لیے نہیں میرے لیے بھی یہ

شعر ہے آخر کوردا کی میں بھی تو قاری ہوں، (ہاہاہا)۔

بے پناہ دعاؤں اور مسکراہٹوں کے ساتھ اپنی پیاری

دوست وہن کو اجازت دیں اللہ حافظ۔

صبا عبدالغنی۔ کراچی

ردافرینڈز کے نام

السلام علیکم! میری بہنوں دوستوں اور شاگردوں

سب سے پہلے صالہ آپی باؤ آر یو؟ نورین آپی کسی

کیسے ہو جناب امید ہے فٹ فٹ ہی ہوں گے۔

افشاں علی عرف فوزیہ علی میری پیاری دوست بہن

ہمرازی کیسی ہو اور آج کل کیا ہو رہا ہے۔ میری طرح

صرف کہانیاں لکھ رہی ہو یا پھر پڑھ بھی رہی ہو۔ سچ

یار میرے گھر میں رائٹر کی تو کوئی قدر بھی نہیں ہے کام

کام اور بس کام ہی کرتے رہو۔ (کیا تمہارے ساتھ

بھی ایسا ہے؟) ویسے یہ تو تھانق اور تھوڑا سا سچ بھی

دل میں بڑی خواہش تھی کہ کبھی تم سے فرصت سے

باتیں کر لوں تو بس پھر آج قلم کا سہارا لے لیا ہے۔

شاید تم میرا خط پڑھ کر مسکرا رہی ہو تو پلیز اس وقت دعا

کرو کہ میں جو چاہتی ہوں وہ بس مجھے مل جائے آمین

دعا کا اس لیے کہا ہے کہ شاید اوپر والا تمہاری سن

لے۔ میں تم سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی ہوں

Happy Birthday R.G

زارا صدف قمر۔ کراچی

جیون ساتھی کے نام

زندگی جی! کیسے ہو جی۔ آئی ریکی مس یو، تمہیں دن ہو گئے امی کے گھر آئے ہوئے تمہاری بہت یاد آ رہی ہے۔ شادی سے پہلے عجیب خیالات آتے تھے کہ میں اپنی امی، اپنے گھر اپنے بہن بھائی کے بغیر کیسے رہوں گی۔ لیکن آج دیکھو شوہر کی محبت و چاہت ہر رشتے پر حاوی ہو گئی ہے۔ اللہ پاک ہمارا رشتہ ہماری آخری سانس تک قیامت تک قائم رکھے۔ ہمارے درمیاں ہمیشہ محبت رہے۔ آمین ثناء آمین۔

جب بادل خوب صورت ہے

جب ہوا کے سنگ خوشبو آتی ہے

جب رات کے آخری پہ چاندنی

چاند کے سنگ شرماتی ہے

بادلوں کے اوٹ میں چھپ چھپ کر

نکل آتی ہے

ایسے میں

ہم سفر جی تمہاری یاد بہت آتی ہے

ریمانور رضوان۔ کراچی

ردا کے قارئین ورائٹرز کے نام

دل و جان سے عزیز صالحہ بی بی السلام علیکم! آپ تو حج میں منفرد ہیں۔ میں آپ کی دل سے Respect کرتی ہوں۔ اینڈ آل اسٹاف نورین آبی آپ سب کو دل کی اتھار گہرائیوں سے نیا سال مبارک ہو۔ تمام سینئر اینڈ جونیئر نے لکھنے والے جو کئی مصروفیت کی وجہ سے اس ماہ نہیں شامل ہو سکے جو خاموش قاری ہیں سب کو نیا سال مبارک ہو۔ امید واثق تعالیٰ ہے یہ سال ہم پر امن و سلامتی محبت و دودھنی نئی امنگوں، نئے سپنوں کو سجھ کر گزرے۔ نئے پھولوں کی کھلاہٹ سا ہر منظر جھنگے ہمارے گھر میں۔ آمین۔ میں

زارا صدف قمر جو مجھے پڑھتے ہیں پسند کرتے ہیں میں حج میں دل کی اتھار گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ سب کو کامیابی عطا کرے۔ خصوصاً (ریمانور) آبی کی میں دل سے شکر گزار ہوں انہوں نے سینئر اعلیٰ لکھنے والوں میں مجھ جیسی ادنیٰ رائٹر کو بھی یاد رکھا۔ (حج) میں رہا باجی)

I Love you and thank you so much.

Allah bleuse u.

شازیہ آبی تو ٹاپ آف دی لسٹ ہی رہتی ہیں ماشاء اللہ زور قلم اور زیادہ۔ روشا نے عبدالقیوم، جہانہ آفتاب جی بہترین تخلیق ہے آپ کی۔ مکان رؤف میں دل سے مکان جی کی شکر گزار ہوں۔ یہ شکر یہ اس لیے انہوں نے میری تحریر کو Like کیا تھا اور ہم مصروفیت کے باعث ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پائے تھے۔ اللہ آپ کو کامیاب و کامرانی عطا فرمائے، آمین۔ اسی کے ساتھ اب اجازت اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

زارا صدف۔ کراچی

پیارے ردا کی تمام پیاری رائٹرز اور پیاری قارئین

سہیلیوں کے نام

اگر کسی کے پاس سب کچھ ہو تو دنیا جلتی ہے

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو دنیا بجتی ہے

ہمارے پاس آپ کے لیے دعا ہے

جس کے لیے دنیا ترستی ہے

اللہ تعالیٰ آپ سب کو نام میں، کام میں، گھر میں، عزت میں، محبت میں، زندگی میں، حلال مال میں ہمیشہ خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ سب پیاریوں کو ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے، اس نئے سال میں (آمین)۔

اینڈ رؤف، مصباح مکان رؤف۔ جہلم

☆.....☆.....

# گوشہ چشم

جزا رہے گا کیوں کہ ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔

زارا صدف قمر..... کراچی

سویت زارا! آپ کی محبتوں اور چاہتوں سے سجا  
دلکش نیو ایئر کارڈ موصول ہوا یقین جاپے دل خوشی  
سے بھر گیا۔ اتنی محبتوں اور چاہتوں کا بے حد شکریہ  
آپ کی شاعری شامل اشاعت ہے اور افسانے لکھنے  
کی کوشش بھی جاری رکھیے۔ اپنا بے حد خیال رکھیے اور  
خوش رہیے۔

مبشرہ ناز..... کراچی

ذیر مبشرہ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے اور ہماری  
کوشش ہوگی کہ جلد شامل اشاعت ہو۔

ملاہ اسلم..... خانیوال

سویت ملاہ! خوش رہیے آپ سے بات کرنا  
ہمیں بھی اچھا لگتا ہے اور آپ کے مستقل سلسلوں کے  
ساتھ افسانہ بھی مل گیا ہے۔ انشاء اللہ قریب اشاعت  
میں شامل ہوگا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

☆ خاص طور پر میں ردا کے پڑھنے والوں سے یہ  
کہنا چاہتی ہوں کہ ردا سے رشتہ صرف پر خلوص  
رہتا ہے۔ بے لوث لکھنا اپنے اندر کی تمام  
صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا نام ہی ردا ہے۔  
لے انتظار سے بہتر ہے کہ میں آپ کی صلاحیتوں  
کو نیچا کر کے ردا میں پیش کر دوں یہ سب سن لیں  
کہ یہ موقع ہر کوئی نہیں دیتا اور سال میں ایک تحریر  
آنے کا مطلب یہ ہے ہوتا ہے کہ آپ کی تمام  
صلاحیتوں کو زندہ لگ گیا۔

جیا قریشی..... کراچی

پیاری اور کیوٹ سی جیا قریشی بہت سی دعائیں اور  
پیار آپ کے لیے۔ 27 اکتوبر کو آپ کی شادی ہوگی جس  
کی آپ کو بہت مبارک ہو اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی  
زندگی کا نیا سفر خوشیوں اور مسرتوں بھرا ہو اور آپ سدا  
مسکراتی اور ہنستی رہو اپنا بے حد خیال رکھنا اور خوش رہنا۔

فرح ناز رفیق..... کراچی

ذیر فرح! ہم بھی آپ سے سو فیصد متفق ہیں اور جو  
بھی رائٹر خود نمائی یا معاوضے کے لیے لکھنے کی سوچ  
رکھتے ہیں میں نے انہیں کبھی آگے بڑھتے ہوئے نہیں  
دیکھا۔ وہ دنیا کی اس بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔ اسی طرح  
خود نمائی کا جذبہ کبھی انسان پر غالب نہیں آتا چاہیے۔  
میں نے ہمیشہ اپنی روح کی تسکین کے لیے لکھا کبھی میں  
نے نہ معاوضے کی تمنا نہ کی اور نہ ہی اسے کبھی معاوضے کا  
ذریعہ بنایا اور اللہ نے مجھے میری اوقات سے زیادہ لوٹا  
دیا۔ آپ ردا سے جڑی رہیے ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔  
لکھنا اور معاشرے کی برائیوں کو سب سے قباب کرنا وقت کی  
ضرورت ہے۔ اپنے لکھنے کی نمائندگی کرتے ہوئے  
لوگوں کو مثبت راہ دکھائیں وہی تجارتی کامیاب ہوتی ہیں  
آپ ایسے ہی ہستی رہیے اور اپنا خیال رکھیے آپ کی  
تجارتی قریب اشاعت میں شامل ہوں گی۔

ثمینہ فیاض..... کراچی

پیاری ثمینہ! سدا خوش رہو اور آپ کو ردا کی محفل  
میں خوش آمدید! اس بار آپ کی شاعری شامل  
اشاعت ہے اور افسانہ بھی قریب اشاعت میں شامل  
ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ردا سے آپ کا تعلق اب سدا



مہمانوں کی غیر متوقع آمد جہاں حیرت آمیز خوشی کا باعث بنتی ہے وہیں فوری طور پر "ان کی تواضع کیسے کی جائے" کا مسئلہ بھی گھیر لیتا ہے اس ماہ ہم نے کوشش کی ہے آپ کو ایسی ڈشز سے متعارف کروانے کی جو کم وقت، کم بجٹ میں تیار بھی ہو سکیں، ذائقے میں بھی منفرد ہوں اور مہمان بھی آپ کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہوں۔

بیف ہر امصالہ راس

ضروری اشیاء:

گوشت : آدھا کلو  
چاول : تین پاؤ گرام (پندرہ منٹ بھگو کر ہال لیں)  
لال مرچ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
دھنیا پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ  
ادریک (چوپ کیا ہوا) : ایک چائے کا چمچ  
لہسن پیسٹ : ایک چائے کا چمچ  
دہی : آدھا کپ  
کالا زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
جا آئل جاوتری پاؤڈر : ایک چمچ  
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) : دو کھانے کے چمچ  
ہری سرچیں (چوپ) : دو کھانے کے چمچ  
کی ہوئی

پودینہ (چوپ کیا ہوا) : دو کھانے کے چمچ  
نمک : حسب ذائقہ  
تیل : حسب ضرورت  
ترکیب: سوس پن میں تیل گرم کر کے گوشت ڈال کر خرائی کریں، سنہری ہو جائے تو چوپ کی ہوئی ادرک، لہسن پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، دہی، کالا زیرہ اور نمک ڈال کر بھون لیں حسب ضرورت پانی ڈال کر گوشت گٹے تک پکائیں، معالہ بھون کر چولہے سے اتار لیں۔

دھنپے میں گوشت کی ایک تہہ لگا کر ایلے ہوئے چاولوں کی تہہ لگائیں اوپر ہرا دھنیا، ہری سرچیں اور پودینہ ڈال دیں، جا آئل جاوتری پاؤڈر چمچ کر 10-15 منٹ دم دے دیں، کس کر کے سر دنگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

### لاہوری کباب چٹا مصالحہ

ضروری اشیاء:

قیمہ (پا ہوا) : آدھا کلو  
لہسن، ادرک پیسٹ : دو چائے کے چمچ  
پیاز : ایک عدد  
لال مرچ پاؤڈر : دو چائے کے چمچ  
گرم مصالحہ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
خشک ماش : ایک چائے کا چمچ



سفید چنے	: ایک کپ	بڑی الائچی	: دو عدد
دہی	: ایک کپ	براؤن پیاز	: پون کپ
تیل	: حسب ضرورت	دہی	: آدھا کپ
نمک	: حسب ذائقہ	پیاز (چوپ کر لیں)	: دو عدد

ترکیب: قیمہ میں لہسن، ادراک پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، خشک نشا، نمک کی ملا دیں اور بیضوی شکل کے کباب بنالیں۔ پتلی میں تیل گرم کریں پیاز کاٹ کر ڈال دیں سنہری ہو جائے تو اس میں لہسن، ادراک پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، نمک اور تھوڑا پانی ڈال دیں۔ اچھی طرح مصالحہ بھونیں اور اس میں دہی اچھی طرح بھینٹ کر ڈال دیں ابال آنے تک چھ مستقل چلا میں 10 منٹ درمیانی آگ پر پکے دیں، اس میں ایلے ہوئے چنے اور کباب احتیاط سے ڈالیں۔ پتلی کو کپڑے سے پکڑ کر ہلائیں اور تمام اجزاء اچھی طرح کس کر دیں، آخر میں گرم مصالحہ پاؤڈر اور ہر مصالحہ ڈالیں چاول اور چپاتی دونوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

### بلوچی پلاؤ

ضروری اشیاء:

گوشت	: آدھا کلو
چاول	: آدھا کلو (دھو کر بنیں)
	منٹ کے لیے بھگودیں)

سوف پاؤڈر	: ایک کھانے کا چمچ	ضروری اشیاء:
دھنیا پاؤڈر	: ایک کھانے کا چمچ	بیف قیمہ
زیرہ	: ایک چائے کا چمچ	: آدھا کلو (موٹا)
لونگ	: چھ عدد	پیاز (سلاٹس کاٹ لیں)
ٹاہت سیاہ مرچیں	: آٹھ دس عدد	: دو عدد
ادراک، لہسن پیسٹ	: ایک چائے کا چمچ	آئل
سبز الائچی	: چار یا پانچ عدد	: پون کپ
		لہسن، ادراک پیسٹ
		: ایک کھانے کا چمچ
		ہلدی پاؤڈر
		: آدھا چائے کا چمچ
		گرم مصالحہ (کٹنا ہوا)
		: ایک چائے کا چمچ

نمک : حسب ذائقہ  
دہی : ایک کپ  
ہری مرچیں (چھوٹی) : آدھا کپ

ترکیب: سوس پین میں کوئٹہ آئل گرم کر کے پیاز  
ڈال کر خزانہ کریں پیاز سنہری ہو جائے تو قیمہ، لہسن،  
ادرک پیسٹ، نمک اور ہلدی پاؤڈر ڈال کر قیر بھون  
لیں۔ نیچے کا پانی خشک ہو جائے تو دہی ڈال کر ڈھک  
کر ہلکی آگ پر پکا کریں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو  
مصالحہ بھون لیں۔

ہری مرچیں اور کٹا ہوا گرم مصالحہ ڈال کر دم پر  
رکھیں۔ مزیدار بیف قیمہ ہری مرچیں تیار ہے۔  
سر دنگ ڈش میں نکال کر چھپائی کے ساتھ سرو کریں۔

### آلو کی بھجیا

اجزاء :  
آلو : آدھا کلو  
لہسن (باریک) : چار جوے  
کٹے ہوئے)

ثابت سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
سوکھی لمبی لال : آٹھ عدد  
مرچیں

پسی ہوئی ہلدی : آدھا چائے کا چمچ  
سوکھی ہوئی کھٹائی : چار عدد  
نمک : حسب ذائقہ  
سرسوں کا تیل : ایک پیالی

ترکیب: کڑائی میں سرسوں کا تیل گرم کر کے لہسن  
سنہری کریں، پھر آلو اور نمک ملا کر ہلکی آگ پر آلوؤں  
کے 1/2 گھل جانے تک پکا لیں۔ اس میں باقی اجزاء  
ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔

### چنے کی دال گوشت

اجزاء :  
بکرے کی بوٹیاں : آدھا کلو

چنے کی دال (املی ہوئی) : ایک پیالی  
پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد

پسا ہوا لہسن اور ک : ایک کھانے کا چمچ  
پسی ہوئی ہلدی : ایک کھانے کا چمچ  
پسی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچ  
پسا ہوا گرم مصالحہ : ایک کھانے کا چمچ  
بھنی اور پسی دار چینی : ایک چائے کا چمچ  
لیموں کا رس : ایک کھانے کا چمچ  
گرم پانی : چار پیالی

نمک : حسب ذائقہ  
تیل : ایک پیالی

پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس، ادرک چھڑکنے  
کے لیے

ترکیب: دھیمی میں بوٹیاں، 1/2 پانی، پیاز، لال  
مرچ، ہلدی، لہسن اور ک اور نمک ملا کر پکا لیں۔ پانی  
خشک ہو جائے تو اس میں دال اور باقی پانی شامل کر  
کے دال اور گوشت یکجان ہونے تک پکا لیں۔ اس  
میں باقی اجزاء ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار دال  
گوشت پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس اور ادرک  
ڈال کر پیش کریں۔

### پودینے کی چٹنی

ضروری اشیاء:

پودینہ : ایک کٹھی  
ہر ادھیا : آدھی کٹھی

ہری مرچیں : دس عدد  
انار دانہ : پانچ چائے کے چمچ  
لہسن کے جوے : چار عدد  
سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: پودینہ اور ہر ادھیا تو ڈکڑو لیں، انار دانہ  
صاف کر کے بھگودیں، سفید زیرہ، لہسن، ہری مرچیں،

چینی، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مصالحہ پاؤڈر، خربوزے کے بیج اور نمک شامل کر کے دھیمی آنچ پر پکائیں، چینی کا پانی خشک ہو جائے تو سرکہ شامل کر کے پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں اور پچھ چلائی رہیں جب چینی گاڑھی ہو جائے تو چمکا ہند کر دیں۔ چینی ٹھنڈی کر کے صاف سترے مرتبان میں محفوظ کر لیں۔ سیب کی مزیدار چینی مختلف کھانوں کے ساتھ کھائیں۔

### کسٹرڈ فلڈ کریم ہافس

171:

ہف پیسٹری کا آٹا : ایک پاؤ  
کسٹرڈ کیسٹر پاؤڈر : آدھی پیالی  
تازہ دودھ : آدھا کلو + ایک پیالی  
چینی : آدھی پیالی  
تازہ کریم : ایک پیالی  
بادام، پستے (باریک : آدھی پیالی  
کٹے ہوئے)

ترکیب: آٹے کو بلیس اور اسے کون کے سانچے پر لپٹیں۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے 6 کونین تیار کریں۔ انہیں بیلنگ ٹرے میں رکھیں اور پہلے سے گرم ادون میں 180 سینٹی گریڈ پر 15 منٹ پکا کر نکال لیں۔ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو کون کو سانچے سے علیحدہ کر لیں۔ ایک پیالی دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر کھولیں۔ باقی دودھ دہنی میں ڈال کر ابالیں، اس میں چینی شامل کریں، چینی مل ہو جائے تو پچھ چلاتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کسٹرڈ پیسٹ ملائیں، آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو کریم ملا کر چھنٹیں، پھر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کسٹرڈ کے آمیزے کو چمچی کر دے کونوں میں بھریں اور بادام اور پستے چمڑک کر پیش کریں۔

.....☆.....

پودینہ، ہر ادھنیا اور انار دانہ نمک تمام اشیاء ملا کر پلینڈر میں ڈال کر پلینڈر کر لیں یا سل میں پیس لیں۔ چینی پیسے کے بعد نمک، مرچ پکھ لیں اگر کچھ کمی لگے تو حسب خواہش شامل کر لیں۔ لیچے پودینے کی مزیدار چینی تیار ہے۔ اسے آپ شمشے کے صاف اور خشک جار میں محفوظ کر لیں۔ اسے بیسنی روٹی، آلو بھرے پراٹھے اور دال بھرے پراٹھے کے ساتھ کھائیں، خوب مزہ دے گی۔ اس کے علاوہ وال، چاول، بریانی اور پلاؤ کے ساتھ کھانے کا بھی اپنا مزہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے دی میں ڈال کر رائیڈ بنا کر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ہر صورت میں مزہ دے گی اور ہاضمہ درست رکھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی آپ کے دسترخوان کی شان بھی بڑھائے گی۔

### سیب کی چینی

ضروری اشیاء:

کچے سیب : آدھا کلو  
پیاز : چار عدد  
لہسن، اورک پیسٹ : ایک چائے کا چمچ  
چینی : ایک کپ  
سرخ مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ  
گرم مصالحہ : ایک چائے کا چمچ  
سرکہ : دو چائے کے چمچے  
خربوزے کے بیج : ڈیڑھ کھانے کا چمچ  
(چھلے ہوئے)

نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: سب سے پہلے سیب دھو کر چھل لیں اور کدو کش کر لیں یا بالیک کاٹ لیں۔ پیاز بھی باریک کاٹ لیں، ایک دہنی میں سیب، پیاز اور اورک، لہسن ڈال کر پکائیں۔ ساتھ ہی اتنا پانی ڈالیں کہ تمام اشیاء اچھی طرح گل جائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو

# مسکھار

ہے۔ اس طرح آپ خزاں میں بہار، پت جھڑ میں گلاب نظر آئیں گی۔

## ٹڈ ماسک

اس میں چکنائی، مٹی اور مصفا اجزاء شامل ہوتے ہیں یہ جلد کو خشک کرتی ہے۔ چکنی جلد کے لیے مفید ہے۔ سیاہ دانے بھی صاف کرتی ہے۔ ٹڈ ماسک کے استعمال کے بعد جلد صاف تھری اور کنڈن کی طرح تھری تھری نظر آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شروع میں ٹڈ ماسک کے استعمال کے بعد آپ کی جلد پر کچھ دسے نظر آئیں۔ پریشان نہ ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹڈ نے جلد کی گہرائی میں موجود کثافت کو باہر نکال لیا۔ اس لیے اس کا باقاعدہ استعمال اہم ہے اس سے جلد کے عضلات مستحکم ہوتے ہیں۔ یہ ادھیڑ عمر جلد کے لیے زیادہ موثر اور مفید ہے کیوں کہ عمر بڑھنے کے ساتھ جلد کی روئی ختم ہونے لگتی ہے۔ اس ٹڈ ماسک سے بحال ہو جاتی ہے۔

## کھیرے کا ماسک

کھیرا چہرے کے لیے بہترین ہے۔ کھیرے کا ماسک لگانے کے لیے کھیرے کے پتلے پتلے گول قلعے کاٹ کر پورے چہرے پر لگائیں۔ چہرے پر کھیرا لگانے سے قبل ان پر تھوڑا سا بے بی آئل لگائیں۔

## اسٹراپیری کا ماسک

اسٹراپیری اگرچہ ہمارے ملک میں بہت کم ملتی ہے لیکن جہاں ملتی ہے وہاں کی خواتین کے لیے یہ

چہرے کی خوب صورتی اور تازگی کو تادیر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بھرپور خیال رکھا جائے، وقتاً فوقتاً چہرے کی کلیئرنگ کرتے رہنا چاہیے۔ آج ہم آپ کو چند آزمودہ گھریلو ماسک بنانا بتا رہے ہیں جن کے استعمال سے آپ کی جلد فریش اور تازگی سے بھرپور ہو جائے گی۔ ماسک کے ہفتے پندرہ دن کے استعمال سے چہرے پر طامعت اور چمک پیدا ہوتی ہے۔

چہرے کو گھلتے کرنے کا ماسک، ٹڈ ماسک، کھیرے کا ماسک، اسٹراپیری کا ماسک، انٹاس کا ماسک، انڈے کی سفیدی کا ماسک، دہلی اور بینسن کا ماسک۔

## مختلف اقسام کے ماسک

### چہرے کو گھلتے کرنے کا ماسک

چہرہ اچھی طرح دھو کر بمب دس پھر نرم تو لیے سے پونچھ کر کھمچاے پھر اس پر تھوڑا سا چندر کارس ملے اور دس منٹ تک کے لیے سوکھنے دیجیے بعد ازاں اس پر لیوں کارس روئی سے لگائیے اور اسے بھی دس منٹ سوکھنے دیں۔ پھر چہرے پر تازہ بالائی کا مساج کریں اس سے بھی اپنا چہرہ صاف کریں اور خوب میل کی جیاں مل مل کر اتار دیے۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو ڈالے اس سے آپ کی جلد حد درجہ صاف اور چمکنی چمکدار ہو جائے گی۔ بس اب اس پر ہلکا سا میک اپ کرنے کی ضرورت

کے چہرے پر لگانے سے چہرے کی رنگت کھرجاتی ہے۔

### میدہ اور دودھ کا ماسک

میدہ اور دودھ کا ماسک روزانہ چہرے پر لگانے سے چہرے کی میل اور کشافت دور ہو جاتی ہے اور رنگت صاف اور خوب صورت ہو جاتی ہے۔

### کیلے کا ماسک

کیلے کے گودے کو اچھی طرح مسل کر اس میں تھوڑا سا دودھ یا بالائی ملا کر چہرے پر لگانے سے سانسولی رنگت صاف اور عمر جاتی ہے۔

### جلد کو تروتازہ رکھنے کا طریقہ

☆ ان طریقوں پر عمل کرنے سے ہر قسم کی جلد تروتازہ رہتی ہے۔

☆ صبح سویرے خالی پیٹ ایک گلاس پانی میں ایک چمچ شہد ڈال کر پیئیں۔

☆ صابن بالکل استعمال نہ کریں۔

☆ سب سے پہلے اپنے چہرے پر نیم گرم پانی اور فیس واش کے کمپرس سے مساج کریں پھر ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

☆ تین یا کریم اپنی جلد کے مطابق استعمال کریں۔

☆ اپنا تویہ الگ رکھیں کسی اور کا استعمال نہ کریں۔

☆ دن میں دو دفعہ چہرہ دھوئیں۔

☆ میک اپ اتارنے کے بعد کلیننگ کریں۔

☆ ایسا کاسمیک استعمال نہ کریں جو آپ کی جلد خراب کرے۔

☆.....

خوش خبری ہے کہ اسٹریپری کا ماسک کھیرے اور ہر قسم کے کاسٹیکس ماسک سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

اسٹریپری کا ماسک لگانے کے لیے اس کا گودا پورے چہرے پر لگایا جاتا ہے۔

### انناس کا ماسک

انناس کھانے ہی میں خوش ذائقہ نہیں ہوتا، اس کے اور بھی بے شمار فوائد ہیں۔ ان میں سے ایک اہم فائدہ جس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کا رس کھلی ہوئی پڑمرہ جلد کو شاداب و تازگی بخشنے میں چادوئی اثر رکھتا ہے۔ انناس کا رس ماسک کے طور پر چہرے پر لگائیں اور پھر کمال دیکھیں۔

### اٹلے کی سفیدی کا ماسک

کھر میں اٹلے ہر وقت موجود رہتے ہیں ناشتے کے لیے آلیٹ بناتے ہوئے تھوڑی سی سفیدی اٹلوں میں سے الگ نکال کر رکھ دیجیے اور فرصت ملے ہی اس سفیدی کو پھیٹ کر چہرے پر لگائیں اور دس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔ آپ خود دیکھیں گی کہ آپ کا چہرہ کھر گیا ہے۔

### دہی اور تین کا ماسک

دہی اور تین ہر کھر کے باورچی خانے میں ہر وقت موجود ہوتا ہے تھوڑا سا دہی لے کر اس میں ایک کھانے کا چمچ تین ملا لیں۔ اس میں چاہیں تو لیموں کا رس بھی شامل کر سکتی ہیں۔ اب اس آمیزے کو دس منٹ تک منہ پر لگائیں اور پھر چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھولیں اگر جلد بد رنگ ہو جائے تو لیموں اور زیتون کا تیل ملا کر صبح و شام اس سے چہرے کا مساج کریں۔ یہ عمل بھی جلد کے لیے بہتر ہے۔

### ٹماٹر کا ماسک

ٹماٹر کے گودے کو لیموں کے رس میں شامل کر



# تبت

سرد و خشک موسم میں اپنی  
جلد کو دیجئے بھرپور تحفظ



## تبت کولڈ کریم

تبت کولڈ کریم سرد اور خشک موسم میں جلد کو روکے  
پہن سے محفوظ رکھے۔ آئل کا باقاعدہ استعمال جلد  
کو تروتازہ اور نرم و ملائم بنائے۔

## تبت ہنی لوشن

تبت ہنی لوشن جلد کو نرم و ملائم اور نگہداشت بنائے۔ اس  
میں شامل وٹامن ای، شہد اور روغن بادام چلدا کی قدرتی  
غی برقرار رکھیں اور اسے بنائے دلکش اور خوبصورت۔

تبت ہنی لوشن اور کولڈ کریم - جلد کے لیے سب سے کچھ